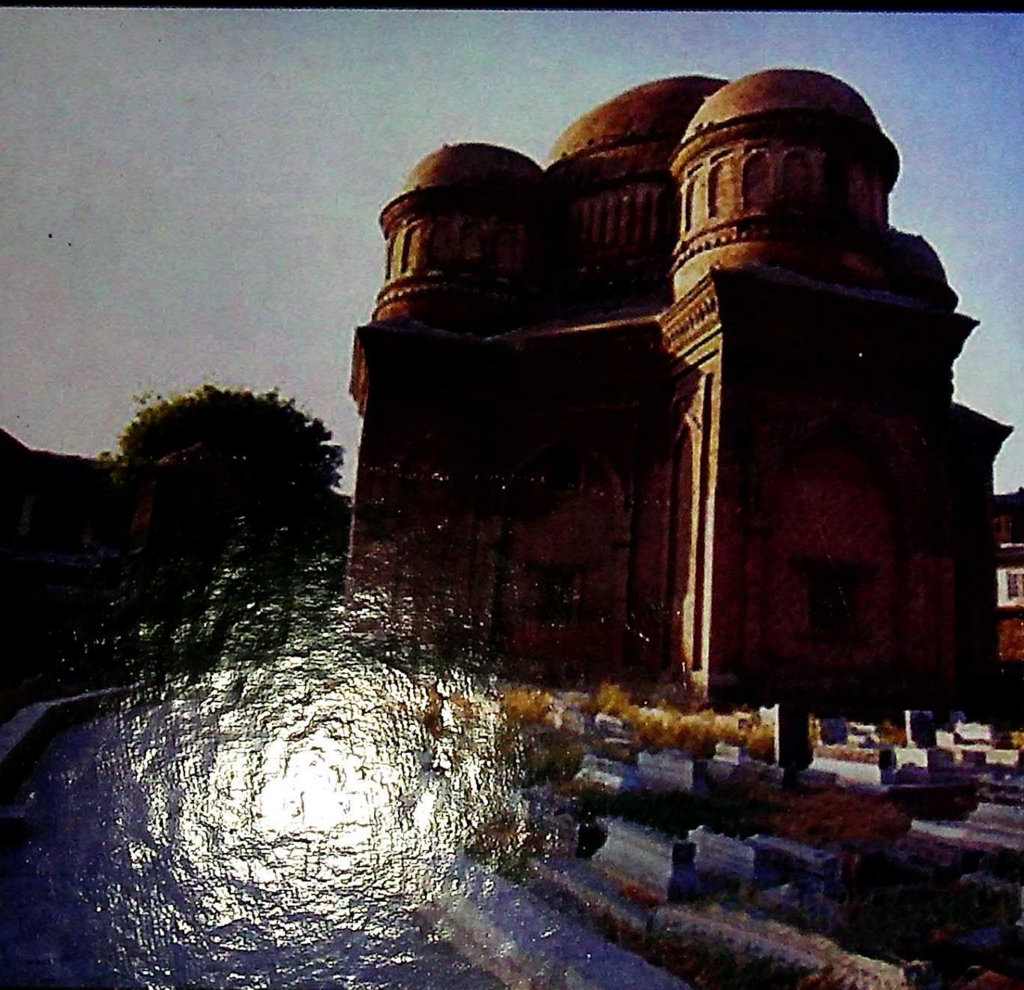
تاریخ بڈشاہی



مصنف محمد الدین فوقؔ

تاریخ بڈشاہی

مصنف

محمد الدین فوق

سٹی بک سینٹر بک سیلرز، پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
بڈشاہ چوک، سرینگر، کشمیر

نام کتاب	:	تارخ بڈشاہی
مصنف	:	محمدالدین فوق
زیراہتمام	:	شیخ جاوید احمد
سال اشاعت	:	2013ء
تعداد صفحات	:	563
قیمت	:	=/595 پانچ سو پچانوے
ISBN	:	81-7976-027-8

ناشر

سٹی بُک سینٹر

بُک سیلرز، پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

بڈشاہ چوک، سرینگر، کشمیر

فون:0194-2470158

پیش لفظ

یہ کتاب اس ملک اور اس قوم کی تہذیب و ترقی کا مٹا ہوا خاکہ ہے۔ جس نے کبھی پنجاب وسندھ، تبت و کاشغر اور کابل و بدخشان تک درودیوار سے اپنی شجاعت و بسالت اور رواداری وانصاف کی شہادت دلوائی تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جو کشمیر کے سیاسی اقتدار اور اس کی گذشتہ علمی عظمت وفضیلت کی نوحہ خواں ہے۔ اہل کشمیر کو غور کرنا ہوگا کہ سلف ایسے تھے تو کیوں تھے؟ اور خلف اب ایسے ہیں تو کیوں ہیں؟ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

''تاریخ بڈشاہی'' کی تصنیف کا خیال ۱۹۰۸ء میں آیا۔ ۱۹۲۸ء میں اس کا کچھ ڈھانچہ تیار کیا گیا۔ لیکن اس کی تکمیل جہاں تک راقم کے امکان میں ہے، آج پچیس سال کے بعد ہوتی ہے۔ اس پر بھی راقم کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک مصنف زندہ ہے، اس کی تصنیف نامکمل ہے۔ کسی مصنف کی نسبت معصومیت کا دعویٰ کرنا فطرت انسانی سے انکار اور کسی تصنیف کی تکمیل اور عدم نقص کا اعادہ علم کی روز افزوں ترقی کی توہین ہے۔ آج کی تحقیق کل کی ترقی کے معیار پر کس طرح پوری اتر سکتی ہے۔

اس لئے میں اپنی پچیس سالہ محنت کے سرمایہ کو بھی آخری اور قطعی لفظ قرار نہیں دیتا۔ بلکہ چاہتا ہوں کہ میرے اس کام کو جاری رکھنے والے پیدا ہوں۔ جو تاریکی کے پردوں کو دور کرکے اپنی تاریخ کے گم شدہ اوراق کو روشنی میں لاتے رہیں۔ اور اپنے اہل وطن پر ثابت کردیں۔

یہی اس عالم ایجاد کی تقدیر ہے
خواب ماضی کی فضائے حال میں تعبیر ہے

۱۹۵۳ء　　　　　　محمد الدین فوق

لاہور

فہرست مضامین

باب اول

کشمیری خاندان کی ابتداء اور اس کا شجرہ نسب

زوال راجگان ہنود کے آخری ایام

کشمیر کے متعلق جس قدر تاریخی مواد سنسکرت، فارسی، اردو، انگریزی کی تاریخوں اور دیگر تذکروں سے مل سکتا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خونریز لڑائیوں، غیر ملکی حکمرانوں کے حملوں، مختلف العقائد فرمانرواؤں کی تبدیلیوں، اندرون ملک کی خانہ جنگیوں اور دیگر آفات ارضی وسماوی کے باوجود دنیا میں یہ ایک واحد ملک ہے۔ جو پانچ ہزار سال یا کچھ زیادہ عرصہ سے اپنی مسلسل تاریخ رکھتا ہے۔

اس چھوٹے سے ملک میں ہندو راجگان کے اکیس خاندان ساڑھے چار ہزار سال سے زیادہ مدت تک حکمران رہ چکے ہیں۔ ان میں بعض ایسے خاندان بھی تھے جو کمال کے بعد زوال اور زوال کے بعد کمال حاصل کرتے رہے۔ کبھی ان کو تخت

سلطنت پر جلوہ گر دیکھا گیا اور کبھی وہ خاک چھانتے نظر آئے۔ بار ہا اٹھے، بار ہا سنبھلے اور بار ہا گرے اور ان لوگوں کو جنہیں خدا نے بصیرت کی آنکھیں دی تھیں، قدرت کی سبق آموز نیرنگیاں اور اپنے اعمال وافعال کا انجام دکھاتے رہے۔

ز انقلاب زمانہ عجب مدار کہ چرخ
ازیں افسانہ ہزاراں وار د یاد

جس زمانے کا ذکر ہم کر رہے ہیں، اس زمانے میں ہندو راجگان قدیم کا آخری خاندان جو تاریخ میں خاندان اوپیا دیو کے نام سے مشہور ہے، کشمیر پر حکمران تھا۔ اور اس خاندان کا آخری راجہ سہہ دیو (۱) نہ صرف اپنی حکومت بلکہ کشمیر پر ہندو راجگان قدیم کے اقبال واقتدار کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ اس راجہ کے عہد میں ذوالقدر خان تاتاری جس کو اہل کشمیر ذوالچو (۲) کہتے ہیں، آیا۔ وہ سفاکی اور خونریزی میں ہلاکو خان سے کم نہ تھا۔ اس نے کشمیر میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر دیا۔ راجہ کشتوار کی طرف بھاگ گیا۔ کئی لوگ تبت کی طرف چلے گئے۔ تاریخ خواجہ اعظمی کا مصنف لکھتا ہے۔

"ذوالچو مردود بہ مجرد آمدن فرمود کہ بے ملاحظہ ہمہ را بہ قتل رسانند وزن ہا و اطفال ہا اسیر نمایند وغلہ رابسوزند وعمارات را ویران ومنہدم سازند وتمام شہر را آتش بر کشند۔"

کشمیر میں تین خوش نصیب نو وارد

اسی راجہ کے عہد میں تین خوش نصیب شخص کشمیر میں قسمت آزمائی کے لئے داخل ہوئے۔ان میں ایک راجہ تبت کا جوان فرزند رینچن (۳) تھا۔وہ اپنے چچا سے مغلوب ہو کر اور شکست کھا کر کشمیر چلا آیا۔راجہ سہہ دیو کے سپہ سالار رام چندر نے راجہ سے اس کا مستقل وظیفہ مقرر کرادیا۔ذوالچو کے حملۂ کشمیر کے زمانے میں یہ تبّتی شہزادہ بھی سپہ سالار کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔آخر حادثہ ذوالچو کے بعد یہ دونوں اپنے ملک میں واپس آئے۔لیکن رینچن نے ملک گیری کی ہوس میں رام چندر کو قتل کر کے اس کے بیٹے راون چندر اور اس کے تمام اہل وعیال کو گرفتار کرلیا۔اور ۷۲۵ھ میں کشمیر کے نہ صرف تاج وتخت کا مالک بن گیا۔ بلکہ اس نے رام چندر سپہ سالار کی لڑکی اور راون چندر کی بہن کوتہ رین سے جو بعد کی تاریخوں میں کوٹہ رانی کے نام سے موسوم ہوئی۔شادی بھی کرلی۔

تبّتی شہزادہ رینچن شاہ

رینچن نے کشمیر کا فرمانروا ہو کر مذہب اسلام قبول کرلیا اور اس کی دیکھا

دیکھی اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔لیکن اس کی حکومت دیر تک نہ رہی۔قریباً پونے تین سال کے بعد وہ عالم عقبیٰ کو چلا گیا۔اور ایک خورد سال فرزند حیدر نام چھوڑ گیا۔رینچن کا اسلامی نام ملک صدرالدین تھا۔سال وفات ۱۳۲۷ء ہے۔

لنگر چک بانی چک خاندان

دوسرے خوش نصیب شخص کا نام جو راجہ سہہ دیو کے زمانے میں کشمیر میں آیا لنکر چک یا لنگر چک تھا۔ یہ علاقہ دردستان کا رہنے والا تھا۔یہی شخص کشمیر اور بیرون کشمیر کی چک قوم کا جدامجد ہے۔راجہ نے اس کے ساتھ بھی نیک سلوک روا رکھا۔اور اس کو تریہگام میں رہنے کو جگہ دی۔اس کی اولاد نے کشمیر میں بڑا اقتدار حاصل کیا اور قریباً دو سو سال کے بعد اس کا سیاسی عروج واثر اس قدر بڑھ گیا کہ چک قوم ہی کشمیر کی حکمران بن گئی۔اس قوم نے مسلمان ہونے کے بعد شیعہ مذہب اختیار کرلیا۔

شاہ میر بانئے شہمیری خاندان

اس بدنصیب راجہ کے عہد میں جو تیسرا خوش نصیب شخص کشمیر میں داخل ہوا۔اس کا نام شاہ میر تھا۔یہی شاہ میر شہمیری خاندان کا بانی ہے۔اور اسی کی نسل سے سلطان شہاب الدین،سلطان قطب الدین،سلطان سکندر،سلطان زین العابدین

عرف بڈشاہ جیسے جلیل القدر بادشاہ کشمیر میں گزرے ہیں۔

ہندو راجگان کے اس آخری دور میں سہہ دیو، اس کا بھائی اودیان دیو اور خود خوٹہ رانی اپنی حکموت کو سنبھالنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ اور کبھی کبھی یہ مرض سنبھالا بھی لیتا رہا۔ لیکن بنیاد چونکہ ہل چکی تھی، ہوا اکھڑ چکی تھی اور حکمران طبقہ کی ذاتی کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور غفلتوں اور وزراء امراء کی باہمی خانہ جنگیوں نے ملک کا بُرا حال کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ سنبھالا ''خورشید لبِ بام'' اور ''شمع سحر'' کے وجود سے زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ واقعات وحالات جو پیش آرہے تھے اور جو آئیندہ پیش آنے والے تھے۔ ایک دوربین آنکھ دور رس نگاہ اس گرد و غبار میں کسی شہسوار کی آمد آمد کا انتظار کر رہی تھی اور اشاروں سے بتا رہی تھے ۔

یہ جتنے کارواں ہیں سب بنے گے خاک منزل کی
نیا اک کارواں خاکستر منزل سے نکلے گا

اس خاکستر منزل سے جو نیا کارواں نکلا وہ یہی شاہ میر تھا۔ جو ۷۲۰ھ یا اس کے قریب اپنے اہل و عیال کو لے کر اپنے وطن سے باہر نکلا اور راجہ سہدیو کے زمانے میں کشمیر میں آیا۔ یہ بدقسمت راجہ ہر چند پیش آنے والے واقعات کا مقابلہ کرنے سے ناقابل تھا۔ لیکن اس کی نیکی اور فیاضی اور شرفا پروری پر کسی کو شک نہ تھا۔ اس نے شاہ میر کے غیر ملکی اور غیر مذہب ہونے کے باوجود اس کو جاگیر دی اور اس کی عزت افزائی

میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

شاہ میر کا حسب ونسب

شاہ میری خاندان کے بادشاہوں کے حالات سب سے پہلے بڈشاہ کے عہد میں لکھے گئے۔ بڈشاہ کے ایک درباری شاعر اور مورخ زون راج نے زینہ راج ترنگنی کے نام سے سنسکرت نظم میں جو تاریخ لکھی ہے۔ اس میں بانی خاندان کا نام شہمیر، اس کے باپ کا نام طاہر راج اور دادا کا نام قور شاہ لکھا ہے۔ قور شاہ کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ وہ ایک اچھے اور شریف خاندان سے تھا۔ اس نے اس کا سلسلہ نسب ارجن (۴) کے پوتے اور ابھمن کے بیٹے پریکھت سے ملایا ہے۔ اس پریکھت کو بعضوں نے پرتچھت اور بعضوں نے بارشارتھ لکھا ہے۔ اس کے بعد وہ قور شاہ کی تعریف میں لکھتا ہے کہ اس کے بازوؤں پر جرأت و جوانمردی کا نشان ایک کمان کی صورت، اس کی خوش اقبالی کی اس طرح شہادت دے رہا تھا، جس طرح صبح کے وقت کسی پہاڑ کی چوٹی پر آفتاب کی خوبصورت سنہری کرنیں شاہ خاور کی آمد کا پتہ دیا کرتی ہیں۔ اس کی تین آنکھیں تھیں۔ وہ کثیر الاولاد ہوگا۔ اس کی اولاد کی بڑی شہرت ہوگی۔ وہ کشمیر میں حکمرانی کریگی۔ اور اس حکمران خاندان کا بانی شمس الدین ہوگا اور ملک کے دیگر چھوٹے چھوٹے فرمانرواؤں کو اس کا مطیع بن کر رہنا پڑے گا۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے۔ قور شاہ کے ہاں ایک فرزند طاہر راج کے نام سے پیدا ہوگا۔ جو بسا اوقات کمان کی تانت کو شہ زوری کی وجہ سے اپنے کانوں تک کھینچ لایا کرے گا۔ اس کے بعد طاہر کے ہاں شاہ میر پیدا ہوا۔ جس کا جوش گرمی میں آفتاب نصف النہار کی سی تابانی رکھتا

تھا۔اور جس کی بہادری وشجاعت اس کے دشمنوں کی بیوہ عورتوں کے زاروقطار گریہ سے ظاہر ہوتی رہتی تھی۔یہی شاہ میر شمس الدین کے نام سے کشمیری خاندان کا بانی ہوا۔

شاہ میر کا اصلی وطن

شاہ میر علاقہ پکھلی کو طے کرتے ہوئے بارہ مولا میں پہنچا۔بارہ مولا کو باب الکشمیر یعنی کشمیر کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔کیونکہ کشمیر کی اصلی وادی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔اس زمانے میں اوراس سے پیشتر بارہ مولا کے رستے جولوگ کشمیر آتے تھے،انہیں پکھلی ضلع ہزارہ کا علاقہ طے کرکے آنا پڑتا تھا۔چنانچہ میر سید علی ہمدانی جب کشمیر سے واپس گئے تو پکھلی ہی میں وفات پا گئے۔اور جب محمود غزنوی کے زمانہ میں راجہ اودبانڈ نے راجہ کشمیر سے مدد طلب کی تو کشمیری افواج نے اسی راستہ سے سرحد اٹک کو عبور کیا۔اکبر اور جہانگیر بھی عموماً اسی راستے آیا کرتے تھے۔چنانچہ جہانگیر نے توزک جہانگیری میں اس راستے کے اکثر مقامات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔شاہ میر کا اصلی وطن افغانستان کا وہ شمالی علاقہ بتایا جاتا ہے جس میں کوہستان سوات، بنیر، کنہر، پنج کوڑہ اور باجوڑ واقع ہیں۔بعض مصنفین نے اس کا وطن خاص کنہر یا کونار یا کنیر لکھا ہے۔بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ جب وہ پانڈوؤں کی اولاد سے ہے تو افغانستان کے علاقہ سے اس کا کیا تعلق؟ وہاں تو مسلمانوں کی آبادی قدیم سے چلی آتی ہے۔

لیکن اس معمہ کو خود زونراج حل کردیتا ہے۔جب وہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے

کہ اس کا اصلی وطن پنج گور تھا۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ افغانستان کے شمالی کوہستان میں جو اہم مقامات ہیں۔ ان میں پنج کوڑہ بھی ہے۔ ذرا سے غور کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنج کوڑہ وہی مقام ہے جس کا نام آج سے پانچ چھ صدی پیشتر پنج گوڑ تھا۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ افغانستان میں ہندو کبھی آباد نہیں تھے، وہ افغانستان کی تاریخ قدیم اور صوبہ سرحد کے آثار قدیمہ کے کھنڈروں سے قطعی لاعلم معلوم ہوتے ہیں۔ افغانستان میں ہندوؤں اور بدھوں کی آبادی کے آثار زمانہ قدیم سے پائے جاتے ہیں۔ ان پر سب سے پہلے یونانیوں نے پھر تاریوں، پھر ایرانیوں اور ان سب کے بعد مسلمانوں نے حملے کئے۔ مسلمانوں کے زمانے میں افغانستان اور اس کے نواحی علاقہ جات سوات، بنیر، کنہر، پنج کوڑہ، چترال وغیرہ کا کثیر حصہ مسلمان ہوگیا۔ صرف وہ وسیع رقبہ مسلمان نہ ہوسکا جو کوہ ہندوکش کے شکم میں واقع ہے۔ اور جسے اسی وجہ سے مسلمانوں نے کافرستان کا نام دے رکھا ہے۔ اور اب تو ان میں سے بھی کئی قبیلے مسلمان ہو چکے ہیں۔ ان کے دیہاتوں میں بعض نام ایسے ہیں جو صاف طور پر ہندو زمانے کی یادگار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً کام دیش ایک بہت بڑے علاقہ کا نام ہے۔ کسنی گرام، سونندیش، پندیش وغیرہ۔

علاوہ ازیں افغانستان کے پرانے کھنڈروں سے جو بُت اور سامان بُت پرستی اور پرانے سکے ملے ہیں۔ جن پر ایک طرف بیل کی تصویر کے ساتھ ایک آدمی کی بھی تصویر ہے۔ جو دھوتی اور زنار پہنے ہوئے ہے۔ ان سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی سکونت اور حکومت رہی ہے۔ نیز اٹک سے مغربی پہاڑ کی طرف ایک پُرانی عمارت کے نشان موجود ہیں۔ جس کو پانڈو کے عہد کا قلعہ بتایا جاتا

ہے۔علاقہ میانوالی کے کوہ سکیسر میں بھی ایک بہت پرانی عمارت کو اب تک پانڈو کا سنگھاسن کہتے ہیں۔

مہا بھارت کی روایت کے مطابق دریودھن کی والدہ راجہ گندھارا (قندھار) کی بیٹی تھی۔اس کے علاوہ براستہ ترکستان بامیان کے علاقہ میں کوہ ہندکش کی گھاٹی پر بہت سی قدیم عمارات کے نشان موجود ہیں۔اور دو مورتیاں بھی استادہ ہیں۔جس کو ہندو متبرک تیرتھ تصور کر کے سینکڑوں برس سے ہر سال وہاں جایا کرتے ہیں۔

متذکرہ صدر شہادتوں سے قطع نظر اب بھی صوبہ سرحد، افغانستان اور سوات وچترال کے علاقوں میں ہندو عہد قدیم کے آثار ملتے ہیں۔اور پشاور اور لاہور کے عجائب خانوں میں مورتیوں اور بتوں کی صورتوں میں ان کی زندہ نظیریں موجود ہیں۔

مسلمان مورخ اور شاہ میر کا حسب نسب

بڈشاہ کے حالات میں سنسکرت مصنفین نے تین کتابیں لکھی ہیں۔سب سے پہلی کتاب راجہ ولی یا زینہ ترنگنی ہے۔لیکن زیادہ تفصیل حالات زینہ راج ترنگنی میں ہیں اور وہیں اس کا خاندان پانڈوؤں سے ظاہر کیا گیا ہے۔تیسری کتاب زینہ چرت ہے۔جو صرف بادشاہ ہی کے حالات سوانح کے متعلق ہے۔وہ چونکہ بالکل ناپید ہے،اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں بادشاہ کے حسب نسب کے متعلق کیا کچھ درج تھا۔ان کے علاوہ بڈشاہی عہد میں دو فارسی تاریخوں کا بھی پتہ ملتا ہے۔جن میں ایک

ملا احمد اور ایک ملا نادری کی تصنیف ہے۔ یہ دونوں تاریخیں بھی نایاب بلکہ ناپید ہیں۔ البتہ دوسری فارسی تاریخوں میں جو عہد بڈشاہی کے بعد لکھی گئی ہیں، ان تاریخوں کا نام یا ان کا کہیں کہیں صرف حوالہ نظر آتا ہے۔ ان کے بعد سب سے پہلا مسلمان مورخ میرزا حیدر گورگانی (۵) جو کئی سال تک کشمیر کا حاکم بلکہ ایک لحاظ سے کشمیر کا بادشاہ رہ چکا ہے۔ اس نے بھی شاہ میر کے حسب نسب کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اس کا زمانہ بڈشاہ کی وفات سے صرف ستر پچھتر سال بعد کا تھا۔ البتہ بڈشاہ کی وفات سے قریباً سوا سال کے بعد خواجہ نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری (۶) میں لکھا ہے۔

''شاہ میر نام شخصے کہ نسبت خود چنیں مے گفت کہ شاہ میر بن طاہر بن شاشپ بن گرشپ بن نیکوز روانتہائے نسب خود برارجن کہ یکے از پانڈوان است مے نمودہ۔''

اس کے بعد تاریخ فرشتہ، تاریخ ملک حیدر چاڈورہ، تاریخ خواجہ اعظمی، سیر المتاخرین اور کئی اور تاریخوں میں شاہ میر کے متعلق جو کچھ درج ہے۔ وہ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ طبقات اکبری ہی کا عکس ہے۔ ''نسبت خود چنیں مے گفت'' کا فقرہ اندرون کشمیر اور بیرون کشمیر کی تاریخوں میں نقل در نقل ہوتا چلا گیا ہے۔ اور جو شجرہ طبقات اکبری نے نیکوزر تک شاہ میر کا لکھا ہے، سب نے قریباً اسی کو دہرایا ہے۔ اور قورشاہ کا کہیں نام نہیں لکھا۔ جو طاہر کا باپ تھا۔ اور جس کو بڈشاہی عہد کے مصنف زونراج نے جو بعد کے تمام مورخوں سے معتبر ہے۔ اپنی تاریخ میں درج کیا

ہے۔ البتہ طاہر کے بعد شاشب اور گرشاشپ اور نیکوزرو غیرہ نام لکھ دیئے ہیں۔ جو ایرانی بادشاہوں کے ناموں سے ملتے جلتے ہیں اور جن کا زونراج نے ذکر تک نہیں کیا۔ معلوم نہیں یہ نام کہاں سے اور کیا سمجھ شجرہ میں بڑھا دیئے ہیں۔

شاہ میر کے قدیم وطن کا تعلق
بہ لحاظ آب وہوا کشمیر کے ساتھ

سوات اور اس کے علاقے اور ملحقہ آبادیوں کی آب وہوا کشمیر سے ملتی جلتی ہے۔ اور اس ملک میں جو کوہستانی اور میدانی نظارے ہیں۔ اور ان کے اندر جو چشمے، مرغزار اور سبزہ زار اور دلکش وادیاں ہیں۔ وہ دامن دل کھینچنے میں کشمیر کے کسی گوشہ سے کم نہیں ہیں۔ خوشحال خاں خٹک جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں پشتو زبان کا ایک مشہور سواتی شاعر گزرا ہے۔ اپنے وطن کو خطۂ کشمیر سے نسبت دیتا ہوا لکھتا ہے۔

سواتھ	ے	واڑہ	لکنڈ تال	گنڈہ	سر	تا	پایہ
خبر	دار	بہ	شوم	رہزہ	ہرہ	زائیہ	
ملک	د	سواتھ	ولوکا	نو	بونشاط	دے	
پہ	دوراں	د	یوسف	زیُو	دران	رباط	دے

یہ ہوا کش و کشمیر و بہ آب و رنگ دے
حیف دی واچہ کشمیر آرت دے دے تنگ دے

مطلب ان اشعار کا یہ ہے کہ میں نے تمام سوات کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ملک سوات اس قابل ہے کہ بادشاہ یہاں آ کر عیش ونشاط منائیں اور خوشیاں کریں۔ مگر یوسف زئیوں نے اس ملک کو ایک ویران رباط (سرائے) بنا دیا ہے۔ آب و ہوا اس ملک کی کشمیر کی طرح ہے۔ مگر صرف اتنا افسوس ہے کہ کشمیر ایک وسیع ملک ہے اور سوات اس کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا خطہ ہے۔

اس لئے شاہ میر نے جب نقل مکانی اور ترک وطن کا ارادہ کیا تو آب و ہوا اور کوہساروں اور مرغزاروں کے لحاظ سے اس خیال سے کہ کشمیر سوات اور پنج کوڑہ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے، کشمیر ہی کی سیاحت واقامت کو پسند کیا۔ نیز مورخین کشمیر کی تحریروں کے مطابق قورشاہ کے وہ الفاظ بھی اس کے دماغ میں گونج رہے تھے جو اس کے دل میں کبھی کبھی شاہانہ ولولے پیدا کر دیا کرتے تھے۔ اور جن کا ذکر اگلی سطور میں آئے گا۔

شاہ میر کے بادشاہ کشمیر ہونے کی پیش گوئی

زینہ ترنگنی کا مصنف زونراج لکھتا ہے۔ ایک مرتبہ شاہ میر جنگل میں شکار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جب تھک کے چور ہوگیا تو ایک جگہ اس کو غنودگی سے آ گئی۔

خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ مہا دیوی اس کو امید افزا اور مسرت بھرے لفظوں میں سلطنت کشمیر کی خوش خبری دے رہی ہے۔اور کہہ رہی ہے کہ یہ ملک ایک نہ ایک دن تمہارے قبضہ میں آئے گا۔اور تمہاری اولاد عرصہ دراز تک اس ملک پر حکومت کرتی رہے گی۔

خواجہ محمد اعظم مصنف تاریخ کشمیر اعظمی بھی شاہ میر کے متعلق اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔وہ لکھتا ہے کہ شاہ میر کے بادشاہ کشمیر ہونے کی پیش گوئی اس کے دادا قور شاہ نے جو صاحب کرامت وخوارق تھا کی تھی۔چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"در مجمع مردم روزے گفت کہ الہام رب جلیل بہ سن درسید کہ از فرزند تو پسرے مے شود و شہمیر نام بادشاہ ولایت کشمیر باشد واز نسل او چند کس بر تخت خواہند نشست۔"

شاہ میر کے متعلق اس قسم کے الفاظ فارسی کے دیگر مورخوں نے بھی لکھے ہیں۔بہرحال ان ایام میں کشمیر کے حالات وواقعات ہی بتارہے تھے کہ اس جنت نظیر ملک کے تاج وتخت کے لئے گردش فلک کسی اور صاحب نصیب کا انتظار کر رہی تھی۔

شاہ میر کا کشمیر میں داخلہ

شاہ میر کو مہا دیوی نے تخت کشمیر کی اجازت دی۔یا اس کے دادا قور شاہ کے الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے۔بہرحال اس کے دل میں ایک قسم کی امنگ اور امید پیدا ہوگئی۔اور جب راجہ سہہ دیو نے بہ نظر خسروانہ دیکھا اور اس کے ساتھ شاہانہ سلوک

روا رکھا، تو جس امید کو لیکر وہ اپنے وطن سے نکلا تھا یا جس بشارت کو اس نے عالم غنودگی میں سنا تھا۔ اس کی کامیابی کی کچھ دھندلی سی جھلک اس کو کشمیر کی کمزور حکومت کے گرد و غبار میں نظر آنے لگی۔

وہ اہل وعیال سمیت قسمت آزمائی یا سیر و سیاحت کے لئے اپنے وطن سے کشمیر چلا آیا۔ بارہ مولا میں اس نے اقامت اختیار کی۔ جہاں راجہ سہہ دیو نے اس کو ایک موضع جاگیر میں دے دیا۔ اور اس نے اپنے شاندار مستقبل کے لئے راجہ کے اس عطیہ کو فال نیک تصور کیا۔

تاریخ اعظمی میں بھی لکھا ہے۔

"شہمیر در بارہ مولا بہ اہل وعیال خود سکونت کردہ۔ چوں خبر سکونت او راجہ بہ رسید۔ حکم نمود کہ بہ قریہ دوارہ دیر سکونت کند و حاصلات آں را در وجہ کفاف صرف نماید۔"

زینہ ترنگنی میں بھی شاہ میر کے داخلہ کشمیر کا ذکر آیا ہے۔ لکھا ہے ۸۹ لولک (۴۴۸۹ لوکک) مطابق ۱۲۲۵ شاکا مین۔ وہ آخر کار کشمیر میں داخل ہوا۔ اس کے اہل وعیال اور دیگر رشتہ دار اس کے ساتھ تھے۔ راجہ کشمیر نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور اس کا معقول وظیفہ مقرر کر کے اس کی اعانت اور مدد اس فیاضانہ طریق سے کی جیسے آموں کے ساتھ لدا ہوا درخت شہد کی مکھیوں کو دعوت دے کر سیر کر دیتا ہے۔

تبتّی شہزادہ رینچن اور شاہ میر

حادثہ ذوالچو کے ایام میں رینچن اور شاہ میر دونوں کچھ عرصہ تک قلعہ لگنہ گیر

(علاقہ لار) میں محفوظ و پناہ گزیں رہے تھے۔ اور وہاں شاہ میر کی صحبت نے اس کے مذہبی خیالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس لئے رینچن شاہ نے جب سہہ دیو کے بعد تخت کشمیر پر قبضہ کیا اور پھر مسلمان ہو کر اپنا نام ملک صدرالدین رکھا، تو شاہ میر کا وقار بہت کچھ بڑھ گیا۔

ملک صدر الدین نے سپہ سالار رام چندر کو قتل کر کے اس کی بیٹی کوٹہ رین (کوٹہ رانی) سے شادی کر لی۔ اور دو شخصوں کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ ایک یہی شاہ میر، دوسرا لجہ بٹ کا کاپوری۔ یہ دونوں اس زمانے کے نامور سرداروں میں سے تھے۔

شاہ میر ترقی واقتدار کی منازل میں

شاہ میر سپہ سالار اور مدار المہام ہی نہ تھا۔ بلکہ اس کے سپرد ملک صدرالدین کا فرزند حیدر خاں بھی تھا۔ جس کو آئیندہ بادشاہ کشمیر ہونا تھا۔ شاہ میر نے حیدر خاں کو اسلامی طور وطریق کے مطابق تعلیم وتربیت دی۔

''رینچن بہ حکومت نشست'' کے بعد طبقات اکبری بھی شاہ میر کی اتالیقی کے متعلق ذیل کے سطور لکھتا ہے۔

''شاہ میر را وزیر خود ساختہ مدار کارخانہ حکومت بُرد گزشت و اتالیقی پسر خود کہ چندر (۷) نام داشت بہ او تفویض نمود۔''

پندرہ سال کے لئے کشمیر میں پھر ہندو حکومت

ملک صدرالدین کی ڈھائی سالہ حکومت اور اس کی وفات کے بعد تاریخ

کشمیر ایک اور پلٹا کھاتی ہے۔کوٹہ رانی اپنے سوتیلے فرزند حیدر خاں کو تخت سے محروم کر دیتی ہے۔اور اپنے پہلے خاوند راجہ سہہ دیو کے بھائی راجہ اودیان دیو کو جو حادثہ ذوالچو کے وقت سے علاقہ پکھلی میں پناہ گزین تھا، نہ صرف طلب ہی کرتی ہے بلکہ جب وہ آتا ہے تو اس کے سلکِ زوجیت میں آجاتی ہے۔اب لچہ بٹ کا کاپوری کو سپہ سالاری اور شاہ میر کو مدار المہامی کا عہدہ ملتا ہے۔اوراس انقلاب کے زمانے میں تاریخ کشمیر حیدر خاں پسر سلطان صدرالدین کا انجام بتانے سے بالکل خاموش ہے۔

راجہ اودیان دیو کے زمانے حکومت میں جو پندرہ سال سے کچھ زیادہ ہے شاہ میر کا عروج پھر بڑھتا ہے۔ایک معرکہ میں وہ بیرونی دشمن کے دانت ایسے کھٹے کرتا ہے کہ دشمن کی فوج کا کثیر حصہ قتل ہو جاتا ہے اور کچھ جان بچا کر واپس لوٹ جاتا ہے۔لیکن اودیان دیو دشمن کے خوف سے تبت کی طرف نکل جاتا ہے۔

اودیان دیو تو بالکل مٹی کا مادھو تھا۔البتہ رانی خود دلاور تھی اور دلاوروں کی قدر کرتی تھی۔اس نے شاہ میر کو مختار کل بنا دیا تھا۔اوراس کے دو فرزندوں جمشید اور علاءالدین کو کامراج میں جاگیریں بھی دیں۔امن وامان ہونے کے بعد اودیان دیو کو رانی نے تبت سے واپس بلایا۔لیکن وہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایک خورد سال فرزند (از بطن کوٹہ رانی) چھوڑ کر دنیا سے چل بسا۔

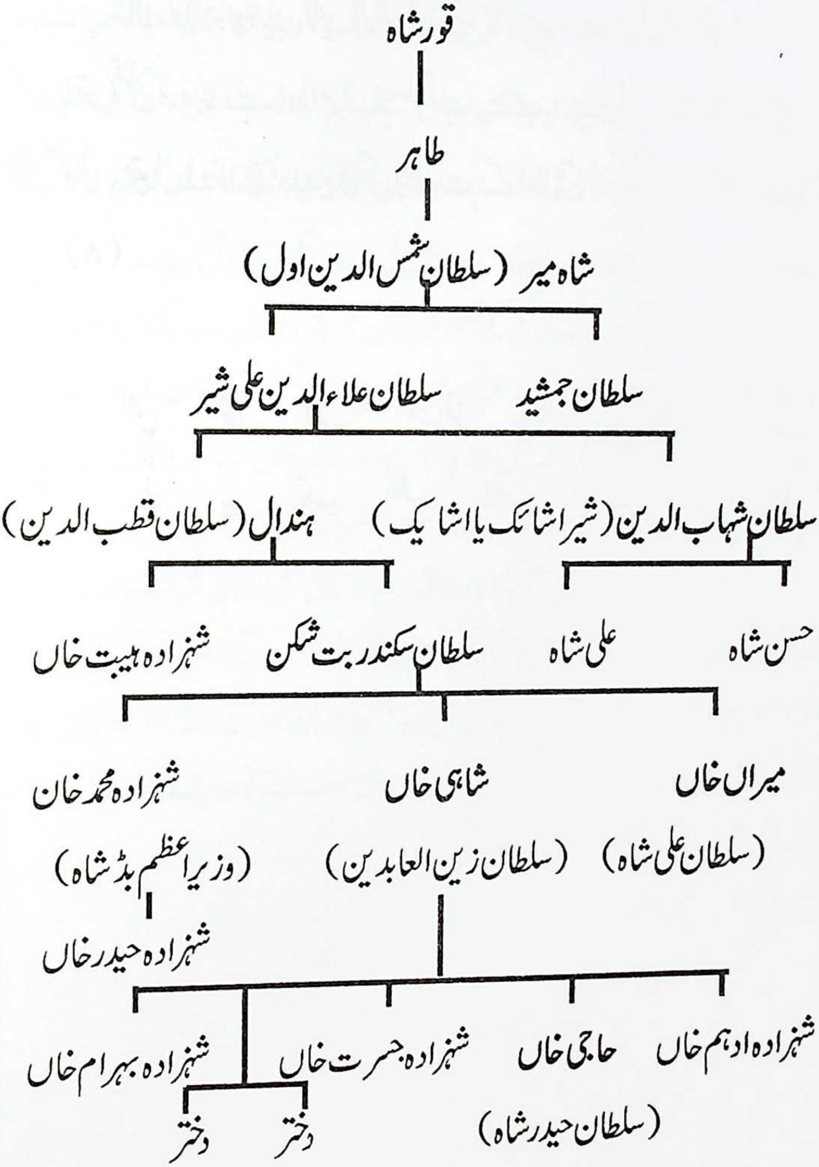
شاہ میر بطور بادشاہ کشمیر

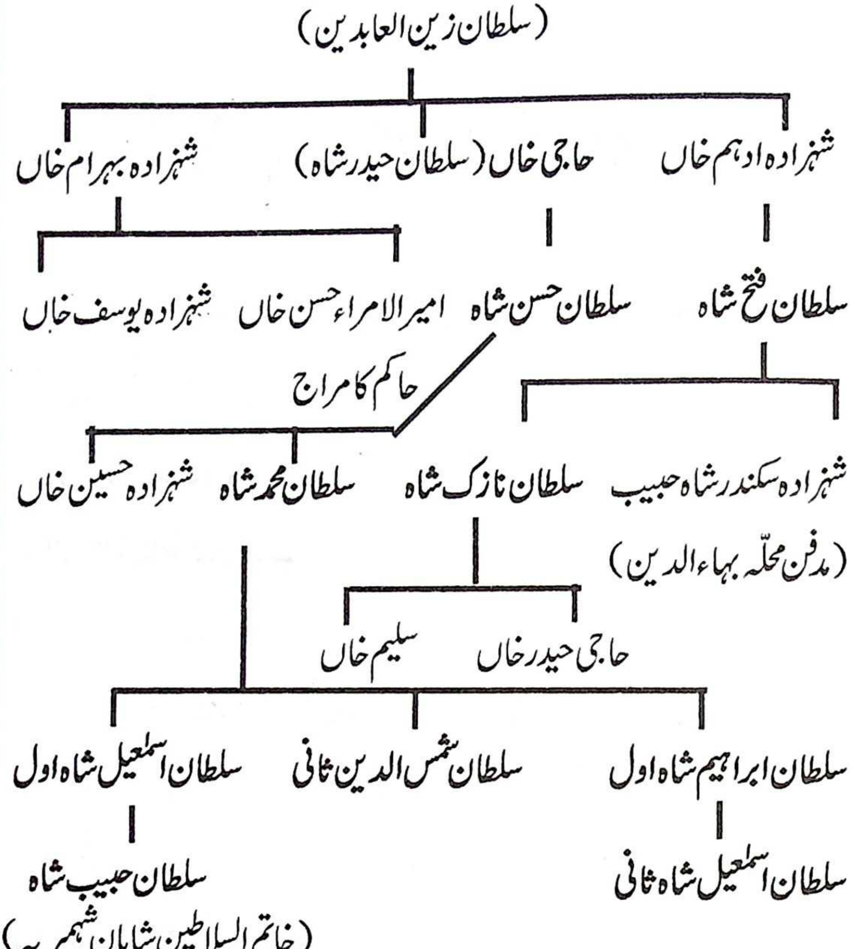
اب پھر تخت کشمیر اپنے وارث سے خالی ہوتا ہے۔کوٹہ رانی اپنے بھائی راون چندر کے ساتھ کچھ ایسے مشورے کرتی ہے کہ اعیان حکومت دل برداشتہ ہو جاتے

ہیں۔اور اگر سارے ملک میں نہیں تو کم از کم سرینگر میں جو دارالحکومت ہے، سخت بدامنی پیدا ہو جاتی ہے۔اور رانی دو مہینے پورے بھی حکومت کرنے نہیں پاتی کہ شاہ میر لجہ بٹ سپہ سالار کو(جواودیان دیو کے شیرخوار پسر کا سرپرست بن کر شاہ میر کی مخالفت کر رہا تھا) قتل کر دیتا ہے۔اور امرائے سلطنت سے عہد و پیمان کر کے اپنے جدامجد کی پیش گوئی یا بقول زونراج مہا دیوی کی بشارت کے مطابق خود کشمیر کا بادشاہ بن جاتا ہے۔(۸)

وہ بھی تھا اک مسافر ایمن مری طرح
تم نے بہ یک نظر جسے موسےٰ بنا دیا

شجرہ نسب شاہان خاندن شاہ میر




(سلطان زین العابدین)
شہزادہ ادہم خاں
حاجی خاں (سلطان حیدر شاہ)
شہزادہ بہرام خاں
سلطان فتح شاہ
سلطان حسن شاہ
امیر الامراء حسن خاں
شہزادہ یوسف خاں
حاکم کامراج
شہزادہ سکندر شاہ حبیب
(مدفن محلّہ بہاء الدین)
سلطان نازک شاہ
سلطان محمد شاہ
شہزادہ حسین خاں
حاجی حیدر خاں
سلیم خاں
سلطان ابراہیم شاہ اول
سلطان شمس الدین ثانی
سلطان اسمٰعیل شاہ اول
سلطان اسمٰعیل شاہ ثانی
سلطان حبیب شاہ
(خاتم السلاطین شاہان شہمیریہ)

شجرہ نسب کے متعلق ایک ضروری تصریح

طبقات اکبری اور مصنف تاریخ فرشتہ نے شاہ میر عرف سلطان شمس الدین بانی خاندان شہمیری کے دو کے بجائے چار فرزند لکھے ہیں: جمشید، علی شیر عرف علاؤ الدین اور تیسرے کا نام کہیں شیرا سالک کہیں شیرا شالک اور کہیں شیر آسا درج ہے اور اس کا لقب سلطان شہاب الدین بتایا ہے۔ چوتھے کا نام شہزادہ ہندال عرف قطب الدین ظاہر کیا ہے۔

لیکن زینہ ترنگنی زونراج نے شہزادہ ہندال اور شہاب الدین دونوں کو شاہ میر کے فرزند سلطان علاؤ الدین علی شیر کے بیٹے لکھا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ شاہ میر کے دو پوتے بڑے قابل تھے۔ ایک کا نام شرج شتا کا، دوسرے کا نام ہمدا تھا۔ زونراج نے شہاب الدین کو شرج شتا کا کے علاوہ شہاودینا بھی لکھا ہے۔ ہمدا سے مطلب ہندال ہے۔ جو قطب الدین ہی کا ایک نام تھا۔ اور اس بارہ میں زینہ ترنگنی کی تحریر بعد کی تاریخوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر و مستند ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی:

(۱) طبقات اکبری طبع کردہ ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال میں صفحہ ۴۲۴ پر سہدیو کا نام سردیو درج ہے۔ جو غلط ہے۔

(۲) صاحب طبقات اکبری ذولچو کے متعلق لکھتے ہیں: ''ذولجو میر بخشی قندھار بودو جمیعت تمام برسر کشمیر آمدہ تمام آں ولایت راز یروزیر ساخت وراجہ سہدیو زر بسیار بر رعایا توجیہہ کردہ بہ جہت پیشکش دلجو فرستادہ خود بگوشہ بدر رفت وازیں امر تمام ولایت کشمیر خراب شدہ دولجو بہ واسطۂ کثرت سرما آں جا نتوانست بودو بہ قندھار بازگشت بود۔ (صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔

(۳) اس کا اصل نام گیالبھو رینچن تھا۔ اس کے آباءواجداد تبت اصلی یعنی لہاسہ کے راجہ تھے اوران کا پتہ تاریخ لداخ سے جس کے جابجا حوالے منشی حشمت اللہ خان وزیر لداخ نے اپنی تاریخ میں دیئے ہیں۔ مسیح سے قریباً پونے چارسوسال قبل ملتا ہے۔ سب سے پہلا راجہ ''نیاٹھی چن پو'' تھا اور آخری راجہ ''لنگ ترما'' کا بیٹا ''یوم سمتن'' تھا۔ جو اس خاندان کا اکتالیسواں راجہ تھا۔ اور جو ۹۳۵ء تک حکمران رہا ہے۔ اس کے بعد یوم سمتن کے بھائی ''ڈھی نم الدے'' کا بیٹا ''اوت شونگ'' راجہ بنتا ہے۔ لیکن اس کی اولاد کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس کے ایک پوتے ''الدے سپل کھوہن'' کا فرزند ثانی ''سکت الدے'' یا ''ڈھی کیدانیما گون'' سوسواروں کے ساتھ مغربی تبت کی طرف قسمت آزمائی کے لئے چلا جاتا ہے اور وہاں ابتدائی کامیابیاں حاصل کر کے لہا چھن خاندان کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ اور ۹۰۵ء سے ۹۹۰ء تک حکومت کرتا ہے۔ اس کے بیٹے ''سلپکی گون'' نے لداخ کو فتح کیا۔ اور اپنے خاندان کا سب سے پہلا نامور راجہ لداخ ہوا۔ اس کی چودھویں پشت میں ''لہا چھن نوروپ گون'' راجہ ۱۲۹۰ء سے ۱۳۴۰ء تک لداخ کا حکمران رہا۔ ''گیالبو رینچن'' اسی کا بیٹا تھا۔ (گیالبو تبتی زبان مین شاہزادہ کو کہتے ہیں) وہ باپ کی بدسلوکی سے تنگ آکر کشمیر چلا آیا۔ کشمیر کے مورخوں نے اس کے صرف ایک مسلمان فرزند شاہزادہ حیدر کا ذکر کیا

ہے۔لیکن منشی حشمت اللہ خان نت تبّتی اور لامی تاریخوں کے حوالہ سے اس کے ایک لامی (بدھ مذہب) کے فرزند ''لہاچھن شیرپ'' کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو اپنے دادا کے بعد ۱۳۴۰ء سے ۱۴۰۰ء تک لداخ کا راجہ رہا اور جس کی اولاد ۱۵۳۲ء تک لداخ میں حکومت کرتی رہی۔آخر مرزا حیدر دوغلات نے ۹۳۹ھ مطابق ۱۵۳۲ء میں اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔(از تاریخ جموں و ملحقات مصنف منشی حشمت اللہ خان)

(۴) ارجن پانڈو کا بیٹا اور بھیم و ریدھشتر کا حقیقی بھائی تھا۔اس کا فرزند ابھمن۔ جنگ کورو و پانڈو میں دریودھن کے بہنوئی راجہ جیدرتھ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔اس کی ہلاکت کے بعد اس کا بیٹا پریکھت ہیدا ہوا جو یدھشتر کی ۶ سالا حکومت کے بعد راجہ بنا۔

(۵) میرزا گورگانی بابر کا خالہ زاد بھائی تھا۔انگریزی کتاب ''ہمایوں بادشاہ'' کے مصنف ایس کے بینر جی، ایم اے پی ایچ ڈی نے اس کا سلسلہ بابر سے اس طرح ملایا ہے۔یونس خاں مغل شہزادہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ایک خوب نگار خانم جس کا خاوند محمد حسین میرزا دوغلات تھا، دوسری قتلق نگار خانم جس کا خاوند عمر شیخ میرزا حاکم فرغانہ تھا۔خوب نگار خانم کے فرزند کا نام محمد حیدر میرزا تھا اور قتلق نگار خانم کے فرزند کا نام محمد ظہیر الدین بابر بادشاہ تھا۔حیدر میرزا ابتداء میں کامیران میرزا یعنی بابر کے فرزند کے ماتحت لاہور کا نائب گورنر رہا۔لیکن کامران نے اس کو کسی وجہ سے اور شاہ اس وجہ سے کہ وہ ہمایوں کا طرفدار تھا، عہدہ نیابت ست ہٹا دیا۔وہ ۱۵۰۹ء میں بابر کے پاس چلا گیا۔حیدر میرزا چار سال تک پنجاب میں کامران کے ماتحت حکومت کرتا رہا۔بابر کے بعد اس نے ہمیشہ ہمایوں کا جو بابر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا تھا ساتھ دیا۔بلکہ اسی نے ہمایوں کو کشمیر پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔لیکن ہمایوں اس وقت خود شیر شاہ سوری کے خوف سے پنجاب کو چھوڑ کر سندھ کے ریگستان کی طرف جا رہا تھا۔

(۶) وفات خواجہ نظام الدین مہروی ۱۰۰۳ھ بزمانہ اکبر سال تصنیف طبقات اکبری ۱۰۰۱ھ

(۷) رینچن شاہ کے فرزند کا پیدائشی نام شاید چندر ہو۔لیکن اسلامی نام اس کا حیدر تھا۔جب

رینچن شاہ نے تخت کشمیر پر قبضہ کیا ہے تو اس کے فرزند کی عمر ساڑھے گیارہ سال تھی۔اور اس نے اپنے مسلمان ہونے کے ساتھ ہی بیٹے کو بھی مسلمان کر کے اس کا نام حیدر خاں رکھ لیا تھا۔چونکہ حیدر اور چندر میں تجنیس خطی موجود ہے۔اس لئے حیدر کی جگہ طبقات اکبری میں غلط نام درج ہے۔

(۸) شاہ میر یعنی سلطان شمس الدین کا مقبرہ موضع سنبھل میں واقع ہے۔یہ مقبرہ سلطان صاحب یا سلطان پادشاہ کے نام سے مشہور ہے۔یہ مقبرہ ایک کوٹھری میں ہے جو اندازاً اٹھارہ بیس فٹ مربع ہے۔کوٹھری کی چھت کے تختے بوسیدہ ہو کر گر چکے ہیں۔قبر پانچ فٹ لمبی اور چوبی تعویذ سے ڈھکی ہوئی ہے۔کوٹھری اس قسم کی نیم خام اینٹوں کی ہے جیسی کشمیر کے دیہات میں عام طور پر نیم پختہ دیکھی جاتی ہیں۔اس کوٹھری کی دیوار کے گرد پھر ایک کچی دیوار ہے جس میں جا بجا منقش سنگی تعویذ لگے ہوئے ہیں۔اور جن پر کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔اس دیوار کے باہر بھی اس قسم کے تعویذ دیکھے گئے۔یہ اس بادشاہ کی قبر کا حال ہے جس نے کشمیر میں اس عظیم الشان خاندان کی بنیاد رکھی۔جو دو سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک کشمیر کا حکمران رہا۔اور جس نے قطب الدین، شہاب الدین، سلان سکندر اور بڈشاہ جیسے اولوالعزم بادشاہ پیدا کئے۔

فاعتبروا یا اولابصار

دوسرا باب

بادشاہ کے ایام شہزادگی

مورخین کشمیر کی تاریخی فروگزاشتیں

کشمیر کے سب سے پہلے تاریخ نویس نے چونکہ تاریخ کی بناء نظم پر رکھی تھی جو سنسکرت زبان میں تھی۔ اس لئے اس کی تقلید میں سنسکرت زبان کے مؤرخوں نے اپنی تمام تاریخیں نظم ہی میں لکھیں۔ سنسکرت تاریخوں کے ساتھ ساتھ بعض تاریخیں فارسی میں بھی لکھی گئیں۔ مگر نظمیہ تاریخوں کی تقلید میں کشمیر کے شاعر گورنر سکھ جیون نے اپنے عہد میں کشمیر کی تاریخ نظم ہی میں لکھوائی۔

یہاں تک بھی کوئی قباحت نہ تھی۔ مگر زیادہ افسوس یہ ہے کہ کشمیر کے مورخین نے قدیم راجاؤں، نہ مسلمان بادشاہوں، نہ صلحاء وعلماء کے حالات میں ان کی سنین پیدائش اور عام ملکی معاملات اور طرز حکومت وغیرہ کا کوئی خاص خیال رکھا۔

بزرگانِ دین کے سوانح میں تو زیادہ زور ''نقل است''، ''روایت است''، ''گفتند''، ''مے گویند'' پر ہی دیا گیا ہے۔ اور اس بات کا مطلق لحاظ نہیں رکھا گیا کہ جو

واقعہ ''نقل است'' کے ذریعہ وہ تحریر کر رہے ہیں۔ اس کے تسلیم کرنے میں ''عقل است'' کی بھی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور ''گفتند'' اور ''مے گویند'' کی تاریخی واقعات سے بھی کچھ تطبیق ہوسکتی ہے یا نہیں۔ صلحاء ومشائخ کے تذکرہ نویسوں نے عقل و تاریخ اور تحقیق و تدقیق سے کام لینے کی بجائے زیادہ تر اظہار کرامات وخوارق عادات ہی کو اپنا مقدس فرض سمجھا ہے۔

اس سلسلہ میں مؤرخین کشمیر پر ایک بدنما دھبہ ہے کہ بڈشاہ جیسے مشہور و جلیل القدر اور بے تعصب بادشاہ کے متعلق جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں ہردل عزیز تھا۔ کشمیر کی کسی تاریخ میں اس کی تاریخ پیدائش تو کجا سنہ پیدائش کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔

بادشاہ کے سال پیدائش کی تحقیق

بڈشاہ کے زمانے میں جو فارسی تاریخیں ملا نادری اور ملک احمد ملک الشعراء کی تصنیف سے بتائی جاتی ہیں، وہ تو بالکل عنقا ہیں۔ معلوم نہیں ان میں بادشاہ کی پیدائش کا ذکر تھا یا نہیں۔ لیکن بڈشاہی عہد کے سنسکرت زبان کی تاریخیں جو اپنے تراجم سمیت اس وقت موجود ہیں، ان میں بھی صرف ایک زینہ راج ترنگنی مصنفہ شریور بٹ میں اس کے سال وفات کا ذکر ہے۔ پیدائش کا سال اس نے بھی نہیں لکھا۔ اس نے بادشاہ کی وفات ۴۶ لوکک میں بتائی ہے اور یہ لوکک سال اس زمانے میں

۴۵۴۶ تھا۔اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مصنف نے پنڈت کلہن وغیرہ قدیم مصنفوں کی تقلید میں آبادی کشمیر یا کلجگ کی تاریخ ہی سے اس سنہ کا شمار کیا ہے۔یعنی بادشاہ کی وفات کے زمانے تک کشمیر کو آبادی کی صورت اختیار کئے ۴۵۴۶ سال گزر کے تھے۔

لوکک ۴۵۴۶ ۱۴۷۰ء کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔اور ۱۴۷۰ء کی موافقت میں ۸۷۴ھ کا نام لیا جاتا ہے۔لیکن کشمیر کی قدیم فارسی تاریخوں مثلاً تاریخ خواجہ اعظمی وغیرہ میں اس کا سال دفات ۱۴۷۴ء مطابق ۸۷۵ھ بتایا گیا ہے۔عیسوی سن کے مطابق چار سال اور ہجری سنہ کے مطابق ایک سال کا فرق ان تاریخوں میں موجود ہے۔بڈشاہ کے ایام حکومت شریور کی زینہ راج ترنگنی کے مطابق پچاس سال ہیں۔اور مصنف تاریخ خواجہ اعظمی کی تحریر ''پنجاہ و دو سال حکومت کردہ۔در تاریخ ہشت صد و ہفتاد ہشت ازیں عالم در گزشت'' کے مطابق باون برس ہیں۔اور مکمل تاریخ کشمیر (اردو) میں مدت حکومت سوا اکیاون سال اور سال وفات ۸۷۹ھ درج ہے۔اس طرح سال تخت نشینی میں بھی تین چار سال کا فرق مختلف تاریخوں سے نظر آرہا ہے۔غرض اس قسم کا فرق جہاں صدیاں گزر جائیں اور ابتداء میں کسی نے تاریخ یا سال پیدائش لکھنے کی طرف توجہ بھی نہ کی، کوئی اہم فرق نہیں ہے۔تاہم بڈشاہ کی عمر ۶۹ سال تسلیم کرنے میں کئی مورخوں کو اتفاق ہے۔(۱)

اور اس بارے میں سب سے بڑی سند شریور کی زینہ راج ترنگنی ہے۔جہاں صاف الفاظ میں اس کی عمر ۶۹ سال اور مدت حکموت پچاس سال درج ہے۔اس تحریر

کے مطابق بادشاہ نے ۴۵۴۶ لوکک میں انتقال کیا تھا۔ ۴۵۴۶ لوکک کے مطابق ہجری سال ۸۷۴ھ ہے۔ شریور نے بادشاہ کی تخت نشینی کا سال ۴۴۹۶ لوکک مطابق ۸۲۴ھ لکھا ہے۔ اور فارسی مورخوں کی تاریخوں کے مطابق اس کی تخت نشینی کا سال ۸۲۶ھ ہے۔ صرف تین سال کا فرق ہے۔ جو زیادہ اہم نہیں ہے۔

اس حساب سے اس کا سال وفات ۸۷۴ھ اور عمر اس کی ۶۹ سال ہے۔ اس کا سال پیدائش ۴۴۴۷ لوکک مطابق ۸۰۵ھ نکلتا ہے۔ اس کے باپ سلطان سکندر کی وفات ۸۲۰ھ میں ہوتی ہے۔ اس وقت بادشاہ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ طبقات اکبری کا مصنف بھی لکھتا ہے کہ جب سلطان سکندر نے وفات پائی، تو اس کے فرزند ابھی چھوٹی عمر کے تھے۔ اس نے ان کو اتحاد و اتفاق کی نصیحت کی۔ علی شاہ بادشاہ کا بڑا بھائی تھا۔ وہ تخت پر بیٹھا۔ اس کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوگی۔ شاہی خاں یعنی بڈشاہ اور شہزادہ محمد خاں یہ دونوں علی شاہ سے چھوٹے تھے۔ ۸۲۴ھ میں ملک سیف الدین عرف سیہہ بٹ کی وفات کے بعد علی شاہ اپنے چھوٹے بھائی زین العابدین کو اپنا نائب السلطنت اور وزیر اعظم مقرر کرتا ہے۔ اس وقت زین العابدین کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں بھی اس نے شجاعت و جوانمردی میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ جیسا کہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ ''سلطان برادر خورد و شاہی خاں را کہ بہ شجاعت و کیاست مشہور بود و بہ وزارت برگزید۔'' (۲)

بادشاہ کا اصل نام کیا تھا؟

بڈشاہ اپنے بھائی علی شاہ سے جس کا اصل نام میراں خاں تھا، چھوٹا تھا۔ جب یہ پیدا ہوا تو باپ نے آثار سعادت و اقبال دیکھ کر نام شاہ رخ (۳) رکھا۔ کشمیر میں چونکہ اصل نام سے بہت کم لوگ مشہور ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی نہ کوئی عرف ان کے اعمال یا ان کے خاندان یا ان کے مشکل نام کی وجہ سے جو زبان پر آسانی سے نہیں چڑھ سکتا، مشہور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اصل نام کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح شاہ رخ کا نام اہل کشمیر نے شاہی خاں پکارنا شروع کیا۔ اور شہزادگی کے زمانے تک وہ اسی نام سے مشہور رہا۔ اور اب غالباً کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ اصلی نام شاہ رخ تھا یا شاہی خاں۔ بلکہ عوام اب ان دونوں ناموں کو بھول کر صرف اس کے عرف عام بڈشاہی کے نام سے واقف وآگاہ ہیں۔

بچپن اور تعلیم

شاہی خاں کے بچپن میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ محلات شاہی میں پیدا ہوا، وہیں پلا اور وہیں اس نے بچپن گزارا۔ اس کے بچپن کے صرف دو واقعے مختلف تاریخوں کی چھان بین کے بعد مل سکے ہیں۔ اور ان کا تعلق بھی مشائخ عظام کی "ذات اقدس" سے ہے۔ اس کے باپ سلطان سکندر کے زمانے میں سید حسین

خوارزمیؒ (۴) ایک بہت بڑے بزرگ کشمیر میں رونق افروز تھے۔ سکندر ایک دن اپنے دونوں شہزادوں کو دعائے حصول دولت و برکت کے لئے سید ممدوح کے پاس لے گیا۔ چنانچہ آپ کی دعا سے دونوں شہزادے سعادت دارین سے بہرہ ور ہوئے۔ یعنی پہلے بڑا بھائی تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد شاہی خاں۔

شاہی خاں اپنے بچپن کے زمانے میں ایک مرتبہ شیخ بہاء الدینؒ کی خدمت میں گیا۔ وہ اس کی خوش تمیزی و خوش کلامی سے بہت خوش ہوئے۔ نظر فیض اثر سے دیکھا۔ اور فرمایا (بحکم خدا) ''ترا بادشاہ دین و دنیا کردیم و گنج ہائے فراداں بہ تو بخشیدیم۔''

شاہی خاں کے آئیندہ حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ واقعی ''بادشاہ دین و دنیا'' ہو کر گنج ہائے فراداں کا مالک بنا۔ اسی دن سے بہاء الدینؒ ''گنج بخش'' کے نام سے موسوم ہو گئے۔

سکندر نے اپنے ہونہار فرزند کے لئے مولانا کبیر کو جو دینی و دنیوی علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے درحقیقت استاد اکمل تھے، استاد مقرر کیا۔ معمولی رئیس زادوں کی رسم بسم اللہ دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ شاہی خاں کو جب استاد نے پہلا سبق دیا ہوگا، تو باپ نے کیا کچھ جشن نہ منایا ہوگا۔ شاہی خاں کو علوم دینی و دنیوی سے جو محبت تھی وہ سب مولانا ہی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھی۔

بادشاہ کی والدہ

مورخین کشمیر نے سلطان سکندر کی بیگمات کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ سوائے اس امر کے کہ مقبرہ بڈشاہ کے احاطے کے اندر جو ڈمٹ ہے وہ سکندر کی بیگم اور بڈشاہ کی والدہ کا ہے۔

زینہ ترنگنی کے مصنف زونراج نے سکندر کی بیگمات اور بڈشاہ کی والدہ کے متعلق البتہ چند سطور لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''سکندر نے جب اُدبانڈ پور (۵) کے فرمانروا کو شکست دی تو اُدبانڈ پور کے فرمانروا نے شکست کے بعد اپنی لڑکی سلطان سکندر (٦) کو دے کر اس کے ساتھ صلح کر لی۔ اس راج کماری کا نام شری میرا (٧) تھا ۔ وہ یقیناً ایک دیوی تھی۔ جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ اس کے بطن سے وہ نامور فرزند پیدا ہوگا جو کشمیر کو خوش حال بنائے گا۔ اور ملک کی بے اطمنیانی و بے چینی کو دور کرے گا۔ جو ملیچھوں (٨) کے ظلم وتشدد سے تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ اس شہزادے کا نام ''جنیول عابدین'' ہے۔ جو اس کلجگ کے زمانے میں نیکیوں اور بھلائیوں کا ایک سرچشمہ ہے۔''

زونراج آگے چل کر لکھتا ہے۔ ''شری میرا کے بطن سے اور بھی دو شہزادے تھے۔ جن میں بڑا میرا خاں عرف علی شاہ تھا۔ اور سب سے چھوٹے کا نام محمد خان تھا۔ اس بیگم کا مقبرہ مہاراج گنج احاطہ مزار السلاطین کے اندر ایک بلند گنبد کی صورت میں اب تک اقبال سکندری پر نوحہ کر رہا ہے۔ اس عمارت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی روغنی اور سانچہ کی ڈھلی ہوئی اینٹیں جو بیرونی دیواروں میں تھوڑے

تھوڑے فاصلہ پر لگی ہوئی ہیں اپنی قدیم صنعت کا ثبوت دے رہی ہیں۔" (۹)

زونراج کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کی ایک اور بیگم بھی تھی۔اس کا نام اس نے شوبھا دیوی لکھا ہے۔معلوم نہیں وہ کس ہندو راجہ کی راجکماری تھی۔وہ صرف اسی قدر لکھتا ہے کہ شوبھا دیوی بے حد امیر تھی۔اس نے اپنی دولت کے جائز استعمال سے دین و دنیا کی نعمتیں حاصل کر لی تھیں۔اس کے بھائی کا نام راجہ ضنجیہ تھا۔جس کو ایک مفرور اور طاقتور سردار اودا نے قتل کر دیا تھا۔اس رانی کے بطن سے کوئی اولاد بھی نہ تھی۔اس لئے اس نے دو لڑکوں کو اپنی دل بستگی کے لئے متبنّٰی بنا رکھا تھا۔ان میں سے ایک کا نام پیروز (فیروز) تھا اور دوسرے کو جس کا نام زونراج نے نہیں لکھا، بادشاہ نے کسی وجہ سے جلاوطن کر رکھا تھا۔(۱۰)

سمرقند میں نظر بند رہنے کا قصہ

کشمیر کی اکثر تاریخوں میں یہ قصہ مذکور ہے۔کہ امیر تیمور فتح ہند (۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۸ء) کے بعد سلطان سکندر بادشاہ کشمیر کے فرزند دوئم شاہزادہ شاہی خاں کو اپنے ہمراہ سمرقند لے گیا۔اور اس وقت تک شہزادے کو مراجعت کشمیر کا موقع نہ مل سکا جب تک کہ امیر تیمور اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت نہ ہو گیا۔یہ واقعہ ۸۰۷ھ کے بعد کا بیان کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اس قصہ کو خواجہ محمد اعظم دیدہ مری مصنف تاریخ اعظمی نے ۱۱۴۸ھ میں بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی بیان کیا ہے۔اور لکھا ہے۔"در بعض تواریخ

خصوصاً ظفر نامہ کہ دراحوال امیر تیمور مرقوم است دیدہ شد کہ شاہی خاں پسر سلطان سکندر خاں کہ مشہور بہ زین العابدین است برائے ملازمت امیر تیمور رفتہ بود۔او سمرقند بُردہ وشہر نبد کردہ بعد وفات امیر تیمور خلاصی یافتہ۔ والعلم عنداللہ۔"

لیکن ظفر نامہ تیموری قلمی میں جو پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔مولانا شرف الدین یزدی کشمیر کے متعلق اور بہت کچھ لکھتے ہیں۔سلطان سکندر کا ذکر بھی کرتے ہیں۔امیر تیمور کے ایلچی بھی سکندر کے پاس آتے ہیں۔سلطان سکندر ہاتھی اور دیگر تحائف اور ہدایا اپنے ایلچیوں کے ہاتھ امیر تیمور کی خدمت میں ارسال کرتا ہے۔لیکن اس میں شہزادہ شاہی خاں کے سمرقند جانے یارئیس الوفد ہونے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔تعجب ہے ظفر نامہ کے متعلق خواجہ محمد اعظم نے "دیدہ شد" بھی لکھا ہے اور "العلم عنداللہ" کا سہارا بھی لیا ہے۔ظفر نامہ تیموری کے علاوہ تزک تیموری بھی راقم مؤلف کی نظر سے گزر چکی ہے۔اس میں بھی اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

طبقات اکبری تاریخ اعظمی سے قریباً ڈیڑھ سوسال پہلے کی تصنیف ہے۔وہ بھی شاہی خاں کے سمرقند جانے کے متعلق قطعی خاموش ہے۔چنانچہ صاحب طبقات اس موقعہ پر جب امیر تیمور سلطان سکندر کو سرحد کشمیر یعنی (آب سندھ) پر حاضر ہونے کا حکم دیتا ہے۔لکھتے ہیں۔"شنید کہ حضرت صاحب قرآنی از آب سندھ گزشتہ متوجہ سمرقند شدند۔ایلچیاں را با پیش کش بسیار بخدمت آنحضرت فرستادہ بہ کشمیر مراجعت نمود۔"

صاحب طبقات نے بھی صرف ایلچیوں کا ذکر کیا ہے۔شہزادے کا کہیں نام

نہیں لیا۔تاریخ رشیدی، طبقات اکبری سے بھی پچاس ساٹھ سال قبل کی تصنیف ہے۔اس میں بھی شہزادے کے سمرقند جانے کا ذکر نہیں ہے۔

طبقات کے بعد ملک حیدر چاڈورہ نے ۱۰۲۷ھ مطابق ۱۲ جلوس جہانگیری میں کشمیر کی تاریخ لکھی ہے۔وہ بھی ایلچیوں کا ذکر کرتا ہے،شاہی خاں کا کہیں نام نہیں لکھتا۔چنانچہ ذیل میں اس کے اصل الفاظ درج کیے جاتے ہیں۔

''در زمان سلطنت سلطان (سکندر) مذکور امیر تیمور صاحب قرآں ہندوستان آمدند و فتح ہند نصیب اولیائے دولت ایشاں گردید۔و با سلطان سکندر راہ مراسلات و مکاتبات نمودہ و یک زنجیر فیل برائے ایشاں فرستادو سکندر مذکور تحفہ و ہدایا چنداں برائے صاحب قرآں ارسال نمود کہ محاسبان از حساب آں عاجز آمدند۔''

۱۱۲۲ھ میں نرائن کول عاجز نے بہ عہد عارف خاں نائب صوبۂ کشمیر کشمیر کی جو تاریخ لکھی ہے،اس میں بھی اس نے شاہی خاں کے سمرقند جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔غرض خواجہ محمد اعظم سے قبل کسی مورخ نے شاہی خاں کے سمرقند جانے اور وہاں چھ سات سال نظر بند رہنے کا ذکر نہیں کیا۔البتہ اس کے بعد جو مؤرخ (۱۱) گزرے ہیں،انہوں نے تاریخ اعظمی کی سند پر شاہی خاں کے سمرقند جانے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ پنڈت بیربل کاچرو جو مہاراجہ گلاب سنگھ بانی خاندان ڈوگرہ کے عہد میں گزرا ہے۔دو جگہ شاہی خاں کے سمرقند جانے کا ذکر کرتا ہے۔ایک جگہ لکھتا ہے۔

''عریضہ باتحف و ہدایا بدست شاہی خاں بچہ خود را کہ معروف بہ زین العابدین بود بہ بارگاہ او فرستادہ امیر تیمور ازین حرکت او نہایت رضا مند گردید دفیل و

خلعت برائے اُوارسال داشت۔شاہی خاں راہمراکا بے بُردہ درسمرقند نبد بمود و بعد وفات اوازاں جارہائی یافتہ بہ کشمیرآمد"۔(۱۲)

کشمیر کی تاریخ حسن (۱۳) میں شاہزادہ شاہی خاں کے مفروضہ سفر سمرقند کے ہمراہیوں میں دونام خصوصیت سے درج ہیں۔ایک کھُکھی خاں،ایک حاتم خاں یا ہاتو خاں۔مصنف نے ان دونوں کونو مسلم راجپوت اور حقیقی بھائی بتایا ہے۔لیکن سکندر کے ایلچیوں میں نہ یہ دو نام درج ہیں اور نہ کسی اور قدیم مورخ نے سلطان سکندر یا بڈشاہ کے عہد میں ان کے وجود کا ذکر کیا ہے۔

صاحب "اسلامک کلچران کشمیر" نے بھی اپنے ایڈیشن اول میں تاریخ خواجہ اعظمی اوراس کے زمانہ مابعد کی تاریخوں کی تقلید کی ہے۔بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جب شاہی خاں کوامیر تیمور ۸۰۱ھ میں اپنے ہمراہ سمرقند لے گیا تو شاہی خاں عنفوان شباب کے عالم میں تھا۔لیکن یہ قصہ کئی وجوہ سے نا قابل تسلیم ہے۔ایک وجہ تو یہ ہے کہ نہ ظفرنامہ تیموری میں اس کا ذکر ہے،نہ تزک تیموری میں۔اس کے غلط ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ شاہی خاں عرف بڈشاہ کے زمانے میں جونامور مورخ زونراج اورشریورگزرے ہیں،ان دونوں نے اس کے سمرقند میں نظربند ہونے یاایلچیوں کے ہمراہ بطور رئیس الوفد سمرقند جانے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ چونکہ یہ دونوں مورخ بادشاہ کے مقرب اور درباری تھے۔اس لئے انہوں نے بادشاہ کے پاس خاطر سے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا ہو۔لیکن ظفرنامہ تیموری کے مصنف اورخود امیر تیمور کو اپنی توزک میں اس کا ذکر کرنے سے کونسا امر مانع تھا۔بلکہ وہ بطور فاتح فخر کے ساتھ

مفتوح یا زیر اقتدار بادشاہوں کا ذکر کر سکتے تھے۔ جیسا کہ بادشاہ دہلی سلطان محمود تغلق پر فتح حاصل کرنے اور راجہ جموں کو گرفتار کرنے اور فتح لاہور کے بعد گکھڑوں کو تباہ کرنے کا ظفر نامہ اور توزک میں تفصیل سے ذکر ہے۔

تیسری دلیل اس واقعہ کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ بڈشاہی عہد کے مورخوں کی تحریروں کے مطابق بڈشاہ کی پیدائش ۸۰۵ھ مطابق ۱۴۰۳ء میں ہوئی ہے۔ اور امیر تیمور ۸۰۰ھ میں ہندوستان آتا ہے۔ اور فتح ہند کے بعد ۸۰۱ھ میں واپس سمرقند چلا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ بڈشاہ کی عمر چار سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور بالفرض اگر تیمور اسے لے بھی گیا تھا تو بڈشاہ تیمور کی وفات (۸۰۷ھ) کے وقت دس گیارہ سال سے زیادہ عمر کا نہ تھا۔ اس عمر میں وہ سمرقند سے صاحبان علم و فضل اور اہل فن و ہنر کے کمالات اور اپنی ملکی ضروریات سے کس طرح واقف ہو سکتا اور انہیں کشمیر لا سکتا تھا۔

حواشی:

(۱) میں نے خود اپنی مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم مطبوعہ ۱۹۱۰ء میں بڈشاہ کی عمر ۶۹ سال لکھی ہے۔

(۲) جلد دوم صفحہ ۴۳۴

(۳) فتحیات کبرویہ غیر مطبوعہ صفحہ ۳۱۹

(۴) آپ کا مزار تحصیل سنوارا میں ہے۔

(۵) اُدباند پور کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۲۔

(۶) دیکھو انگریزی ترجمہ جے سی دت آف کلکتہ سائز کلاں صفحہ ۵۸

(۷) بعض اصحاب نے بتایا ہے کہ میرا کا صحیح تلفظ مہر ہے۔ ہندی اور سنسکرت میں ناموں کے آگے الف زیادہ لگا دیتے ہیں۔ جیسے قندہار کو قندہارا، دت کو دتا، کرشن کو کرشنا کہتے ہیں۔ اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ اصل نام مہر یا مہر خاتون تھا۔ سنسکرت مصنف نے مہر میں الف زائد کر کے مہر کی بجائے میرا لکھ دیا ہے۔ لیکن راقم مؤلف ۱۰ بھادوں ۱۹۹۵ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۳۸ء کو جب بنگو علاقہ زینہ گیر میں تھا تو منشی برکت علی خان تحصیلدار ہندواڑہ کے روبرو دو بہنیں انتقال زمین کی تصدیق کرانے کے لئے پیش ہوئیں۔ جن کے نام میرا اور ہیرا تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا نام اب تک کشمیر میں چلا آتا ہے۔ یہ نام کشمیر ہی کی پیدائش ہے۔ اصل نام اس بیگم کا جو اس کی والدہ نے رکھا تھا، اس کا کسی نے صحیح پتہ نہیں بتایا۔ میرا کے ساتھ شری کا جو لفظ ہے وہ ادباً اور تعظیماً ہے۔ علاوہ ازیں میرا نام کے کشمیری ہونے کا ایک اور ثبوت بھی ملتا ہے۔ سید شمس الدین اندرابی جو سید میر میرک اندرابیؒ کے والد تھے کی شادی سید فضل اللہ منطقی خلف سید حسن منطقیؒ بڈشاہی کی دختر

میرابائی سے ہوئی تھی۔اس معزز خاتون کا نام میرابی بی اور میرا باجی دونوں طرح تاریخوں میں درج ہے۔دیکھو مناقب السادات حصہ اول صفحہ ۱۰ اور ۱۱ مصنفہ مولوی محمد شاہ سعادت مفتی سرینگر۔یہ نام ہندوستان اور پنجاب میں بھی عام طور پر رائج ہے۔جیسے راجپوتانہ کی میرابائی جو بڑی شاعرہ مشہور ہے۔اور بڈشاہ کے بھائی سلطان علی شاہ کا نام میراخاں تھا۔

(۸) زونراج اور شریور جہاں کہیں مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔وہ ان کو ملیچھ کے مکروہ الفاظ ہی سے یاد کرتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے عہد بڈشاہی سے پیشتر کشمیر کے پنڈتوں کو جو مزہبی و مالی نقصان پہنچا ہے۔ان ہتک آمیز الفاظ کے ذریعے یہ دونوں مصنف اپنے دل کو کچھ تسکین دے لیا کرتے تھے۔بلکہ بلبل لنکر شہر کے جس حصہ میں ہے،اس کو بھی ہندو ملیچھ مر کہتے ہیں۔ملیچھ اس زمانے میں ہر غیر ہندو کا نام تھا۔اور مر بزبان کشمیری جگہ کو کہتے ہیں۔

(۹) پنڈت انندکول بامزئی جو انگریزی زبان کے مشہور کاشمیری مصنف تھے۔اپنے جغرافیہ ریاست جموں وکشمیر میں لکھتے ہیں۔جس مقام پر سلطان سکندر کی بیگم مدفون ہے،یہاں مہاراجہ پرورسین دالئے کشمیر نے مہاشری کے نام سے مندر تعمیر کیا تھا۔یہ عمارت اسی مندر کے چبوترے پر بنائی گئی ہے۔اب یہ مندر معدوم ہے۔اور مندر کی بجائے اب اس کا نام مقبرہ بڈشاہ یا مزار السلاطین ہے۔

(۱۰) زونراج نے نہ فیروز کے مزید حالات پر روشنی ڈالی ہے اور نہ جلاوطن لڑکے کا نام اور اس کی جلاوطنی کی وجہ بتائی ہے اور نہ یہ لکھا ہے کہ وہ لڑکے کس خاندان سے تھے۔گمان غالب ہے کہ شہمیری خاندان ہی سے ہونگے۔

(۱۱) مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم اور دیگر اردو فارسی تاریخوں میں بھی تاریخ اعظمی ہی کا تتبع کیا گیا ہے۔

(۱۲) ورق ٦۵ قلمی کتاب سری پرتاپ لائبریری سرینگر کشمیر۔

(۱۳) تاریخ حسن بڑی ضخیم کتاب ہے۔اور چار جلدوں میں ہے۔مصنف نے اس پر بڑی محنت کی ہے۔متذکرہ صدر واقعہ کا ذکر جلد اول کے صفحہ ۱۱۸ پر ہے۔مصنف نے ان دونوں نومسلم راجپوتوں کو راجگان کھکھہ وبمبہ وہتمال کا جو کشمیر کی تحصیل اوڑی میں جاگیردار ہیں، مورث اعلیٰ بتایا ہے۔لیکن جدید تحقیقات اور بالخصوص کھکھہ قوم کے تاریخی حالات سے یہ امر بھی پایہ ثبوت تک نہیں پہنچتا۔یہ تاریخ اب تک غیر مطبوعہ ہے اور کشمیر کی سرکاری لائبریری کے علاوہ اور کئی لوگوں کے پاس بھی موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

تیسرا باب

شاہی خاں کی اپنے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر سے جنگ

سلطان سکندر کی وفات اور علی شاہ کی تخت نشینی

تپ محرقہ جب مرض الموت بن کر سلطان سکندر کا دامنگیر ہوا، تو اس نے اپنے تینوں بیٹوں میرا خاں، شاہی خاں اور محمد خاں کو بلوایا۔ اتفاق و اتحاد کی نصیحت کی۔ پسر کلاں میراں خاں عرف علی شاہ کو خلعت ولی عہدی عطا کیا اور باقی دونوں کو اس کی متابعت کا حکم دے کر ۲۲ محرم ۸۲۰ھ مطابق ۱۴۱۰ء کو اس جہاں فانی سے رخصت ہو گیا۔

ملک سیف الدین بٹ جو سکندر کے زمانے میں سلطنت کا مختار جز و کل تھا بدستور علی شاہ کا وزیر بنا رہا۔ شاہی خان اور محمد خان کو جاگیریں عطا کی گئیں۔ پانچ سال کے بعد ۸۲۵ھ میں ملک سیف الدین بھی انتقال کر گیا۔

شاہی خان منصب وزارت پر

سیف الدین بٹ عرف سیہہ بٹ کے انتقال کے بعد علی شاہ نے منصب وزارت پر اپنے چھوٹے بھائی شاہی خان کو سرافراز کیا۔ اس وقت ملک کی یہ حالت تھی کہ چاروں طرف ملک سیف الدین کے خوف و تشدد سے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہندو بالخصوص سہمے ہوئے تھے۔ اس کی وزارت کے زمانے میں کئی ہندو جلاوطن ہوگئے۔ اور کئی خودکشی کر کے اس کے ظلم سے نجات حاصل کر گئے۔ جیسا کہ صاحب طبقات اکبری جلد دوم کے صفحہ ۴۳۴ پر لکھتے ہیں کہ "اکثرے از ہندوان جلاوطن گشتند و بعض ہا خود را کشتند"۔

شاہی خان نے نہایت نازک حالت میں وزارت کشمیر کا قلمدان اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسلام کی تعلیم نے اخلاق و مساوات کا جو سبق اسے دیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے جو بدگمانی ماتحت قوم کو ہو رہی ہے، اس کو دُور کرے۔ اسی بنا پر اس نے بادشاہ سے کامل انتظامی اختیارات طلب کیے جو اس نے عنایت کر دیئے۔

شاہی خان نے تھوڑے ہی عرصہ میں عدل و انصاف کا وہ سکہ بٹھایا کہ ہندو جو ہمیشہ مضطرب الحال رہتے تھے امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ بادشاہ نے بھی محسوس کیا کہ اب میرے ملک میں کوئی بے چینی اور بدمزگی نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے شاہی خان کو اپنا نائب السلطنت بلکہ ولی عہد بنا کر خود مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس وقت اس کی سلطنت کو قریباً چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

علی شاہ بادشاہ کشمیر کی روانگی

زونراج نے زینہ ترنگنی میں بادشاہ کی حج کو روانگی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ کو اپنے منجھلے بھائی (شاہی خان) سے بڑی محبت تھی۔ جب بادشاہ نے یاترا کا ارادہ کیا تو بھائی کو جس نے اُسے اپنی زندگی میں ہی ولی عہد (۱) قرار دے لیا تھا، بُلایا اور کہا۔ جس طرح اپنے بزرگوں کے نام پر نذر و نیاز نہ دینے سے ہمارے دلوں کی تیرگی دور نہیں ہوسکتی اور نہ ان میں پاکیزگی پیدا ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ہمارا جسم مقدس مقامات کی یاترا کے لئے اگر کچھ تکلیف نہ اٹھائے تو پاک نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہم میں روحانیت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں نے بادشاہی کا بوجھ تمہارے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔ اور خود یاترا کا عزم مصمم کرلیا ہے۔ شاہی خان نے بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا اگر آپ جیسے بہادر نوجوان اور جنگجو بادشاہ اپنی مورثی بادشاہت سے اس طرح کنارہ کشی کر جائینگے تو عام لوگ اور گرد و نواح کے والیان یہی سمجھیں گے کہ آپ میں حکومت کرنے کی اہلیت و قابلیت موجود نہیں ہے۔ اگر آپ کو زیارت حرمین (۲) کی خواہش ہے تو یہ خدمت ہم خادموں کے سپرد کیجیئے۔ یعنی اپنا قائم مقام بنا کر ہمیں روانہ کیجیئے۔ آپ چونکہ بادشاہ ہیں۔ اس لئے آپ کی طویل غیر حاضری ملکی مصلحت کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔

ولی عہد کے یہ الفاظ سن کر بادشاہ نے کسی قدر متبسم ہو کر فرمایا۔ تم میرے دست و بازو ہو۔ اگر چہ میرے جسم کے ساتھ جڑے ہوئے نہیں ہو۔ تم جیسا بھاءی اور ولی عہد جو میرے ساتھ ایک جان دو قالب ہے۔ اور جس کی بہادری اور قابلیت

مسلمہ ہے۔ موجود ہو تو لوگ میری نا اہلیت کا کس طرح گمان کر سکتے ہیں۔ اگر تم میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرو گے تو اس سے مجھے نا قابل برداشت روحانی صدمہ پہنچے گا۔

اب شاہی خان کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بادشاہ نے روانگی کی تیاریں شروع کیں۔ اور شاہی خاں کو دعا دی کہ اس کے نام کی حکومت تادیر قائم رہے۔ شاہزادہ شاہی خان نے بادشاہ کو خزانہ سے قیمتی جواہرات اور بے شمار مال و دولت اور شاہی اصطبل سے خوبصورت گھوڑے پیش کئے۔ بادشاہ سب سے چھوٹے بھائی محمد خان کو شاہی خان کی فرمانبرداری کے احکام دے کر جاہ وجلال اور دھوم دھام کے ساتھ کشمیر سے باہر نکلا۔ شاہی خان دو دن تک بادشاہ کا ہمرکاب رہا۔ اور تیسرے دن دارالحکومت میں واپس آیا۔

بادشاہ کے ہمراہ بہت سے لوگ تھے۔ جو اس دور دراز سفر کی تکالیف سے بچنا چاہتے تھے۔ لیکن شاہی خاں اور بادشاہ کے خوف سے حرف شکایت زبان پر نہ لا سکتے تھے۔ درحقیقت جیسا کہ زونراج نے لکھا ہے۔ بادشاہ کا ارادہ واپسی کا نہ تھا۔ اس کا یہی منشا تھا کہ اس کی جگہ اب اس کا بھائی حکمرانی کرے اور خود وہ مقامات مقدسہ مین ہی اپنی بقیہ زندگی گزار دے۔

لیکن جب شاہی خاں واپس چلا آیا تو اس کے ہمراہیوں نے جو اپنے وطن ،بال بچوں کی جدائی سے ہراساں تھے۔ بادشاہ کو یہ ذہن نشان کرانا شروع کیا کہ بادشاہ کے لئے رعایا پروری کے مقابلے سیاحت ایک غیر ضروری چیز ہے۔ سب سے بڑا حج یہی ہے کہ خدا کی مخلوق کے ساتھ انصاف وعدل سے حکومت کی جائے۔ آپ کو خدا نے اپنی مخلوق کی خدمت کا جو نادر موقع دیا ہے۔ اس سے اپ کیوں فائدہ نہیں

اٹھاتے۔ان خیالات کا رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل پر اثر ہونا شروع ہوا۔

راجہ مدر دیش اور علی شاہ بادشاہ کشمیر

مدر دیش (۳) کے راجہ کی بیٹی علی شاہ بادشاہ کشمیر کی بیگم تھی۔زونراج نے راجہ کو مغرور، متکبر اور طاقتور راجہ لکھا ہے۔جب بادشاہ کشمیر سے روانہ ہو کر مدر دیش کی حدود میں داخل ہوا اور راجہ مدر دیش کو بادشاہ کے اس ارادہ کا پتہ چلا کہ وہ حکومت ترک کر کے یاترا کو جا رہا ہے تو اس نے اس کو اس ارادے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی۔اس لئے کہ بادشاہ کے ہمراہ اس کی بیگم بھی تھی۔ جو راجہ کی بیٹی تھی۔اور اس طریق سے اس کی بیٹی ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو رہی تھی۔نیز یہ طعن بھی اس کے لئے سوہان روح کا باعث ہو رہا تھا کہ اس کا داماد تارک السلطنت ہو رہا ہے جو مردانگی اور شجاعت کے خلاف ہے۔

راجہ نے بادشاہ کو ہر قسم کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ جہاں اور کچھ سمجھایا ہوگا۔ بھیشم پتامہ کے الفاظ بھی گوش گذار کئے ہونگے کہ اگر حکمران عادل ہو تو اس کو رکھشیروں اور پنڈتوں کے برابر نیکیوں کا پھل ملتا ہے۔اسی لئے برہمنوں اور کھشتریوں کا قول ہے کہ راجہ کو سلطنت کسی حال میں بھی ترک نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ جو پھل اس کو جنگل میں ہزار سال عبادت کرنے سے مل سکتا ہے۔وہ سلطنت میں ایک روز عدل کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

غرض کچھ ہمراہیوں کے زور دینے سے اور کچھ راجہ مدر دیش کے سمجھانے

سے بادشاہ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن یہ خوف لحظہ بہ لحظہ غالب آرہا تھا کہ ملک بھائی کے قبضہ میں ہے۔ فوج، سپاہ، خزانہ سب اس کے پاس ہے۔ میں تنہا بازگشت بھی کروں گا تو کون سا پہاڑ ڈھالوں گا۔

راجہ مدردیش بادشاہ کے تفکرات سے لاعلم نہ تھا۔ بادشاہ اس کا داماد تھا۔ ملکہ کشمیر یعنی بادشاہ کی بیگم اس کی پیاری بیٹی تھی۔ اور اس کے مشورہ سے بادشہ نے اپنا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔ اس لئے راجہ نے اس کو خزانہ اور فوج دونوں سے مدد دی۔ بلکہ جب خزاں کا موسم آیا تو علی شاہ کی امداد واعانت کے لئے خود اس کے ساتھ روانہ ہوا۔

راجہ مدردیش کے مشورہ سے علی شاہ کی مراجعت کشمیر

شاہی خاں کو جب بادشاہ کی واپسی کی خبر ملی تو بہت خوش ہوا۔ اس لئے کہ اس کی پہلے ہی یہ تمنا اور خواہش تھی۔ کہ بادشاہ کو ملکی مصلحتوں کے لحاظ سے اس قدر دور دراز سفر اختیار نہ کرنا چاہئے۔ لیکن جب اس نے یہ سنا کہ بادشاہ کا خسر ایک عظیم فوج لے کر اس کے ہمراہ اس لئے آرہا ہے کہ وہ مجھ سے لڑائی کر کے اس کو کشمیر واپس دلائے۔ تو اسے بہت صدمہ پہنچا۔ زونراج اس موقعہ پر لکھتا ہے۔ اس نیک دل شہزادے نے کسی پر اپنے رنج کا اظہار نہ کیا۔ اپنے بھائی کی محبت کے تقاضے سے اور اس خیال سے کہ ہزارہا لوگوں کا بے گناہ خون بہہ جائے گا۔ اس نے اپنے بھائی کی عطا کردہ سلطنت کو خیر باد کہا اور خاموشی کے ساتھ کشمیر سے باہر چلا گیا۔

صاحب طبقات اکبری اس موقعہ پر لکھتے ہیں۔شاہی خاں از کشمیر بہ سیالکوٹ رفت۔ چونکہ اس کے نیک کاموں کی وجہ سے عوام اس کے گرویدہ تھے۔اس لئے ملک کے کئی بڑے بڑے جاگیردار بھی اس جلاوطنی مین اس کے ہمرکاب ہوگئے۔

شاہی خان کے چلے جانے کے بعد مدردیش کے راجہ کی فوج اس طرح امن وامان اور اطمینان کے ساتھ کشمیر میں داخل ہوئی جس طرح دریا میں مگرمچھ کے چلے جانے کے بعد نہانے والا بے فکر اور نڈر ہو کر غوطے لگاتا ہے۔

اپنے خسر و راجہ مدردیش کی مدد سے علی شاہ پھر تخت کشمیر (۴) پر بیٹھتا ہے۔گو اس نے ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔اور اس کا بھائی اب جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔لیکن علی شاہ اپنے ظالم اور خودغرض مشیروں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہ کرسکا۔زونراج لکھتا ہے۔جس طرح بندر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر اچھل کر سایہ دار درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں کو خراب کر دیتے ہیں۔اسی طرح بادشاہ کے ترشکوں (۵) نے اس کی سلطنت اور رعایا کو تباہ کر دیا۔

بلکہ ایک یاون (۶) میر کمسار کے متعلق تو وہ لکھتا ہے کہ اس ظالم نے بادشاہ کی منشا اور رضامندی کے خلاف ملک میں ایک آفت مچا دی۔جس طرح شہد کی مکھیاں رس نکال کر کنول کے پھولوں کو ناکارہ بنا دیتی ہیں۔اسی طرح اس وحشی نے کئی شہر باش عورتوں کی عصمتوں کے شیشوں کو چکنا چور کر کے بے آبرو اور ذلیل کر دیا۔

زونراج لکھتا ہے۔ان ایام میں کشمیر صحیح معنوں میں راکششوں کے قبضہ میں آ گیا تھا۔نیک دل وزراء امراء ان خرابیوں کا انسداد نہ کر سکے۔بلکہ رات کے مظالم کے علاوہ جو خرابیاں روز روشن میں ہوا کرتی تھیں ان کے دفعیہ سے بھی بادشاہی

اہلکار عاجز آ گئے۔فلک پایٔگاہ مکانات، رشک ارم باغات، اعلیٰ نسل کے گھوڑے، بیش قیمت جواہرات۔سب پر یاونوں نے قبضہ کرلیا۔ان مظالم کی وجہ سے بدقسمت بادشاہ جو یاترا کا ارادہ ترک کر کے دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم نظر آ رہا تھا۔دوسری مرتبہ پانچ چھ ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔

بھائیوں کی خونریز جنگ

شاہی خاں اپنے ساتھیوں سمیت کشمیر سے نکل کر پنجاب میں جہاں گکھڑوں کا عروج واقتدار شاہانہ لوازمات کا مقابلہ کر رہا تھا۔پناہ گزین تھا۔اور خاموشی کے ساتھ آئندہ واقعات کا منتظر تھا۔اسی اثناء میں اس کے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر کو اس کے مشیروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ولی عہد کا کشمیر سے باہر رہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔وہ آپ کے دشمن جسرت گکھڑ کے پاس مقیم ہے۔وہاں رات دن آپ کے کلاف سازشیں ہوتی ہیں اور وہ وقت دور نہیں کہ جب ولی عہد گکھڑوں کی مدد لے کر کشمیر پر حملہ آور ہو۔اس لئے ان سازشوں کا اور ولی عہد کے ارادوں کا ابھی سے تدارک کرنا لازم ہے۔بادشاہ نے صلاح کاروں کے مشورے سے شاہی خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ کشمیر واپس آ جائے۔اس کی جان و مال ہر طرح محفوظ ہے۔بلکہ لکھا کہ اس کی مزید عزت افزائی کی جائے گی۔

زونراج اس کے بعد خاموش ہے۔اور نہیں بتاتا کہ شاہی خاں نے علی شاہ کو کیا جواب دیا۔وہ صرف اتنا لکھتا ہے کہ آخر کار علی شاہ بادشاہ کشمیر جسرت گکھڑ پر

چڑھائی کرنے کے لئے پنجاب کی طرف روانہ ہوگیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاں نے مراجعت کشمیر سے اور بادشاہ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کردیا ہوگا۔ بادشاہ کو بڑی توقع تھی کہ وہ جسرت گکھڑ کو جو پنجاب کا مستقل بادشاہ نہیں ہے اور نہ کسی اور بادشاہ نے اس کی بادشاہت کو تسلیم کیا ہے۔بہت جلد مفتوح و مغلوب کر لیگا۔لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کے نالائق اور ظالم اہلکاروں کے ستائے ہوئے مظلوم لوگوں کی آہیں باب قبولیت کو پہنچ چکی ہیں۔اور تقدیر اس کی تمام تدبیروں کا ناکامیوں کے ساتھ خاتمہ کرنے والی ہے۔

فوج کے افسروں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ فوج ولی عہد سے لڑنا نہیں چاہتی۔اس لئے ہمیں پیش قدمی نہیں کرنی چاہئے۔بلکہ جب ولی عہد گکھڑوں کی فوج لے کر حملہ کرے تو ہمیں مدافعانہ پہلو اختیار کرنا چاہئے۔لیکن بادشاہ نے کسی کی نہ سنی۔دارالحکومت سے نکل کر ابھی وہ دور نہ گیا تھا کہ قسمت نے پلٹا کھایا۔یعنی اس کے کئی افسر اس سے علیحدہ ہو گئے اور فوج کے کثیر حصہ نے خودسری اختیار کر لی۔

یہ حالت دیکھ کر بادشاہ کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔اس نے اسی اضطراری حالت میں راجوری اور دوسرے ممالک کو جو اس کے زیرنگیں تھے تہ و بالا کر ڈالا۔ایسی اضطراب افزا حالت میں اس کو اپنے خیر خواہ بھی دشمن نظر آرہے تھے۔

بادشاہ مدگردیال (۷) کے مقام پر مقیم تھا کہ مدردیش کے راجہ نے جو طاقتور راجاؤں میں تھا اپنے خاص قاصد کے ہاتھ اسے ذیل کا پیغام بھیجا۔

ہر چند کہ آپ کی فوج میں پیادہ اور مسلح سپاہی تیز رفتار گھوڑے، ماہر جنگ اور بہادر نوجوان موجود ہیں۔لیکن ان کے مقابلے میں گکھڑ قوم ہے۔جس کے جنگی کمالات مشہور عالم ہیں۔اور جس کی شجاعت و بہادری سے ہم اکثر لڑائیوں میں

واقف ہو چکے ہیں۔اور چونکہ سانپ ہی سانپوں کے داؤ پیچ جان سکتے ہیں۔اس لئے جب تک ہماری فوج آپ کے پاس مدد کے لئے نہ پہنچے، پہاڑ پر ہی مقیم رہیں۔

زونراج اس موقعہ پر پھر یاونوں پر برستا ہے۔اور غم و غصہ کے ساتھ لکھتا ہے۔یاونوں کے بدذات سردار نے تکبر اور حسد سے اندھا ہوکر بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ راجہ مدردیش نے یہ پیغام اس لئے بھیجا ہے کہ اس لڑائی میں جو شہرت و عظمت اور فتح و نصرت آپ کو ملنے والی ہے، اس کا سہرا اس کے سر رہے۔ہم اپنی ہی فوج سے دشمنوں کا قلع و قمع کر سکتے ہیں۔اس کے انتظار کی کیا ضرورت ہے۔

زونراج لکھتا ہے کہ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول کر کے گویا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔وہ پہاڑی سے نیچے نہیں اترا بلکہ اس نے اپنی سر بفلک عزت کو پہاڑی سے اُتر کر خاک مین ملا دیا۔اس کے جھنڈے بظاہر ہوا میں لہرا رہے تھے۔مگر درحقیقت وہ لہراتے نہیں تھے۔بلکہ گکھڑوں کی فوج کے ڈر سے کانپ رہے تھے۔

ادھر بادشاہ کی فوج پہاری سے اُتری اور ادھر گکھڑوں کی فوج جو پہلے ہی جاں بکف ہوکر مرنے مارنے پر تیار تھی۔سامنے آگئی۔دونوں فوجیں آمنے سامنے کیا ہوئیں، گرد و غبار نے زمین و آسمان کو ایک کر دیا۔دوست دشمن کی کسی کو پہچان نہ رہی۔گھوڑوں کے سموں نے زمین کو چھلنی کر دیا۔اس زمین میں جہاں صاف وشفاف چشمے بہتے تھے،خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ترکش ختم ہو گئے تو تلواروں پر نوبت آئی۔کشتوں کے پشتے لگ گئے۔بہادر سپاہیوں نے داد شجاعت دیتے ہوئے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔

بادشاہ کشمیر کی شکست اور نظر بندی

طرفین جی توڑ کر لڑے اور خوب لڑے۔ اور بقول صاحب طبقات اکبری ''جنگے عظیم داد واز طرفین خلائق بسیار بہ قتل رسیدند''۔ مگر بادشاہ کا اقبال چونکہ زوال پذیر ہو چکا تھا۔ اور تقدیر شاہی خاں کے سر پر چتر شاہی کا سایہ کر رہی تھی۔ اس لئے اس کی فوج کا ایک حصہ خود سر ہو گیا۔ اس کے بعض افسر اندرونی طور پر ولی عہد کے طرف دار بن گئے اور بادشاہ کو شکست ہو گئی۔

زونراج نے یہ نہیں بتایا کہ شکست کے بعد بادشاہ کا کیا حشر ہوا۔ البتہ مورخین کشمیر بالاتفاق ہو کر لکھتے ہیں کہ علی شاہ گرفتار ہو کر پھکلی (۸) میں نظر بند کیا گیا۔ اور اس نظر بندی کی حالت میں وہ انتقال کر گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے علی شاہ اپنی موت نہیں مرا۔ بلکہ اس کو قتل کیا گیا۔ جیسا کہ زونراج کا شاگرد شریور مصنف زینہ راج ترنگنی (۹) لکھتا ہے کہ علی شاہ گرفتار ہو گیا اور ملک کے بیٹے نے اس کو قتل کر دیا۔ ملک سے مراد معلوم نہیں کس ملک سے ہے۔

حواشی:

(۱) زونراج نے اور نہ کسی اور مصنف نے علی شاہ کی اولاد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی شاہ لاولد تھا یا کم از کم اولاد نرینہ سے محروم تھا۔

(۲) صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ علی شاہ کا ارادہ ملکوں کی سیر و سیاحت کا تھا، حج کا نہ تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ ''بعد ازاں شاہی خاں را ولی عہد ساختہ محمد خاں برادر خورد را بہ اطاعت او وصیت نمودہ بہ ارادہ سیر از کشمیر برآمدہ''۔ لیکن زونراج چونکہ عہد بڈشاہی کا مصنف ہے اور اس نے علی شاہ کے متعلق مقدس مقامات کی یاترا کا لفظ لکھا ہے۔ اس لئے اس بارہ میں اس کی تحریر زیادہ قابل اعتماد ہے۔

(۳) دیکھو کتاب ھذا کا ضمیمہ ۳ بعنوان مدر دیش۔

(۴) صاحب طبقات اکبری (۴۳۴ صفحہ پر) راجہ جموں اور راجہ راجوری کی امداد سے علی شاہ کے تخت پر بیٹھنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''دریں ولا بعضے از ارباب غرض اُو را از ولی عہد ساختن شاہی خان پشیمان ساختند۔ راجہ جموں و راجہ راجوری بہ مدد علی شاہ رفتہ کشمیر را بار دیگر از تصرف اُو آوردنوند۔

(۵) ترشک اور ترشکون کے لئے دیکھو ضمیمہ ۴۔

(۶) یاون کس زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ دیر تک اس کے متعلق واقفیت نہ ہو سکی۔ البتہ میر کمسار کا پہلا لفظ میر یہ ظاہر کرتا تھا کہ یاون مسلمانوں ہی کا کوئی فرقہ ہوگا۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں اتفاقاً سوانعمری کلاں سوامی دیانند مصنفہ پنڈت لیکھرام پر نظر پڑی۔ تو اس میں ایک جگہ سوامی دیانند اور ٹھاکر صاحب والئے ریاست رائے پور کا ایک مختصر سا مکالمہ اُس موقع پر دیکھا۔ جب ٹھاکر صاحب اپنے قائم مقام مدارالمہام شیخ کریم بخش کے ہمراہ سوامی جی کو ملنے

گئے۔سوامی جی نے مزاج پرسی کے بعد پوچھا۔آپ کے ہاں راج منتری کون ہیں۔ٹھاکر صاحب نے کہا شیخ الٰہی بخش ہیں۔لیکن وہ جودھ پور گئے ہیں۔اوران کی جگہ کریم بخش جی کام کرتے ہیں۔جو میرے ہمراہ ہیں۔اس پر سوامی جی نے کہا کہ آریہ برہمنوں کو اُچت ہے کہ یاونوں (مسلمانوں) کواپنا راج منتری نہ بنائیں۔ایسا کہنے سے کریم بخش اور پانچ ساتھ مسلمان جو وہاں موجود تھے غصہ میں آکر گڑگڑانے لگے۔اورٹھاکر صاحب بھی سوامی جی سے آ گیا لے کر اپنے راج محلوں کے چلے گئے''۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یاون سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔اور یہ لفظ مسلمانوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

(۷) مدگردیال کا تلفظ مترجم زونراج ترنگنی نے Mudgarauyal لکھا ہے۔اس نام کا کوئی گاؤں اب کشمیر میں نہیں ہے۔اور نہ جموں کی تحصیل راجوری میں اس کا کہیں وجود ہے۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضع راجوری یا شوپیان کے علاقہ میں کہیں ہوگا۔کیونکہ بادشاہ غصہ کی حالت میں جب راجوری کو تباہ کرتا ہے تو یقیناً وہ انہی اطراف میں ہوگا اور مدگردیال بھی اسی طرف کسی بلندی پر واقع ہوگا جہاں بادشاہ مقیم تھا۔

(۸) سرکار پکھلی میں تین ولایتیں ہیں۔بنیر،سوات اور باجور۔میر سید علی ہمدانیؒ کشمیر سے واپس اپنے وطن جاتے ہوئے اس علاقہ میں وفات پا گئے تھے۔اوراپنی وصیت کے مطابق ختلان میں دفن ہوئے تھے۔یہ تینوں ولائتیں جن کا نام سرکار پکھلی تھا،سلاطین کشمیر کے ماتحت تھیں۔(از سیر المتاخرین جلد اول درذکر پکھلی) لیکن آج کل سوات ایک علیٰحدہ ریاست ہے۔اور بنیر اور باجور سرحدی علاقے ہیں جن کی حدود سوات سے ملتی ہیں۔

(۹) از ترجمہ زینہ راج ترنگنی بنام کنگس آف کشمیر صفحہ ۱۳۰ فصل سوم۔

چوتھا باب

شاہی خاں عرف بڈشاہ بادشاہ کی تخت نشینی

حصول سلطنت کے لئے باپ بیٹے اور بھائی میں جنگ

جب جہانگیر کی تخت نشینی پر اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کی اور وہ آگرہ سے بھاگ کر لاہور کی طرف اپنی جمعیت بنانے اور باپ کا مقابلہ کرنے کے لئے بھاگ آیا۔ اور بادشاہ نے اس کے تعاقب میں اپنے معتمد افسر بھیجے۔ تو افسروں نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ اگر وہ بغیر لڑائی کے قابو نہ آئے تو کیا ارشاد ہے۔ بادشاہ نے کہا معاملات سلطنت میں کوئی خویشاوندی نہیں ہے۔ نرمی سے گرمی سے جس طرح وہ رام ہو سکے۔ اسے قابو کرو۔ اور اگر دوران جنگ میں اس کی جان بھی چلی جائے تو کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ بلکہ وپ اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

معاملات سلطنت تو بڑی بات ہیں۔ معمولی باتوں پر حقیقی بھائیوں اور باپ بیٹوں تک میں خون خرابے ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض امور میں کوئی نہ کوئی حکمت الٰہی بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً اگر خسرو تخت پر بیٹھ جاتا تو اپنی عادت، اپنے اخلاق اور اپنی اور اپنے ہم جلیسوں کی نالائقیوں کی وجہ سے حکومت کے قطعی نا قابل تھا۔ ملک میں وہ خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کا بازار گرم ہو جاتا۔ اور رعیت وراعی دونوں تباہ ہو جاتے۔

داراشکوہ اور اس کے بھائیوں کے قتل اور شاہجہاں کی قید کے واقعات واقعی بڑے دردناک ہیں اور اس لحاظ سے اورنگ زیب کی تصویر نہایت ہیبت ناک اور خونریز نظر آتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے۔

شربت سلطنت و جاہ چناں شیرین است
کہ شہاں ازپئے آں خون برادر ریزند

لیکن کون نہیں جانتا کہ داراشکوہ باوجود شاہجہاں کی ہر قسم کی امداد کے کسی لڑائی میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ ایک صوفی مزاج اور ضدی شاہزادہ تھا۔ اور سلطنت کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی اخلاقی حیثیت سے تمام عیوب کے ملجٰی و ماویٰ تھے۔ اورنگ زیب گو سب سے چھوٹا تھا۔ لیکن نواب سعد اللہ خان وزیر شاہجہاں نے اورنگ زیب کی شہزادگی کے عالم میں کہہ دیا تھا۔ کہ اورنگ زیب ہی زیب اورنگ ہوتا نظر آتا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ اس فرزانہ وزیر کی پیشنگوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔

یہی حال شاہی خان اور علی شاہ کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے۔ علی شاہ سے

تمام رعایا ناراض تھی۔شاہی خان نے وزیر ہو کر تمام رعایا کی دلجوئی کی۔جب علی شاہ سیر و سیاحت کو روانہ ہوا اور ارباب غرض نے اسے بھائی کی طرف سے بدگمان کر کے بھائی کے ساتھ جنگ کرنے کو بھیجا تو شاہی خاں نے اس بدگمانی کو اپنی ذلت و تحقیر کا باعث سمجھا۔مگر پھر بھی جنگ کو نامناسب سمجھ کر چپ چاپ کشمیر سے باہر چلا گیا۔لیکن اس کے بعد جب علی شاہ نے خود بخود اس پر حملہ کر دیا تو آخر جنگ چھڑ گئی۔ظاہر بین نگاہوں مین شاہی خاں کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔لیکن کس کو خبر تھی کہ قدرت اس بدگمانی و سرکشی اور بڑے بھائی کی شکست و نظر بندی چھوٹے بھائی کی تخت نشینی و بادشاہی کے پردے میں کشمیر کے انتہائی عروج کے اسباب پیدا کر رہی ہے۔

شاہ رخ سے شاہی خاں اور شاہی خاں سے زین العابدین

قدرت نے جس کو بطن مادری سے باہر آتے ہی شاہ رخ بنا دیا تھا۔عوام نے اس کو شاہی خاں کا خطاب دیا تھا۔اور جب سید حسین خوارزمیؒ جیسے عابد و مرتاض بزرگ کی قبولیت دعا کا وقت آیا۔تو شاہی خاں کا نام زین العابدین رکھا گیا۔جو واقعی اپنے تزکیہ نفس اور اپنی ریاضت و عبادت سے زین العابدین اور اپنی طویل حکومت و رعایا پروری اور ہر دلعزیزی سے بڈشاہ یعنی بادشاہ اعظم ثابت ہوا۔

بادشاہ کی تخت نشینی کا سال

بادشاہ نے تخت نشین ہونے کی خوشی میں عظیم پیمانہ پر ایک جشن کیا۔ شان و شوکت سے جلوس بھی نکالا ہوگا۔ شاعروں نے جلوس و جشن اور تخت نشینی پر قصیدے بھی لکھے ہونگے۔ جو مقدر میں تھا، وہ انعام بھی لیا ہوگا۔ لیکن سال تخت نشینی کشمیری مورخوں نے ۸۲۶ھ لکھا ہے۔ اور سایہ الطاف خدائے واہب سے تاریخ نکالی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ بڈشاہی عہد کا مورخ شریور اس کی تخت نشینی کا سال ۴۴۹۶ لوکک اور مہینہ جیٹھ بدی لکھتا ہے۔ اس لوکک سال کے مطابق عیسوی ۱۴۲۰ء اور ہجری ۸۲۳ھ ہوتا ہے اور عیسوی مہینہ کے مطابق یکم جون سے ۱۵ جون اور ہجری مہینے کے مطابق ۱۵ جمادی الاول سے اخیر جمادی الاول کی تاریخیں نکلتی ہیں۔

شریور کے بعد صاحب تاریخ فرشتہ اور صاحب سیر المتاخرین علی شاہ کی گرفتاری اور موت کا واقعہ جمادی الاول ۸۲۳ھ میں لکھتے ہیں۔ اور صاف ظاہر ہے کہ علی شاہ کے بعد بڈشاہ ۸۲۳ھ میں تخت پر بیٹھا اور ۸۲۳ھ مطابق ہے ۴۴۹۶ لوکک کے۔ گویا شریور اور اس کے بعد فرشتہ وغیرہ نے سال تخت نشینی جو ۸۲۳ھ لکھا ہے وہی درست ہے۔ کشمیری مورخوں نے معلوم نہیں ۸۲۶ھ کس طرح لکھ دیا ہے۔ بہر حال ۸۲۳ھ میں بادشاہ نے تخت کو قدموں کے نیچے اور تاج کو جو اس کا خاندانی اور پشتینی کلا تھا، سر پر رکھا۔ اس موقعہ پر زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ملک کے ہر گوشہ میں اپنی فتح اور تخت نشینی کا ڈھنڈورا پٹوایا۔ اور لوگوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے قبل ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔

بڑے بڑے عہدوں کی تقسیم

بادشاہ نے اپنے برے بھائی علی شاہ کو جس کا وہ نائب السلطنت تھا، پکھلی میں نظر بند کر رکھا تھا۔ چھوٹا بھائی محمد خاں موجود تھا۔ اس کو نائب السلطنت یعنی وزارت عظمیٰ کا عہدہ تفویض کیا۔ ہلمت رینہ اور احمد رینہ کو منصب سپہ سالاری عطا کیا۔ ملک مسعود ٹھاکر کو اپنے بھائی کے ماتحت مدارالمہامی کا عہدہ عنایت کیا۔ محکمہ عدالت انصاف کا اعلےٰ عہدہ پنڈت شری بٹ کو دیا۔ قاضی جمال الدین کو عہدہ قضا مرحمت کیا۔ زونراج محمد خاں کو ''شریعت محمد خاں'' لکھتا ہے۔ اور اس کو بادشاہ کا ممدو مشیر کار بتاتا ہے۔

تخت نشینی پر قیدیوں کی رہائی

تخت نشینی پر بادشاہ کے کسی خاص اعلان کا پتہ نہیں ملتا۔ لیکن تخت کے بعد اس نے اپنی قابل تقلید رعایا پروری سے جو لازوال شہرت حاصل کی وہ ظاہر کر رہی ہے کہ بادشاہ کی نظروں میں سب مذاہب کی یکساں عزت تھی۔ اس کا طرز عمل ہی اس کے گفتار و کردار کا مظہر ہے۔ اس نے تخت نشین ہو کر نہ صرف اپنے بھائی کے زمانے کے بلکہ سلاطین سابق کے عہد کے بھی تمام قیدی رہا کر کے زندان خانے بالکل سنسان کر دیئے۔

ہندوؤں کی دلجوئی

زین العابدین کی تخت نشینی سے پیشتر ہی اس کے باپ اور بھائی کے زمانے میں کشمیر کے کئی ہندو بعض جدید قوانین کی سختیوں کی تاب نہ لا کر یا تو اسلام قبول کر چکے تھے۔ یا ترک وطن کر کے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ جب زینالعابدین خود تخت پر بیٹھا اور ملک سرکشوں اور باغیوں اور دودھ بھائیوں کے فتنہ وفساد سے پاک ہو گیا۔ تو اس نے رعایا کی آبادی اور سرسبزی کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے اس نے ہندوؤں کی دلجوئی کی۔ جو کشمیر میں خال خال نظر آتے تھے۔ اس نے لا اکراہ فی الدین کی تفسیر وتشریح کے لئے بڑے بڑے علماء سے گفتگو کی۔ اور بتایا کہ میرے باپ اور بھائی کے زمانے میں لا اکراہ فی الدین کے خلاف عمل ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے غیر اقوام اور غیر ممالک میں اسلام کو ایک خوفناک مجسمہ بنا کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ اسلام ایک خوش نما قابل عمل اور آسانیاں پیدا کرنے والا مذہب ہے۔ جو فطرت کے عین مطابق ہے۔

چنانچہ زین العابدین نے باپ اور بھائی کے عہد کے تمام کے تمام قوانین و آئین جو غیر قوم کے لئے تکلیف و پریشانی کا باعث تھے۔ بتدریج موقوف کر دیئے۔ جو لوگ ترک وطن کر چکے تھے، ان کو واپس بلوایا۔ ان کو بہت سی مراعات دیں اور ان کو اپنا بندۂ بے دام بنا لیا۔ ان تمام مراعات و احسانات کا ذکر علیٰحدہ ایک باب میں کیا جائے گا۔

بادشاہ کے جشن ہائے سالگرہ

بادشاہ اپنی سالگرہ ہر سال مناتا۔اس تقریب پر جشن مسرت بڑی دھوم دھام سے ہوتا۔ مستحق غرباء اور نادار لوگ خیرات وسدقات کی مدد سے اپنا پیٹ پالتے اور امراء و وزراء انعام و اکرام حاصل کرتے۔رات کو دریائے بہت (جہلم) کے کناروں پر اس آب وتاب سے جشن چراغاں ہوتا کہ تمام شہر بقعہ نور بن جاتا۔جن لوگوں کو کشمیر کے موجودہ فرمانرواؤں کے دریائی جلوس اور جشن چراغاں دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔وہ اس گنگا جمنی منظر اور بوقلموں کیفیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

پانچواں باب

اہل کشمیر کی جنگی سپرٹ اور بادشاہ کے فوجی کارنامے

مصری اور یونانی جغرافیہ دانوں اور مورخوں کی تحریریں ممالک کشمیر کی وسعت کے متعلق

بادشاہوں اور راجوں کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ان کی وسیع فتوحات ہوا کرتے ہیں۔ کشمیر کے راجگان قدیم میں اکثر راجے کشمیر ہی پر قناعت نہیں کرتے تھے۔ اور کشمیر اور اس کے مقبوضات کو غیروں سے صرف بچاتے ہی نہیں تھے بلکہ بنگال، لنکا افغانستان، تبت اور لداخ تک مار کرتے اور کامیاب ہو کر واپس آتے تھے۔ تمام دنیا کو زیر نگین کرنے کی خواہش گزشتہ بادشاہوں میں بھی تھی۔ شارلی مین کیوں جنگ آزمائیوں میں مصروف رہا۔ چارلس پنجم اور لوئی چہاردہم کیوں ہاتھ

پاؤں مارتے رہے۔نپولین کا مقصد کیا تھا۔اور جرمنی کے آخری شہنشاہ قیسر ولیم نے آخر کس بات کے لئے لاکھوں جانیں قربان کر دیں۔اور اب جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر اور اس کے ساتھی جاپان اور اٹلی نے ساری دنیا کو لڑائی کی جس آگ میں دھکیل رکھا ہے۔اپنی ناکامیوں کے باوجود کیا اس سے عالمگیر حکومت کا خیال اس کے پیش نظر نہیں ہے۔

تسخیر عالم کا یہ جذبہ ہندوستان اور مشرق کے بڑے بڑے بادشاہوں مثلاً اشوک، سمندر گپت، ہرش، علاء الدین خلجی، تیمور، اکبر اور اورنگ زیب وغیرہ کی طرح کشمیر کے راجوں اور بادشاہوں کے سامنے بھی تھا، اور وہ اپنی سلطنت کو ہمیشہ وسعت دیتے رہتے تھے۔تاریخوں کے اوراق میں ان کی فتوحات کا ذکر بکھرا پڑا ہے۔ہم یہاں چند واقعات بعض غیر کشمیری مورخوں کی تاریخوں کے حوالہ سے درج کرتے ہیں۔

تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف کے صفحہ ۱۱ پر لکھا ہے۔اب ہم مصریوں کی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں۔کلاڈیس ٹالمی (تاریخ پیدائش ۷۰ء) مصر کا مشہور جغرافیہ دان اور ماہر علم ہیئت و نجوم اپنے جغرافیہ میں لیوکلہ نام ایک شہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔دریائے اٹک کے مشرق کی طرف کسپیر یا نام ایک ملک موجود ہے۔جو دریائے بداستن (ا) (جہلم)، چندر بھاگا (چناب)، ادریس (ایرادتی یعنی راوی) تک پھیلتا تھا۔اسی علاقہ میں لیوکلہ نام شہر آباد ہے۔ٹالمی نے جس ملک کو کسپیر یا لکھا ہے۔مورخوں نے اس کو کشمیر بتایا ہے۔سٹین بھی جو راج ترنگنی پنڈت کلہن کا نامور مترجم اور شارح ہے۔کشمیر کے جغرافیہ قدیم کا ذکر کرتا ہوا کسپیریوں کے ملک کو کشمیریوں کا ملک

لکھتا ہے۔

لیوکلہ نام شہر کے متعلق جج محمد لطیف اپنی تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں کہ یہ لاہور ہی کا کوئی بگڑا ہوا نام ہے۔ میجر جرنل کننگھم جو ہندوستان کے قدیمی محقق تسلیم کئے گئے ہیں۔ وہ بھی بحث کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ لیوکلہ لاہور کے قدیم کھنڈروں کے قریب ہی کہیں آباد ہوگا۔ (۲)

لیوکلہ کوئی الگ شہر تھا یا لاہور ہی کے مختلف ناموں میں سے ایک نام تھا۔ بہر حال ان سطور سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک کشمیر کی سلطنت اس زمانے میں لاہور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹالمی مصری جغرافیہ دان جس نے کسپیر یا کے ملک میں لیوکلہ کا ذکر کیا ہے۔ دوسری صدی عیسوی کے نصف میں گزرا ہے۔ ان ایام میں کشمیر پر راجہ پرورسین اول بانی شہر سرینگر کی حکومت تھی۔ اس کے متعلق تاریخ کشمیر میں لکھا ہے کہ اس نے پنجاب اور مالوہ اور ہندوستان کا ایک حصہ فتح کرلیا تھا۔ اور معمولی خراج لینے کے بعد اس نے یہ ممالک ان کے اصل وارثوں کو واپس کر دیئے تھے۔

بطلیموس نے بھی کسپیر یا کے ملک سے کشمیر ہی مراد لی ہے۔ بلکہ اس نام سے کشمیر کا صحیح تلفظ بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ مثلاً کشمیر کو کشیر بھی کہتے ہیں۔ کشمیر کا پرانا نام کشویر بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ کشویر کو یونانیوں نے جن میں بطلموس جغرافیہ دان بھی تھا۔ کسپیر لکھ دیا ہے۔ اور شاید وہ اپنی زبان میں کشمیر کے مترادف اس سے بہتر تلفظ کا استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کشیر، کشویر، کشمیر ایک ہی نام ہیں۔ (۳)

دربار چین اور دربار کشمیر کی باہمی سفارتیں

ہیونگ سانگ چینی سیاح (۴) دو سال تک کشمیر میں رہا۔اس کے بعد چین کے حکمران خاندان تنگ کے ذکر میں کشمیر کا نام آتا ہے۔لکھا ہے کہ چین کے دربار شاہی میں کشمیر کا پہلا سفیر راجہ مکتا پیڈ والئے کشمیر کے عہد میں ۷۱۳ء میں آیا تھا۔اور دربار کشمیر کا دوسرا سفیر اس کے نامور جانشین للتا دیتہ کے زمانے میں چین کے دربار میں پہنچا۔اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی سیاسی عظمت اس وقت کس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔جس طرح دربار کشمیر کے سفیر چینی دربار میں حاضر رہتے تھے،اسی طرح خاقان چین کے سفیر کشمیر میں آتے ہوں گے۔کیونکہ باہمی ارتباط اور رسل ورسائل کا سلسلہ سفراہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

راجہ میگواہن اور راجہ پرورسین ثانی کی فتوحات

راجہ میگواہن کشمیر کا مشہور راجہ گزرا ہے۔اس نے جین مذہب قبول کرتے ہی اس کی اشاعت کے لئے ہندوستان پر حملے شروع کر دیئے۔وہ فتوحات کا سیلاب بہاتا ہوا لنکا تک پہنچ گیا۔ابوالفضل آئین اکبری کی جلد دوم میں اس کا ذکر کرتا ہے۔یہ زمانہ ۴۰۰ء یا اس کے قریب کا تھا۔

راجہ پرورسین دوم نے کشمیر سے نکل کر بقول کلہن جزیزہ نمائے گجرات اور

مغربی ساحل ہند کو فتح کیا۔ شیلادت والئے مالوہ کو اس کے دشمنوں نے معزول کر رکھا تھا۔ پرورسین کی ہی مدد واعانت سے اس نے دوبارہ تخت وتاج حاصل کیا۔ پرورسین نے واپس آ کر ترکستان تک یلغار کی۔

راجہ مہر کل کی فتوحات کا سیلاب جنوبی ہند میں

ایلیٹ صاحب کی ہسٹری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ مسیح سے پانچ سال قبل جنوبی ہند کے حکمران کا نام راجہ ہال تھا۔ ایک مرتبہ ایک سوداگر نے اس راجہ کے ملک کا بنا ہوا کپڑا راجہ کشمیر کی رانی کے پاس فروخت کیا۔ رانی نے جب اس کپڑے کو پہنا تو راجہ کو اس پر ایک مہر نظر آئی۔ جس پر راجہ ہال کے پاؤں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ راجہ کشمیر نے سوادگر کو بلایا اور راجہ ہال کا پتہ وغیرہ پوچھا۔ راجہ کشمیر نے قسم کھائی کہ میں اس توہین کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ میں جب تک اس کے پاؤں کاٹ کر نہ لے آؤں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ راجہ کشمیر نے راجہ ہال پر چڑھائی کی اور اس کو شکست دی۔ لیکن اس کے معافی مانگنے پر اس کا ملک اس کو واپس کر دیا۔ مگر قسم کو پورا کرنے کے لئے اس کی مورتے بنوائی۔ اور پھر مورتی کے پاؤں کاٹ کر قسم پوری کی۔

جب ہم ایلیٹ صاحب کی تارخ کے اس واقعہ کو کشمیر کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں تو وہاں ہمیں راجہ مہر کل کے حالات میں اسی قسم کا ایک ملتا جلتا واقعہ نظر آتا ہے۔ چناچہ لکھا ہے کہ ایک دن اس نے اپنی رانی کے زرنگار لباس پر راجہ سنگلدیپ (لنکا) کی تصویر دیکھی۔ جل بھن کر کباب ہو گیا۔ قسم کھائی کہ جب تک راجہ مذکور کو اس گستاخی کی سزا نہ دے لوں گا، دوسرے کام کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ چنانچہ راجہ نے

اسی وقت مخالف کی سرکوبی کے لئے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ اور تمام ہندوستان کو روندتا اور ملک کو زیروزبر کرتا سمندر کے کنارے پر جا پہنچا۔ وہاں مطیع راجگان کی مدد سے جہاز اور کشتیاں بہم پہچا کر لنکا پر دھاوا بول دیا۔ وہ اجل رسیدہ بالکل بے خبر تھا۔ معمولی سے کشت وخون کے بعد قتل ہو گیا۔ مہر کل نے اس کے خاندان میں سے کسی اور کو راجہ بنا کر آئیندہ کپڑوں پر راجہ کی تصویر کی بجائے سورج کا نشان بنائے جانے کا حکم صادر کیا۔

راجہ مہر کل کشمیر میں ایک خونخوار، ظالم اور شجاع راجہ گزرا ہے۔ ایلفنسٹن نے اس کا زمانہ مسیح سے پانچ سو سال قبل بتایا ہے۔ لیکن تاریخ کشمیر میں اس کا زمانہ قریباً سات سو سال قبل مسیح درج ہے۔

غرض راج ترنگنی جو آج سے قریباً آٹھ سو سال قبل کی تاریخ ہے۔ اس قسم کے جرأت آفرین واقعات سے لبریز ہے۔ زیز زمانہ قدیم کے یونانی، مصری اور دیگر غیر ملکی مورخوں نے کشمیر کی سیاسی اہمیت اور اس کی وسعت کے متعلق جو بیانات شائع کئے ہیں۔ ان سے بھی اہل کشمیر کی غیر معمولی شجاعت و بسالت کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن یہ قانون قدرت ہے کہ جس قوم سے اخلاق فاضلہ اور عادلانہ حکومت کے خصائل مٹ جاتے ہیں۔ قدرت اس کی جگہ کوئی اور قوم جو فاتحانہ اخلاق و خصائل کی اہل ہوتی ہے۔ پیدا کر دیتی ہے۔ اور پھر وہی قوم جو حکمران شجاع اور غیور ہوتی ہے۔ محکوم ہو کر رفتہ رفتہ اپنی تمام اعلےٰ عادات سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی حال کشمیر کے ہندوؤں کا ہوا۔ جب ان کے آخری حکمران عیش و عشرت، فسق و فجور اور خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو قدرت نے ان پر ایک اور قوم کو مسلط کر دیا۔ وہ قوم مسلمان تھی۔ اور ان ایام میں شجاع اور غیور ہونے کی وجہ سے حکمرانی کے تمام اوصاف سے

متصف تھی۔ مسلمان گو مذہباً کشمیری ہندوؤں سے مختلف تھے۔ لیکن سادات وقریش وغیرہ چند ایک اقوام کے سوا ان کی اکثریت وطناً اور نسلاً کشمیری ہی تھی۔ اور جو لاگ غیر ممالک سے آئے تھے، وہ بھی کشمیری تمدن و معاشرت اور باہمی رشتہ داریاں اور میل جول اختیار کر کے کشمیر ہی کو اپنا وطن قرار دے چکے تھے۔

راجہ مکتا پیڈ عرف للتادت کی عالمگیر فتوحات

راجہ للتادت کشمیر کے بادشاہوں میں سب سے شاندار نہیں تو پُر شوکت بادشاہوں میں ایک ضرور تھا۔ اس کی وسیع وعظیم فتوحات پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ نہ صرف کشمیر بلکہ ہندوستان کے جلیل القدر بادشاہوں میں شمار ہوسکتا ہے۔ آج سے آٹھ سو سال قبل کے مصنف پنڈت کلہن نے راج ترنگنی میں بڑی تفصیل سے اس کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ راج ترنگنی کا یہ بیان ممکن تھا شاعرانہ اور خیالی نظر آتا۔ لیکن ہمیں اس کی تصدیق چچ نامہ سے بھی ہوتی ہے۔ جو فتوحات سندھ کا ایک شاندار مرقع ہے۔ جو اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک خط سے جو راجہ داہر نے محمد بن قاسم کے نام لکھا ہے۔ یہ بیان پایا جاتا ہے۔ ”اگر میں تمہارے مقابلے کے لئے راجہ کشمیر کو لکھتا ۔جس کے آستانے پر ہندوستان کے تمام راجے اپنا سر جھکاتے ہیں۔ اور جس کے زیر نگین نہ صرف ہندوستان ہے بلکہ مکران وتوران کے علاقے بھی اس کے باجگزار ہیں۔ جس کی غلامی کا جوا بڑے بڑے امیروں اور سرداروں نے از خود پہن رکھا ہے۔ اور جس کے خلاف کسی کو دم مارنے اور سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وغیرہ

وغیرہ۔

للتادت کا سب سے پہلا دشمن ''یاسوورمن'' مہاراجہ قنوج تھا۔ جو اس وقت تمام شمالی ہند کا واحد حکمران تھا۔ جس نے گوڑیا بنگال کے راجہ کو بھی شکست دیدی تھی۔ لیکن جب یاسوورمن کو للتادت کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔ تو اس کی ساری شیخی کرکری ہوگئی۔ اور وہ شکست کھا کر آخر للتادت کا درباری شاعر بن گیا۔ للتادت کی فتوحات کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ کلنگا، کرناتہ، کاویری کا علاقہ، علاقہ کوکن کے سات راجے، دوارکا، سورٹھ، اونیتی اور مالوہ کے راجے ان سب کو اس نے ایک ایک کرکے فتح کیا۔ کرناتہ (کرناٹک) میں اس وقت ایک رانی رانی رتہ یارٹہ کے نام سے مرہٹہ چلوکیا راجاؤں میں سے حکمران تھی۔ اور راجہ وجے دت کی بیوہ تھی۔

للتادت سندھ کی طرف نہیں گیا۔ اور اگر وہ جاتا تو راجہ داہر یقیناً اس کی اطاعت کرتا۔ کیونکہ وہ اس کی برتری کو پہلے ہی تسلیم کرتا تھا۔ جیسا کہ اس خط سے جو سابقہ سطور میں درج ہو چکا ہے ظاہر ہوتا ہے۔ مشرق، جنوب اور مغرب کی فتوحات کے بعد للتادت نے تبت اور ترکستان کا رُخ کیا۔ دردستان اور تبت کو پامال کرنے کے بعد اس نے ترکوں کے بادشاہ مومنی کو تین مرتبہ شکست دی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری واقعہ ہے کہ ہندوستان کا بادشاہ ہندوستان سے باہر جا کر خونخوار جنگجو اور وحشی تورانیوں کے علاقہ پر حملہ آور ہوا۔ ان فتوحات کو صحیح تصور کرنے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ کیونکہ ہمیں چچ نامہ میں نہ صرف ترکوں کے بادشاہ مومنی کا حال ملتا ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے راجہ نے مکران (بلوچستان) اور توران (ترکستان) کو فتح کیا۔ ہندوستان ہمیشہ توران سے آنے والے گروہوں اور

جتھوں سے ہزیمت اٹھاتا اور مغلوب ہوتا رہا ہے۔ لیکن للتادت کی ان بیرونی فتوحات نے جو انقلاب پیدا کیا، ہندوستان کی تاریخ میں اس انقلاب انگیز واقعہ کا ذکر نہایت فخر ومباہات سے ہونا چاہیئے۔

للتادت صرف خاقان چین کو شہنشاہ تسلیم کرتا تھا۔ اور شہنشاہ چین بھی ہندوستان کے تمام راجاؤں میں اسی کو "بادشاہ" سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۷۳۳ء میں شہنشاہ چین نے اپنی ایک سفارت والئے کشمیر کے پاس بھیجی۔ اور اس کے ذریعہ اس کو بادشاہ کا خطاب پیش کیا۔ دونوں ہم عصر بادشاہوں میں باہمی تعلقات اس سفارت کے ذریعہ اور بھی استوار گئے۔

کلہن کے بعد کشمیری مصنفوں کو للتادت کی تخت نشینی اور سال وفات میں کچھ غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ اس کی حکومت ۷۰۰ء سے شروع ہو کر ۷۳۶ء میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جنگجو طبیعت اور اس کی غیر معمولی شجاعت، اس کی عالمگیر فتوحات کے جنون وشوق کا اندازہ صرف اسی امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ شمال کے وحشی قبیلوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ تو اس نے کشمیر میں اپنے وزراء کو پیغام بھیجا کہ میں اب واپس نہیں آسکتا۔ میرے بیٹے کی بادشاہت کا اعلان کردو۔ چنانچہ ایسا ہوا اور وہ اپنے وطن میں واپس نہ آسکا۔ (۵)

محمود غزنوی کے دو ناکام حملے کشمیر پر

پنجاب اور ہندوستان کے اکثر علاقے برسوں تک سلطان محمود کے قدموں

کی جولانگاہ بنے رہے۔اس کی فوج جو بخارا،سمرقند، ماوراءالنہر اور افغان سپاہیوں پر مشتمل تھی۔جب غزنی سے باہر نکلتی تو ہندوستان میں زلزلہ سا آجاتا۔اور اجمیر،قنوج، دہلی، لاہور اور دیگر ممالک کے راجے اپنی فوجیں جمع کر کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے پنجاب و پشاور کی حدود میں جمع ہو جاتے۔لیکن محمود تمام راجگان ہند پر غالب آتا۔اور ملکوں کے ملک فتح کرتا چلا جاتا۔اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔جن میں پندرہ حملوں میں وہ کامیاب اور فتح مند ہوا۔صرف دو حملوں مین اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔اور وہ دونوں حملے کشمیر پر تھے۔

اس کا گیارھیواں حملہ ۴۰۶ھ میں تسخیر کشمیر کے لئے تھا۔اس زمانے میں جس کو مورخین ۱۰۱۵ء سے ۱۰۱۶ء تک کا زمانہ بتاتے ہیں۔کشمیر پر ایک ہندو عورت دیدا رانی حکمران تھی۔اس حملے میں محمود کو بہت سی تکلیفیں اٹھا کر ناکام واپس جانا پڑا۔مورخ اس ناکامی کی مختلف وجوہ بتاتے ہیں۔کوئی لکھتا ہے۔اس کی فوج راستہ بھول گئی تھی۔کسی نے لکھا۔جاڑا سر پر آپہنچا۔برفباری نے اس کی فوج کو تباہ و پریشان کر دیا۔تاریخ ہندوستان جلد اول کے صفحہ ۲۱۶ پر مولانا ذکاءاللہ دہلوی لکھتے ہیں۔اس حملے میں سلطان قلعہ لوہ کوٹ (پونچھ) تک آیا۔یہ قلعہ نہایت مستحکم تھا۔سلطان نے محاصرہ تو کیا لیکن جب محاصرہ پر مدت گزر گئی اور کشمیر کو کمک اور اطراف سے بھی پہنچ گئی اور جاڑے اور برف کی بھی شدت ہوئی۔تو سلطان محاصرہ ترک کر کے غزنی واپس آگیا۔مولانا ذکاءاللہ لکھتے ہیں۔یہ پہلی دفعہ تھی کہ ہندوستان میں لشکر اسلام کو اس طرح کا صدمہ پہنچا۔جس میں صدہا جانیں ضائع ہو گئیں اور بے نیل و مراد واپس آنا پڑا۔

سلطان محمود غزنوی کا مصنف اسی واقعہ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ ''لوہ کوٹ کے آگے اس کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ محصورین (٦) کو برابر کشمیر سے مدد پہنچتی رہی۔ یہاں تک کہ برفباری شروع ہوگئی۔ اور محمود کو پہلی مرتبہ ہندوستانی مہم میں پیٹھ دکھانی پڑی۔ واپسی کے وقت دریائے جہلم طغیانی پر تھا۔ فوج کی بڑی تعداد اس میں غرق ہوگئی۔ اور سلطان بہ ہزار خرابی پانی کے طوفان سے نجات پا کرنا کام ونامراد غزنی پہنچا۔'' محمود نے ۱۰۲۱ء/ ۱۰۲۲ھ میں دوبارہ کشمیر پر چڑھائی کی۔ لیکن نا کام واپس آیا۔ اور اسی نا کام مراجعت میں اس نے پنجاب میں مستقل حکومت کی بناڈالی۔

محمود کا بارہواں حملہ ۴۰۹ھ میں کشمیر پر ہوا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ راجہ لاہور بھاگ کر کشمیر چلا گیا تھا۔ اور راجہ سنگرام راج نے جو دیدرانی کا بھتیجا تھا۔ اور اس وقت کشمیر کا حکمران تھا۔ اس راجہ کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ محمود نے ۴۰۶ھ نا کامئے کشمیر کا زخم مٹانے کے لئے کشمیر پر فوج کشی کی۔ لیکن اس مرتبہ بھی ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کو تباہ کرنے والا سلطان آخر نا کام ہی پھرا۔ (٧) اس ناکامی کی وجہ بھی برفباری اور جاڑے کی سدت ہی بتائی جاتی ہے۔ تاریخ ہندوستان جلد اول ذکاءاللہ کے صفحہ ۲۱۷ پر تاریخ یمینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اور ملکوں کے سپاہیوں کے علاوہ بیس ہزار صرف ماوراءالنہری سپاہی تھے۔ جو جہاد کے ارادے سے سلطان کے ہمراہ تھے۔

غرض کشمیر کے حملوں سے سلطان کی نا کام واپسی کی کوئی وجہ ہو۔ اور مورخ اس کو خواہ کسی رنگ میں ظاہر کریں۔ بہرحال کشمیر ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس کی شمشیر زنی سے بچ سکا۔

سلطان شہاب الدین کے حملے افغانستان وسندھ پر

کشمیری مسلمان بادشاہوں میں سلطان شہاب الدین کشمیر مین نہایت نامور بادشاہ گزرا ہے۔اپنی فتوحات عظیمہ اور شجاعت بے نظیر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہاب الدین غوری کی غیور و فاتح روح اس کے رگ وریشہ میں تڑپ رہی ہے۔

زینپ ترنگنی کا مصنف پنڈت زونراج اس کے متعلق لکھتا ہے۔اگرچہ یہ بادشاہ جہاں جاتا تھا کامیاب ہو کے آتا تھا۔لیکن جوں جوں اس کو فتح ہوتی تھی، اس کی بہادری اور شجاعت کی آگ فتوحات کے خس وخاشاک کے جلانے کے لئے تیز ہوا کرتی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح سمندر میں خواہ کتنے ہی دریا کیوں نہ گریں پھر بھی اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ جس دن اس کو فتوحات کی کوئی خبر نہ ملتی تھی وہ مغموم رہتا تھا۔اور سمجھتا تھا کہ میری زندگی کا یہ دن بالکل ضائع چلا گیا۔آہو چشم عورتیں اس کا دل چھیننے کے لئے کوئی کشش نہ رکھتی تھیں۔شراب نوشی! ماہ تاباں کی خوشگوار چاندنی سب اس کے لئے بے لطف تھیں۔ جس طرح بوڑھے آدمی کو اپنی جوان اور خوبصورت بیوی عزیز ہوتی ہے۔اور وہ اس کے ہر قسم کے ناز و نخرے برداشت کرتا ہے۔اس طرح وہ اپنی فوج کے خوبصورت جوانوں کو بیوی سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔اور گرمی ہو یا سردی، دن ہو یا رات، بھوک ہو یا پیاس، روحانی تکلیف ہو یا جسمانی۔کوئی چیز اس کی یلغار کے لئے روک نہ بن سکتی تھی۔

اپنی فاتحانہ یورشیوں کے سلسلہ میں یہ اولوالعزم بادشاہ سب سے پہلے شمال

کی طرف بڑھا۔ جہاں پارسید کا قوم اباد تھی۔ سرحد افغانستان کے حاکم گونید خاں والئے اُودبانڈپور کے ملک میں پہلے اس کے بے پناہ تیر داخل ہوئے۔ اور پھر اس کی فوج نے کوچ کیا۔ سندھو ملک (سندھ) کے حاکم نے اپنے آپ کو بادشاہ کی شان کے موافق تحائف پیش کرنے کے قابل نہ سمجھتے ہوئے اپنی لڑکی (۸) پیش کر دی۔ پھر گاندھار کی سلطنت میں داخل ہوا۔ پھر شنگون کے ملک کو تباہ کیا۔ گجنی پوری (غزنی) میں جس اس کا داخلہ ہوا تو لاگ خوف کے مارے سراسیمہ ہو گئے۔ اشت نگر (ہشت نگر) اور پوروشویر (پشاور) سے اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔ غرض اس بادشاہ کی فتوحات کا زینہ راج ترنگنی میں بڑی تفصیل سے ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ بادشاہ فتح اور ظفر مندی کے شوق میں اتنا طویل عرصہ اپنے ملک سے باہر رہتا تھا کہ غیر ممالک اس کے اپنے ہو جاتے تھے۔ اور اس کا اپنا ملک اس کے لئے بیگانہ اور اجنبی ثابت ہوتا تھا۔

اس کی فوج، اس کے کمانڈر اور اس کے سپہ سالار سب کشمیری تھے۔ اور اگر اس کی ہمت و جرأت اور اس کے شوق ملک گیری و ملک بخشی کا ساتھ اس کی افواج بھی دیتیں اور وطن کی محبت ان پر غالب نہ اجاتی۔ تو معلوم نہیں وہ کہاں تک پہنچتا اور کس جگہ جا کر دم لیتا۔

تاریخ فرشتہ کا مصنف بھی اس کی فوجی طاقت کا اعتراف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے۔ "یہ بادشاہ نہایت شجاع تھا۔ اس کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ جس فتح نامہ کسی مقام سے نہ آتا تھا۔ اس دن کو ایام عمر میں شمار نہ کرتا تھا اور کدورت کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر ہوتے تھے۔ یہ بادشاہ آب سندھ کے کنارے پہنچا۔ وہاں کے حاکم کو جام کہتے ہیں۔ اسے شکست دی۔ قندھار اور غزنی تک اس کے نام سے لرزتے

تھے۔یاسپ نگر کی راہ سے جواب باش نغر مشہور ہے۔وہ پشاور میں گیا۔اور مخالفوں کی جماعت کثیر کو قتل کر کے کوہ ہندوکش میں داخل ہوا۔

کرنل سر ولزلی ہیگ نے بھی تاریخ ہند کے بارہویں باب میں شہاب الدین کی فتوحات اور اس کی جنگی سپرٹ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔وہ لکھتا ہے۔

''شہاب الدین ایک مشہور جنگجو، قابل اور منتظم بادشاہ تھا۔اس نے دوشہر بھی آباد کئے اور زمینوں کی انتہائی احتیاط سے حد بندی کی تا کہ شاہی اراضیات (خالصہ) پر مخالفانہ قبضہ نہ ہو سکے۔آغاز حکومت میں اس نے سندھ پر حملہ کیا اور سندھ کے کنارے اس نے جام کو شکست دی۔وہاں سے واپس آ کر وہ پشاور گیا۔جہاں اس نے افغانوں کو سخت ہزیمت دی۔اور افغانستان کو عبور کرتا ہوا کوہ ہندوکش کے دامن تک جا پہنچا۔اس کا ارادہ ہندوکش سے بھی آگے جانے کا تھا۔لیکن بعض ناموافق حالات نے اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔اور وہ واپس آ گیا۔واپسی پر وہ پنجاب کے میدانوں کو روندتا ہوا دریائے ستلج کے کنارے جا پہنچا۔جہاں اس نے ایک چھاؤنی کی بنیاد ڈالی۔یہیں راجہ نگرکوٹ (کانگڑہ) ۱۳۶۱ء میں اس سے ملا۔جو دہلی کے بادشاہ فیروز شاہ تغلق کے علاقہ پر لوٹ مار کر کے واپس آ رہا تھا۔راجہ نے شہاب الدین کی آؤ بھگت اور خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔بلکہ شاہی مہمان نوازی کے علاوہ اس نے بادشاہ کو مال غنیمت سے بھی کافی سے زیادہ حصہ دیا۔شہاب الدین اس کے بعد کشمیر کو واپس چلا گیا۔''

شہاب الدین کے بعد قطب الدین پھر سکندر بُت شکن، اس کے بعد علی شاہ اور زین العابدین بڈ شاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔یہ سب بہادری و شجاعت و تیز

وتلوار کے دھنی تھے اور ہر چند کہ بڈشاہ کے بعد کشمیر کے بادشاہوں کی عیش پرستی اور مے نوشی اور شہزادوں کی باہمی خانہ جنگیوں نے ملک کو تباہی کے عمیق غار میں پھینک رکھا تھا۔ اور کسی غیر ملک پر حملہ کرنا تو کجا ان کو اپنا آپ سنبھالنا بھی مشکل نظر آرہا تھا۔ تاہم اس گئے گزرے زمانے میں بھی کشمیر کی تاریخیں چند ایسے واقعات پیش کرتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند آگ بجھ چکی تھی۔ لیکن کچھ دھواں ابھی باقی تھا۔ اگر اس کو کوئی سلگانے والا ہوتا تو وہی دھواں ایک بار پھر اپنی شرر باریوں سے جہاں سوزی کے سامان پیدا کر سکتا تھا۔

سلطان حسن شاہ شہمیری کی افواج سرحد پنجاب پر

چنانچہ شریور زینہ راج ترنگنی میں سلطان حسن شاہ والئے کشمیر کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ جب تاتار خاں حاکم پنجاب نے راجہ اجے دیو والئی جمون اور راجہ راجپوری (راجوری) پر حملہ کر دیا تو ان دونوں نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے حسن شاہ سے امداد و اعانت کی درخواست کی۔ جب بادشاہ کے پاس دونوں راجوں کا پیغام پہنچا۔ اس وقت بادشاہ کا سپہ سالار تازی بٹ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا ہمارے پڑوس کے چھوٹے چھوٹے والیان ملک اغیار کے حملوں سے خوفزدہ ہیں۔ اگر دشمنوں نے ان کو تباہ کر دیا تو ممکن ہے کل ہماری باری بھی آجائے۔ اس لئے ان کی امداد واعانت بہت ضروری ہے۔ اور اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں تاتار خاں کے تمام تار و پود کو تار تار کر سکتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے تازی بٹ فوج لیکر پہلے

راجوری اور پھر جموں پہنچا۔ دونوں راجے جو تاتارخاں کے خوف سے نیم جان ہو رہے تھے از سرنو زندہ ہو گئے۔

سیالکوٹ (۹) میں تاتارخاں اور تازی بٹ کے درمیان ایک خون ریز جنگ ہوئی۔ طرفین سے صدہا بلکہ ہزارہا نوجوان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ لیکن فتح آخر تازی بٹ کو ہوئی۔ تاتارخاں شکست کھا کر لاہور کی طرف بھاگ گیا۔ تازی بٹ نے سیالکوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اور شہر کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ سیالکوٹ کی اس تباہی کا ذکر طبقات اکبری، فرشتہ، سیر المتاخرین اور سیالکوٹ کی تاریخوں میں بھی درج ہے۔

سات سالہ بادشاہ کشمیر کی جنگی سپرٹ

اسی سلطان حسن شاہ کا بیٹا محمد شاہ تھا۔ باپ کی وفات ۸۹۲ھ کے وقت اس کی عمر صرف سات سال تھی۔ لیکن اس واقعہ سے جو آگے چل کر لکھا جائیگا۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کم سن شاہزادے میں بھی جنگی روح موجود تھی۔ اس کا ثبوت بھی فرشتہ ہی کے حوالے سے دیا جاتا ہے۔ جو معاملات کشمیر میں تاریخ رشیدی اور طبقات اکبری جیسی قدیم و مستند تاریخوں کا نچوڑ ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے۔

"جب وہ چھوٹی سی عمر میں مسند حکومت پر فائز ہوا تو وزراء اور تمام وہ لاگ جن کے سپرد خزانے اور فراش خانے تھے، طلائی و نقرئی ہتھیار، قیمتی لباس اور متاع نفیسہ اس کے سامنے لائے۔ یہ خورد سال بچہ سب کچھ بغور دیکھتا رہا۔ لیکن اس نے نہ خزانوں کی طرف نظر کی، نہ قیمتی

ملبوسات کو ہاتھ لگایا، نہ دوسرے سامان تعیش پر نظر ڈالی۔ البتہ ہتھیاروں میں سے ایک کمان اور ایک تلوار ہاتھ میں لے لی۔ اور کہا یہ میرے پاس ہے تو ہر چیز میرے قبضہ میں ہے۔ اہل دربار اس خوردسال بادشاہ کی ذہانت پر آفرین اور جزاک اللہ کہتے اور اپنے مشاہدے کو اس کی بزرگی و مردانگی پر محمول کرتے تھے۔

سب نفائس دیکھ کر بیکار اپنے ہاتھ میں
اک کماں رکھ لی تو اک تلوار اپنے ہاتھ میں

کیا اس ''بزدل'' ملک کے سوا کسی اور ملک میں بھی ایسی شہادت موجود ہے کہ سات سال کے بچہ کو جب تخت حکومت نصیب ہوا۔ اور خزانے، جواہرات، عجائبات، اصطبل اور ملبوسات نفیس اس کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے ان سب چیزوں کو کھلونے سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو اور تلوار یا تیر کمان ہاتھ میں لے کر کہا ہو کہ اگر یہ میرے قبضے میں ہیں تو بادشاہی کے لوازمات بھی میرے پاس سمجھنے چاہئیں۔

دسویں صدی ہجری کے وسط میں ہر چند کہ کشمیر کی حالت از حد خراب ہو چکی تھی۔ بادشاہ محض کٹ پتلی ہوتے تھے۔ امراء وزراء کی سازشوں میں ملک اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ دہلی کے بادشاہ اگر اس طرف توجہ کرتے تو فتح کشمیر چنداں مشکل نہ تھا۔ بلکہ یہاں تک تو ہو گیا تھا کہ مرزا حیدر کاشغری نے ہمایوں بادشاہ کے نام کا سکہ بھی کچھ عرصہ کشمیر میں جاری کر رکھا تھا۔ خانہ جنگی کے علاوہ سنی شیعہ کے فسادات نے مذہب کے نام پر ملک میں جو خون خرابہ کر رکھا تھا۔ اس نے بدامنی و بدنظمی کو اور بھی جلا دے رکھی تھی۔ تاہم ان میں ابھی کچھ دم خم باقی تھا۔ جیسا کہ آئندہ کی سطور سے ظاہر ہوگا۔

اکبر کے حملے کشمیر پر

اسی اثنا مین اکبر بادشاہ کو جوان دنوں لاہور میں مقیم تھا۔ کشمیر کی ایک جماعت (۱۰) نے جورات دن کے فسادات اور بے گناہوں کے خون سے تنگ آچکی تھی۔ اکبر کو تسخیر کشمیر کی دعوت دی۔ چنانچہ اکبر نے راجہ بھگوان داس کر پچاس ہزار فوج دے کر کشمیر بھیجا۔ اس وقت کشمیر میں یوسف چاہ چک کی حکومت تھی۔ مذہبی منافرت نے سنیوں اور شیعوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرر کھے تھے۔ ملک میں قحط کی وبا نازل تھی۔ اور بقول صاحب راتخ واقعات کشمیر ''یک سیر برنج بہ دہ روپے رسید وشکم اسپاں و شتراں پارہ کردہ آب مے خورند''۔

اس پر بھی راجپوتوں، مغلوں اور کشمیریوں میں خون ریز جنگ ہوئی کہ ع زمیں رابہ دریائے خوں کردہ غرق کا سماع پیدا ہو گیا۔ لیکن آخر اکبر جیسے جلیل القدر شہنشاہ کی فوج کو جو نصف لاکھ سوار اور پیادوں پر مشتمل تھی، ناکام واپس جانا پڑا۔ دوسری دفعہ اکبر نے محمد قاسم خاں میر بحری کو تیس ہزاز فوج دے کر پھر کشمیر بھیجا۔ یہ وہ وقت تھا کہ سنی شیعوں کے مکانات و معابد اور شیعہ سنیوں کے مکانات و معابد کو جلا کر خاک سیاہ کر دینا معمولی بات سمجھتے تھے۔ یہ لڑائی بھی جس نے آزادی کشمیر کا خاتمہ کر دیا۔

سناں آتش کیں برافروختہ

پر مرغ را در ہوا سوختہ

کا نمونہ تھی۔

شمس چک کی غیر معمولی شجاعت

لیکن کشمیری فوج میں شاہی خاندان کے ایک شخص شمس چک (۱۱) کا نام لیا جاتا ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ صرف اس تنہا شخص نے ساٹھ مغلوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور دشمن کے جم غفیر سے اپنی جان بچا کر کرناہ کی طرف نکل گیا۔ اسی شمس چک کے متعلق یہ شعر مشہور ہے۔

بہ تیغ و بہ چوب و بہ سنگ و بہ مُشت
ملک شمس چک شصت کس را بہ کُشت

کشمیر نے مغلوں کی غلامی ۹۹۸ھ میں اختیار کی۔ لیکن شکست کھا چکنے اور اپنا ملک اپنے ہاتھ سے دے چکنے کے بعد بھی کشمیری اپنی کھوئی ہوئی آزادی کے لئے سالہا سال تک ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں ۱۰۲۱ء تک ملک میں متفرق مقامات پر کشمیریوں اور مغلوں میں ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اہل کشمیر کی فوجی سپرٹ کا مضمون کچھ طویل ہا گیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اور ممالک کی اقوام تو درکنار خود کشمیر کے لوگ اپنے ملک کی اور اپنی قوم کی سیاسی تاریخ اور جنگی سپرٹ سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ جب تک ہم اپنے موجودہ حالات کا گزشتہ تہذیب وتمدن کے ساتھ مقابلہ نہ کرلیں اپنی ترقی یا اپنے زوال کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتے۔

داستان عہد گل را از نظیری مے شنو
عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

اور چونکہ تاریخ ہی ازمنۂ قدیم کی ترقی یا زوال اور عبرت ونصیحت کا بہترین ریکارڈ ہے۔اس لئے ع

لذیز بود حکایت دراز تر گفتم

غرض بڈشاہ میں بھی وہ تمام شجاعانہ وشاہانہ خصائل موجود تھے جو اُس کے آباء و اجداد شہاب الدین، قطب الدین اور سلطان سکندر شاہ میں پائے جاتے تھے۔لیکن اس میں اور بہت سی خوبیاں تھیں۔ جو اس کے کسی پیش رو میں موجود نہ تھیں۔وہ نہایت بے تعصب اور عادل بادشاہ تھا۔اور خون خرابے سے اس کو سخت نفرت تھی۔وہ ملک گیری کا بھی زیادہ شائق نہ تھا۔

وہ لوگوں کی جانوں کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔وہ خود بخود بغیر کسی معقول وجہ کے کسی ملک پر چڑھائی نہ کرتا تھا۔البتہ جب مدافعانہ حملے کرتا تو اس کی تیغ بے پناہ سے جان بچانا مشکل ہو جاتا تھا۔سرحدی علاقوں میں بادشاہ کے جس قدر مخالف تھے، وہ ایک ایک کر کے خود بخود اس کے ماتحت ہوتے چلئے گئے۔

بادشاہ کے ہاتھوں فرقہ چک کی تباہی

بادشاہ نے دودھ بھائیوں کی اصلاح وسرزنش کے بعد فرقہ چک کی طرف توجہ کی۔جس کا رئیس پانڈو چک بادشاہ کے محبوب علاقہ زنگیر کی شاہی عمارات کو اس

لئے تباہ کر جاتا تھا کہ بادشاہ کا قرب اس کی غارت گریوں میں رکاوٹیں ڈالا کرتا تھا۔ آخر جب بادشاہ اس کے استیصال کا عزم مصمم لے کر دارالحکومت سے کامراج کی طرف روانہ ہوا۔ تو پانڈو چک دردستان کی طرف بھاگ گیا لیکن بادشاہ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس کا تعاقب کیا اور حکم دردستان کو لکھا کہ پانڈو چک کو تلاش کر کے مابدولت کے پاس بھیج دو۔ ورنہ اس کے ساتھ اپنی تباہی کے لئے بھی تیار رہو۔ حاکم دردستان کی حقیقت وحیثیت ہی کیا تھی کہ وہ مقابلہ یا انکار کرتا۔ اس نے فوراً تعمیل کی۔ حاکم دردستان کے آدمی پانڈو چک کو گرفتار کر کے سری نگر لائے۔ جہاں بادشاہ نے اس کو قتل کر کے ملک کو اس کے فتنہ وشر سے نجات دلائی۔

شریور پنڈت نے بھی زینہ راج ترنگنی میں فرقپ چک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ بادشاہ جانتا تھا کہ علاقہ کمراج کے چک مفسد اور لٹیرے ہیں۔ اور ملک کے اوباشوں کو اپنے ساتھ ملا کر لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے تھے۔ اس لئے اس نے دودھ بھائیوں کے بعد سب سے پہلے ان ہی کی طرف توجہ کی۔ ان میں جو سب سے زیادہ شرارتی عنصر تھا، اس کا قلع قمع کیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں کی جائیدادیں اور اراضیات ضبط کرلیں۔ لیکن اس علاقے سے نکال کر ایک اور علاقہ بنام مداوا (۱۲) میں ان کے گزارے کا انتظام کر دیا۔

بادشاہ کاشغر سے بڈشاہ بادشاہ کشمیر کی جنگ

تبت کلاں (۱۳) جس کو لداخ کہتے ہیں اور تبت خورد جس کو سکردو کہتے

ہیں۔ سلاطین کشمیر کی مملکت میں شامل تھے۔ لیکن سلطان علی شاہ کے زمانے میں سلطان کاشغر (۱۴) نے ان پر قبضہ کرلیا تھا۔ اور جب دونوں بھائی علی شاہ اور بڈ شاہ آپس میں لڑ رہے تھے، وہ ہر دو تبت پر قبضہ کرنے کے بعد کشمیر میں بھی حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

بادشاہ فرقہ کوچکاں اور فرقہ چک کے فسادات مٹا کر ان ممالک کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اس کے بھائی کے زمانے میں باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس کے خاندان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اس کو تبت کے نکل جانے ہی کا صدمہ کچھ کم نہ تھا کہ بادشاہ کاشغر کے حملۂ کشمیر کی خبروں نے اسے اور بھی برآشفتہ کر دیا۔

بادشاہ کی دلآویز شخصیت اس کے افسروں بلکہ اس کی تمام رعایا پر مقناطیسی اثر رکھتی تھی۔ اور اس کی رعایا کا ہر فرد اس کے ہر دشمن کا مقابلہ کرنے اور ناموس وطن کی خاطر خاک وخون میں لوٹنے کے لئے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ اس نے امرائے مملکت اور سرداران لشکر محمد ماگرے، ملک مسعود ٹھاکر، ہلمت رینہ، احمد رینہ، اوتر رینہ (۱۵) وغیرہ کو جمع کیا۔ اور ان ''ترک تازاں ورستم نشان'' کے مشورے سے نہ صرف کشمیر کو دشمن کے حملوں سے بچانے بلکہ تبت کو واپس لینے کی تیاریاں کیں۔

ساعت سعید میں افواج نوشہرہ کی چھاؤنی سے باہر نکلیں۔ اور پہلی منزل لار میں ہوئی۔ یہاں بادشاہ نے فرج کا جائزہ لیا۔ جس کی تعداد مختلف مورخین نے مختلف بتائی ہے۔ صاحب ''اسلامک کلچر ان کشمیر'' لکھتے ہیں۔ ایک لاکھ پیادہ اور تیس ہزار سوار تھے۔ تاریخ ملا بہاء الدین، گلزار کشمیر اور تاریخ حسن میں پیادہ فوج کی تعداد تو ایک لاکھ ہی ہے مگر رسالہ کی تعداد بیس ہزار درج ہے۔ مکمل تاریخ کشمیر مین سواروں کی

تعداد پچاس ہزار بتائی گئی ہے۔ پیادہ فوج کی تعداد میں سب متفق ہیں۔فتحیات کبرویہ (۱۶) میں لکھا ہے۔"سلطان عسا کر خودرادر پرگنہ لار جمع نمودہ یک لک پیادہ و بست وپنج ہزار بقلم آمد"۔

بادشاہ کاشغر کی شکست

والئی کاشغر کو جب شکست ہوئی تو اس نے جمعیت کثیر کشمیری افواج کے مقابلہ کے لئے بھجوائی۔علاقہ تبت میں ایک موضع شیہ زئ ہے۔ وہاں افواج آمنے سامنے ہوگئیں۔محاربہ عظیم نے خون کی ندیاں بہادیں دونوں طرف کے سپاہیوں اور سرداروں نے داد مردانگی دی۔ بقول صاحب فتحیات کبرویہ" آخر الامر بتائید الٰہی ہزیمت بہ کاشغریاں لاحق شدہ۔رُو بہ فرار آوردند وسلطان بہ فتح و فیروزی دارالامان کشمیر مراجعت نمود"۔بادشاہ اس لڑائی میں ایک کاشغری شہزادے کو بطور یرغمال ہمراہ لایا تھا۔جس کا ذکر طبقہ شعرا میں درج ہے۔

کاشمیری افواج کے حملے پنجاب اور حدود دہلی پر

شہاب الدین کے بعد کشمیر کے جو بادشاہ ہوئے ،ان کی توجہ آباء واجداد کے مفتوحہ ممالک کی طرف کم ہوتی گئی۔اور تغلق بادشاہوں اور تیموری حملہ آور اس کے بعد خضر خان کے جانشینوں کی کمزوری وغفلت سے دہلی کے کئی صوبے خودمختار ہو گئے۔اور

پنجاب میں ہر چند کسی نے باقاعدہ سلطنت قائم نہ کی۔تاہم گکھڑوں نے جن کے سرگروہ شیخا گکھڑ اور جسرت گکھڑ دو بھائی تھے۔ ہمیشہ اس کو فتنہ وفساد اور بدامنی و بے چینی کا گھر بنائے رکھا۔یہاں تک کہ شمالی پنجاب سلاطین دہلی کے ہاتھ نکل گیا۔بلکہ ایک وقت ایسا آیا کہ بڈشاہ کوشہزادگی کے زمانے میں بھائی کی مراجعت پر جسرت گکھڑ کے پاس پناہ لینی پڑی۔اوراپنی منتشر فوج کے ساتھ جب تک جسرت کی امداد شامل نہ کی، وہ تخت پر قابض نہ ہوسکا۔

جسرت کا بھائی شیخا گکھڑ تیمور کا مقابلہ کرتے ہوئے تیمور کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔اب جسرت کو بادشاہ بننے کی بڑی تمنا تھی۔لیکن لوٹ مار اور حرب وضرب کے سوا چونکہ آئین ملک داری سے بالکل نابلد تھا۔اور کچھ تقدیر بھی ساتھ نہ دیتی تھی۔اس لئے کئی مرتبہ کامیاب ہونے کے باوجود بھی اسے استقلال واطمینان حاصل نہ ہوسکا۔

آخر اس نے اپنے قدیم رفیق شاہی خان سے جواب سلطان زین العابدین کے نام سے کشمیر میں جاہ وجلال کے ساتھ داد حکمرانی دے رہا تھا۔اپنے احسانات کے بھروسہ پر امداد طلب کی۔اس کا ذکر چند دیگر مورخوں کے علاوہ صاحب طبقات اور صاحب تاریخ فرشتہ دونوں نے کیا ہے۔صاحب طبقات لکھتے ہیں۔

''جسرت کھوکھر (گکھڑ) بہ قوت سلطان اگر چہ نہ توانست تسخیر دہلی نمود۔اما تمام پنجاب رادر تصرف آورد''۔

فرشتہ لکھتاہے۔سلطان نے دہلی و پنجاب کی تسخیر کے لئے افواج کثیر جسرت کے ہمراہ کی۔اگر چہ جسرت بادشاہ دہلی کی برابری نہ کرسکتا تھا۔لیکن کشمیری

لشکر کی قوت و اعانت سے اس نے پنجاب و ملحقات پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد تاریخ ہند جلد چہارم مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ مرحوم میں بھی ان الفاظ کی تائید کی گئی ہے۔لکھتے ہیں۔جس زمانہ میں جسرت نے کشمیری افواج کی امداد سے پنجاب پر قبضہ کیا ہے۔اس زمانہ میں دہلی کا بادشاہ بہلول لودھی تھا۔صاحب سیر المتاخرین بھی جلد اول میں لکھتے ہیں۔سلطان زین العابدین نے جسرت کو ایک لشکر جرار فتح پنجاب کے لئے دیا۔جہاں اس نے کشمیری افواج کی مدد سے خوب دست بُرد کی۔اور گو دہلی کے بادشاہ پر فتح نہ پا سکا مگر پنجاب پر اس نے قبضہ کرلیا۔

ان تاریخوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جسرت کشمیری فوج کی مدد سے تسخیر پنجاب ہی کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔بلکہ وہ دہلی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔یہ واقعہ کب پیش آیا۔اس کے متعلق سب تاریخیں خاموش ہیں۔لیکن جسرت کے حالات و واقعات پر غائر نظر ڈالنے سے یہ معمہ بھی حل ہوسکتا ہے۔

۸۲۶ھ یا ۸۲۷ھ میں جسرت رائے بھیم والئی جموں کو شکست دیتا ہے۔اس کے بعد ۸۳۱ھ میں پھر جسرت کے حملہ لاہور و جالندھر کی خبر ملتی ہے۔۸۳۵ھ میں وہ پھر کہیں سے سر نکال کر جہلم، راوی اور بیاس کو عبور کر کے جالندھر جاتا اور ملک سکندر تحفہ حاکم لاہور کا گھوڑا گرفتار کر کے اور بے شمار مال و اسباب لوٹ کر لاہور آتا ہے۔لیکن دو چار مہینوں کے بعد ہی بادشاہ مبارک شاہ بن خضر خاں کے خوف سے وہ پھر کوہستان میں بھاگ جاتا ہے۔۸۳۶ھ میں پھر اس کے حملہ لاہور کی خبر ملتی ہے۔اس زمانہ میں ملک بہلول لودھی یہاں کا ناظم اس کو شکست دے کر لاہور و جالندھر پر قابض ہو جاتا ہے۔۹/رجب ۸۳۷ھ کو مبارک شاہ کے قتل ہو جانے پر

سلطان محمد شاہ اس کا جانشین ہوتا ہے۔ جو کئی سال کی خاموشی کے بعد ۸۴۰ھ میں جسرت کو لاہور سے باہر نکالتا ہے۔ اور ۸۴۵ھ میں ملک بہلول لودھی کو خان خاناں کا خطاب دے کر لاہور و دیپالپور کا حکم بنا دیا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ جسرت کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اس کے بعد صفحہ تاریخ میں جسرت اور لاہور کا کوئی تعلق نہیں آتا۔

متذکرہ واقعات سے پایا جاتا ہے کہ ۸۳۶ھ سے ۸۴۰ھ (۱۴۳۳ء سے ۱۴۳۶ء) تک جسرت لاہور پر امن و امان سے قابض رہا۔ اس کے تمام حملوں میں صرف یہی تین چار سال اس کو اطمینان کے ساتھ لاہور میں رہنا نصیب ہوا۔ ورنہ کبھی دو ماہ، کبھی چار ماہ وہ لاہور پر قابض رہا۔ اور کئی دفعہ تو اسے ناکام ہی جانا پڑا۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہی معلوم ہوتی ہے کہ ۸۳۶ھ ہی میں بڈشاہ نے اس کو فوج اور خزانہ اور جملہ لوازمات جنگ سے مدد دی۔

زونراج بھی زینہ ترنگنی میں بڈشاہ اور جسرت گکھڑ کے دوستانہ تعلقات کو تسلیم کرتا ہے۔ لکھتا ہے۔ بادشاہ کا گکھڑوں کے سردار کے ساتھ کافی اتحاد تھا۔ ایک مرتبہ جسرت نے جب بادشاہ دہلی کے حملوں سے تنگ آ کر کشمیر میں پناہ لی۔ تو بادشاہ اس کے ساتھ ایک شفیق دوست کی طرح پیش آیا۔

بادشاہ کشمیر کی وسعت سلطنت

زین العابدین کے حالات جب آئیندہ صفحوں میں پڑھو گے تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا۔ کہ ہر وقت داد عیش دیا کرتا یا ہر وقت اپنا جاہ و جلال دکھایا

کرتا۔ بلکہ کبھی وہ ایک ناصح اور واعظ بن کر بداخلاقی اور شراب نوشی کی برائیاں بیان کرتا ہے۔ کبھی وہ اپنی اور اپنے خاندان کی نیک نام شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے فرزندوں کو دنیا کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتا ہے۔ کہیں وہ اپنے کسی فرزند کی بے اعتدالی پر اس شخص سے معافی مانگنے کے لئے اس کے گھر برہنہ پا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ شہزادہ بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔ کہیں وہ اپنی حملہ آور فوج کو رعایا کا مال چھیننے اور زراعت کو ان کی دست بُرد سے بچانے کے احکام جاری کرتا ہے۔ کہیں وہ عرایا کی تکالیف اور ان کے حقیقی مطالبات سے آگاہ ہونے اور ظالم اور راشی حکام کے طرز عمل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جاسوس مقرر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ایک زمیندار کی حیثیت رکھتا ہے جو زراعت و کاشت کو ترقی دینے کی تدابیر میں سرگرم رہتا ہے۔ دوسری طرف وہ ایک انجینیر نظر آتا ہے جو نئی نئی عمارتیں تیار کراتا اور کشک علاقوں کی آبپاشی کے لئے نہریں کھداتا ہے۔ کبھی وہ ایک باغبان ہے جو باغوں کی تیاریوں اور انواع واقسام کے ثمر دار و بے ثمر مگر سایہ دار درختوں کی آبیاریوں میں محو رہتا ہے۔ کبھی اس کو بنجر اور غیر آباد علاقوں میں نئی بستیاں بسانے اور نئے گاؤں آباد کرتے دیکھا جاتا ہے۔ کہیں وہ صلحاء وعلماء کے ساتھ علمی مناظروں میں حصہ لیتا نظر آتا ہے۔ اور کہیں صاحب دل ہندو و مسلمان بزرگوں کی خدمت میں ہم اسے کمر بستہ پاتے ہیں۔ جس بادشاہ کے اس قسم کے خصائل ہوں۔ جس کو اپنے ملک کی آبادی و شادابی کی تجاویز ہی سے فرصت نہ ملتی ہو وہ شجاعانہ اور فاتحانہ اوصاف رکھنے کے باوجود صرف ملک گیری کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اپنے وطن کو قتال و جدال میں کس طرح مبتلا کرا سکتا ہے؟

بایں ہمہ ہر دو تبت پر اس کا قبضہ تھا۔ اور کاشغر کی سلطنت بھی جو گلگت سے قریباً ایک ماہ کی مسافت پر واقع ہے، اس کے زیر اثر تھی۔ زینہ ترنگنی اور زینہ راج ترنگنی اور اس کے بعد ابوالفضل کی آئین اکبری اور طبقات اکبری (۱۷) اور تاریخ فرشتہ کی تحریروں کے مطابق سندھ بھی اس کے زیر اقتدار تھا۔ بلکہ اس کا بھانجا جو وہاں ہی قتل ہو گیا تھا۔ اس کی طرف سے وہاں کسی علاقے کا ناظم تھا۔ پکھلی کا وسیع علاقہ جس کا نام اس زمانے میں ضلع ہزارہ ہے۔ اور جس کی حدود ایک طرف ضلع مظفر آباد کے ساتھ ملتی ہیں۔ دوسری طرف ضلع اٹک کے ساتھ۔ وہ بھی اس کے ماتحت تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی سرحدی ریاستیں سوات وغیرہ اور کئی سرحدی مقامات میں جو آج یاغستانی یا آزاد علاقے کہلاتے ہیں۔ اس کا رعب وداب قائم تھا۔

لارنس صاحب نے بھی اپنی تصنیف ویلی آف کشمیر میں تسلیم کیا ہے کہ بڈ شاہ کی حکومت کشمیر میں تو تھی ہی مگر پنجاب سے پشاور و سرہند تک بھی اس کا قبضہ تھا۔ کشمیر کی تاریخیں بھی سرہند تک اس کی وسعت مملکت کا پتہ دیتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ تو صحیح ہے کہ بڈ شاہی مقبوضات یا زیر قیادت علاقے کشمیر سے باہر شمال کی طرف پکھلی تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن سرہند سے مراد اگر وہ سرہند ہے جو اس وقت ریاست پٹیالہ میں واقع ہے۔ جہاں حضرت مجدد الف ثانی کی زیارت مرجع خلائق ہے۔ تو اس میں مورخوں نے جو غلطی کی ہے۔ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

جس سرہند پر بڈ شاہی اقتدار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ لفظ صحیح طور پر سرہند نہیں بلکہ اُندیا ہند ہے۔ اور یہ وہی مقام ہے جا کا قدیم نام اودبانڈ پور تھا۔ یہ قصبہ آج بھی صوبہ سرحد میں موجود ہے۔ اور اس کے آثار اس کی قدامت کا پتہ دے رہے

ہیں۔ بڈشاہ کی ماں اسی ادبانڈ پور کی شہزادی تھی۔ تفصیلات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۲

پونچھ، راجوری اور جموں کے علاقے سب اس کے مقبوضات میں شامل تھے۔ زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ نے فوج میں اس قسم کی سپرٹ پیدا کر رکھی تھی اور نظام سلطنت اس ترکیب سے قائم کیا تھا کہ بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشمیر مین داخل ہونا مشکل ہو گیا تھا۔

جب بادشاہ اپنے بھائی علی شاہ کو گرفتار اور نظر بند کر کے کسی کھٹکے کے بغیر کشمیر میں حکومت کرنے لگا۔ تو علی شاہ کے معاون راجور و جموں اپنے اعمال و کردار کی وجہ سے اس کے آگے سربسجود ہوئے۔ تاریخ راجگان راجور میں راجہ راجوری کی معافی کے متعلق لکھا ہے۔ چند روز بعد راجہ راجور نے سلطان سے معافی چاہی۔ چونکہ سلطان رحیم الطبع، عالی حوصلہ اور بلند خیال تھا۔ اس نے معافی دیدی اور ریاست اور سلطنت میں ویسے ہی روابط ہو گئے جیسے کہ پہلے تھے۔ راجہ جموں کو بھی اپنی حرکت پر نادم ہونے اور معافی مانگنے کے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ معافی بھی ملی اور جموں کی حکومت بھی۔

سالکان رہِ ہمت چو ارادت بینند
ملک کاؤس و فریدوں بہ گدائے بخشند

پانڈو چک نے اس کو کیسی کیسی تکلیفیں دیں۔ اس کی عالی شان و سر بفلک عمارات کو نذر آتش کر کے خاک میں ملا دیا۔ بادشاہ نے تنگ آ کر گو پانڈو چک کو اس کی بداعمالیوں کی سزا دیدی۔ مگر اس کے بیٹے حسین چک کو نوازشات شاہی کا مورد بنا دیا۔ اور رفتہ رفتہ چکوں نے وہ زور و اقتدار حاصل کیا۔ کہ بڈشاہ کی وفات کے ۹۰ سال کے بعد ہی وہ کشمیر کے بادشاہ ہو گئے۔

مفتوحہ ممالک کے ساتھ بادشاہ کا سلوک

بادشاہ جس ملک پر فتح پاتا اس کی حیثیت و طاقت سے زیادہ خراج مقرر نہ کرتا۔ اور نہ اس سے نذرانہ اس قدر زیادہ طلب کرتا کہ اس کو اپنی رعایا پر ظلم کر کے روپیہ فراہم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اور اپنے باپ سلطان سکندر اور امیر تیمور کا واقعہ ہمیشہ یاد رکھتا۔ جبکہ تیموری امراء نے اس کے باپ کو تیس ہزار گھوڑوں اور ایک لاکھ اشرفی کے نذرانے کا پیغام بھیجا تھا۔

حواشی:

(۱) بداستن وستہ یا وتستہ سے نکلا ہوا ہے۔ جو دریائے جہلم کا قدیم نام تھا۔ مغلوں کے زمانے میں اس کو دہت یا بہت کہتے تھے۔ اب جہلم نام ہے۔

(۲) تاریخ پنجاب جج محمد لطیف صفحہ ۱۱۔

(۳) مختلف زمانوں میں لاہور کے مختلف نام رہے ہیں۔ مثلاً لہانور، لوہ آور، لاؤپور، لہاور، راہور، لوہار، لہریالوہر، لاہور۔ ایک لاہور تحصیل صوابی ضلع پشاور میں بھی ہے جو جہانگیر روڈ سے زیدہ کو جاتے ہوئے بائیں طرف سڑک سے کچھ فاصلے پر نظر آتا ہے۔ اس کی بنیاد ہندو راجگان لاہور کے زمانے سے بتائی جاتی ہے۔

(۴) کشمیر کا جغرافیہ قدیم ملحقہ راج ترنگنی سٹین صاحب۔

(۵) ۱۳۶ء و ۶۳۲ء یا ۶۳۰ء و ۶۳۱ء میں۔

(۶) تاریخ قرون وسطیٰ ہندوانڈیا از سی، وی وادیا۔

(۷) محصورین میں راجہ بھیم و راجہ جے پال کا پڑپوتا اور اس کی فوج تھی۔ بھیم شکست کھا کر بھاگ آیا تھا۔

(۸) مولوی محمد حبیب بی اے آکسن اپنی کتاب سلطان محمود غزنوی میں لکھتے ہیں۔ کشمیر کے راجہ سالی نے سلطان سے صلح کر لی اور محمود غزنوی کا مقدمۃ الجیش اپنے زیر کمان لینا قبول کیا۔ لیکن کتاب الہند کا مصنف البیرونی جو سلطان مسعود بن محمود کے زمانے میں گزرا ہے لکھتا ہے۔ محمود نے چونکہ ہندوؤں کی سرسبز زمین کو تباہ کر دیا تھا۔ اور ہندو اس زمانہ میں غبار کی طرح پراگندہ ہو کر افسانہ بن گئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ یہی سبب ہوا کہ ان کے علوم سلطان کے مفتوحہ علاقوں سے سمٹ کر بنارس اور کشمیر وغیرہ کی طرف چلے گئے۔ جہاں اب تک ہماری

رسائی نہیں ہوئی ہے۔از کتاب الہند البیرونی جلد اور ترجمہ از در شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی۔مولوی حبیب اللہ نے اس زمانہ کے راجہ کشمیر کا نام راجہ سالی لکھا۔صحیح نام کشمیری تاریخوں میں سنگرام ہے۔

(۹) شہاب الدین کا بیٹا شہزادہ حسن خان سندھی بیگم ہی کے بطن سے تھا۔

(۱۰) شریور نے زونراج ترنگنی میں سیالکوٹ کا نام شری کالکوٹ لکھا ہے۔

(۱۱) اس جماعت میں چند چک سرداروں اور دیگر امراء کے علاوہ شیخ یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی بھی شامل تھے۔

(۱۲) فرقہ چک کے حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۵۔

(۱۳) مداداسے مطلب مدیامراز یعنی جنوبی کشمیر ہے۔اسے مدراج بھی کہتے ہیں۔

(۱۴) تبت اکلاں (لداخ) سطح سمندر سے ۱۱۵۰۰ ہزار فٹ اور اسکردو ۷۰۲۴ فٹ بلند ہے۔یہاں کے باشندے بدھ اور تبتی اور مسلمان ہیں۔لیکن ڈوگرہ حکومت کے عہد سے اب وہاں سکھ اور ہندو اور مسلمان پنجابی اور کشمیری بھی آباد ہوگئے ہیں۔ مسلمان سب سنی تھے۔مگر بڈشاہ کی وفات کے ۲۲ سال بعد ۹۰۰ھ میں میر شمس عراقی نے وہاں شیعہ عقائد کی تبلیغ کی۔اس کے بعد نوربخشی فرقہ میں بھی اکثر لوگ داخل ہوگئے۔یہاں بعض جاگیردار راجے بھی ہیں۔جو شیعہ مسلمان ہیں اور اپنے آپ کو سلطان سکندر کاشغری کی اولاد بتاتے ہیں۔اس کے لئے دیکھو ہماری تاریخ بلتستان زیر طبع۔

(۱۵) کاشغر مشرقی ترکستان یا چینی ترکستان کا ایک مشہور شہر ہے۔چینی ترکستان کو چینی زبان میں صوبہ سنگ کیانگ کہتے ہیں۔اس صوبہ میں جس کی آبادی ۴۳ لاکھ ساٹھ ہزار ہے، تین چوتھائی مسلمان آباد ہیں۔جو تاجک، ترکمان اور اُزبک قوموں پر مشتمل ہیں۔زمانہ قدیم میں کاشغر پر اسلامی حکومت تھی۔بلکہ تمام چینی ترکستان مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔اور ہر چند کہ یہ عرصہ سے چین کے ماتحت ہے لیکن یہ صوبہ ہمیشہ شورشوں کا مرکز رہا ہے۔اور کاشغر جس کی آبادی اسی ہزار سے بھی زیادہ ہے۔اس صوبہ کا سیاسی صدر مقام چلا آتا ہے۔ساتویں صدی ہجری میں یہاں

مسلمان آئے۔ قتیبہ بن مسلم باہلی پہلا مسلمان جرنیل تھا جس نے کاشغر کو فتح کر کے ترکستان میں اسلامی حکومت کی بنا رکھی۔

چینی ترکستان میں جو شورشیں ہوتی رہی ہیں، ان میں سب سے اہم شورش یعقوب بیگ کی بغاوت تھی۔ جو انیسویں صدی کے اخیر میں ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں حاجی نیاز نے صوبہ سن کیانگ میں از سر نو اسلامی حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن حکومت چین نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب وہاں حکومت تو چین کی ہے لیکن اثر روس کا ہے۔

کشمیر میں جن ترکستانی صوفیاء وسادات نے ابتدا میں اسلام پھیلایا ہے۔ وہ کاشغر اور یارقند سے ہو کر گلگت کی راہ سے کشمیر پہنچتے رہے ہیں۔ یارقند کاشغر سے قریباً ایک سو میل جنوب مشرق کی طرف دریائے زرفشاں کے کنارے آباد ہے۔

(۱۶) یہ کتاب قلمی ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔ جہانگیر کے زمانے میں تصنیف ہوئی ہے۔ ورق ۷۷ پر متذکرہ صدر الفاظ لکھے ہیں۔

(۱۷) چنانچہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ وتمام ولایت کہ درکنار آب سندھ واقعہ است درتصرف سلطان درآمد۔

چھٹا باب

بادشاہ کی اولاد اور دیگر رشتہ دار

بادشاہ کی بیہقی بیگم

بادشاہ کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی بیگم بیہقی بیگم کے نام سے موسوم تھی۔ جو میر سید حسن منطقی بیہقیؒ کے باپ سید نورالدین کی بہن اور سید تاج الدین (۱) کی دختر بلند اختر تھی۔ اس بیگم کا نام کوئی بی بی خاتوں بتاتا ہے، کوئی تاج خاتون اور کوئی مخدومہ خاتون، کوئی صرف بیہقی بیگم کہتا ہے۔ مگر یہ بیگم چونکہ اپنے خاندانی قبرستان میں جو مزار کلاں کے اندر قبرستان سادات بیہقی یا سید واری کے نام سے موسوم ہے، دفن ہے۔ اس لئے عام طور پر اس کو بیہقی بیگم ہی کہتے ہیں۔ اور قبر پر مخدومہ خاتون کا نام ہے، وہی قبر اس بیگم کی بتائی جاتی ہے۔

بیہقی بیگم اولاد نرینہ سے محروم تھی۔ لیکن اس نے بادشاہ کے مرشد سید حسن منطقیؒ کے فرزند سید محمد امین اُویسیؒ کو جو اس کے اپنے ہی خاندان سے تھا لے پالک بیٹا بنا رکھا تھا۔ اور اس کو اپنے حقیقی بچوں کی طرح پالا تھا۔ مگر قدرت چونکہ اس بچے سے دنیائے تصوف کو آباد کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے بہت سی کوششوں کے باوجود اس ہونہار اور زیرک مگر صوفی منش بچے نے امور سلطنت کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔

۸۴۰ھ میں بیگم نے اپنا اور شیخ بہاء الدین گنج بخشؒ کا مزار تعمیر کرایا۔ ۸۴۹ھ میں شیخ بہاء الدینؒ اپنی دردناک شہادت کے بعد اس مزار میں دفن ہوئے اور آپ ہی کے مزار کی وجہ سے اس قبرستان کا وسیع احاطہ مزار کلاں (۲) کہلانے لگا۔ سانحہ شہادت کے ۱۹ سال بعد ۸۷۰ھ میں بیگم بھی انتقال کر گئی۔

شریور پنڈت زینہ راج ترنگنی میں بادشاہ کے آخری مصائب و تفکرات کے سلسلہ میں اس بیگم کی وفات کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔

ان ہی ایام میں بادشاہ کی پیاری ملکہ جس کا نام وداع خاتون (۳) تھا۔ اور جو بیہقی سادات کے خاندان سے تھی، انتقال کر گئی۔ بادشاہ کو اس کی موت سے بڑا صدمہ پہنچا۔

بیگم اس مزار کے احاطہ کلاں کے اندر اپنے خاندانی قبرستان میں جہاں سادات بیہقی کے اور افراد بھی دفن ہیں۔ اپنی وصیت کے مطابق سپرد خاک کی گئی۔ بیگم بادشاہ کی رفیقہ اول تھی۔ بادشاہ اس خیال سے کہ بیگم اولاد نرینہ سے محروم تھی، ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتا رہتا تھا۔ اور جب اس کی زندگی ہی میں وہ وفات پا گئی تھی تو ظاہر ہے کہ کس دھوم دھام سے اس بیگم کا جہاں آج اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے۔ جنازہ اٹھا ہوگا۔

فسانہ میں نے پورا پڑھ لیا دنیائے فانی کا
نظر افروز نکلی چاندنی گورِ غریباں کی

بیگم کی سنگین قبر کے تعویذ کے مشرقی و غربی گوشے جن پر ایک ایک شعر درج ہے۔ زمین دوز ہو چکے ہیں۔ زمین کھودنے کے بعد ان اشعار اور قبر کے فوٹو لئے

گئے۔اشعار حسب ذیل ہیں :

(شعر) طرف شرق ؎

وفات حضرت مخدومہ خاتون

کہ سال ہشت صد ہفتاد بگذشت

(شعر) بہ جانب غرب ؎

شب (پڑھا نہیں گیا) ز ہفتم ماہِ شوال

بہفت و بیستم اعداد بگذشت

بادشاہ کی دوسری بیگمات

بیہقی بیگم نے ہر چند اپنے ایک خاندانی لڑکے محمد امین اُویسیؒ کو پال رکھا تھا اور بادشاہ بھی اس کے سداتھ بہت محبت کرتا تھا۔لیکن شاہانہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے باوجود محمد امین چونکہ تصوف کی طرف زیادہ مائل تھا۔امور مملکت سے بالکل دلچسپی نہ رکھتا تھا۔اس لئے بادشاہ نے اولاد نرینہ کے لئے ایک اور شادی کا انتظام کیا۔

زونراج اس موقعہ پر لکھتا ہے کہ راجہ دشرت کی طرح بادشاہ کو بھی خدا نے چار بیٹے دیئے تھے۔جو راجہ مدر (۴) (یعنی مدر دیش کے راجہ) کی دو بیٹیوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

کوئی مسلمان بادشاہ دو حقیقی بہنوں کو بیک وقت اپنے عقد میں نہیں رکھ

سکتا۔البتہ دونوں بہنوں کا عقد اس طرح ثابت ہوسکتا ہے۔کہ ایک کے مرنے کے بعد دوسری سے نکاح کرلیا جائے۔اور یقیناً راجہ مدر دیش کی یہ دونوں بیٹیاں اسی طریق سے بادشاہ کے عقد میں آئی ہونگی۔

بادشاہ کی اولاد

بادشاہ کے چار بیٹے تھے۔اور جیسا کہ زونراج نے لکھا ہے۔وہ راجہ مدر دیش کی دونوں بیٹیوں کے بطن سے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی یہ دونوں بیگمات صاحب اولاد تھیں۔گو زونراج نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ اس کا کون سا فرزند کس بیگم یارانی کے بطن سے تھا۔اس کے سب سے بڑے بیٹے کا نام ادہم خان تھا۔اس سے چھوٹے کا نام حاجی خان تھا۔جو بادشاہ ہوکر سلطان حیدر شاہ کہلایا۔ تیسرے کا نام جسرت خان تھا۔معلوم ہوتا ہے،اس نے یہ نام اپنے دوست جسرت گکھڑ کے نام پر رکھا تھا۔چوتھے کا نام بہرام خان تھا۔

ان لڑکوں نے جوان ہوکر اپنی بے اعتدالیوں ،خانہ جنگیوں اور باہمی منافقتوں سے ایسے اولوالعزم سلطان اور نیک دل بادشاہ کی زندگی مرتے دم تک تلخ رکھی۔

مسلمان مورخوں نے بادشاہ کے صرف تین فرزندوں ہی کا ذکر کیا ہے۔جسرت خان کا نام زونراج نے لکھا ہے۔معلوم ہوتا ہے،یہ شہزادہ چھوٹی عمر ہی میں انتقال کرگیا ہوگا۔اس کا نام سیاسیات کشمیر میں بھی کہیں نظر نہیں آتا۔مسلمان

مورخوں نے بادشاہ کی کسی بیٹی کا ذکر بھی نہیں کیا۔لیکن شریور زینہ راج ترنگنی کے ترنگ چہارم اور شلوک ۳۰۵ سے ۳۲۱ تک میں ہیبت خان کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ کی لڑکی کے بطن سے تھا اور بادشاہ کی وفات کے بعد قتل سادات (۸۸۹ھ) کے وقت سادات کا طرف دار رہ کر مارا گیا۔ اس کی تصدیق مزار کلاں کی اس قبر سے بھی ہوتا ہے جو سادات بیہقی کے احاطہ میں واقع ہے۔ اور جس کے تعویذ پر لکھا ہے۔ ''ہیبت خان قرلغ (۵) نبیرہ سلطان علاؤ الدین قرلغ پکھلی نواسہ سلطان زین العابدین مغفور''۔

شریور کی زینہ راج ترنگنی سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ شہزادہ ہیبت خان ہی اس کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ اور اس نے سلطان پکھلی ہی کو اپنی لرکی دی تھی۔ بلکہ زینہ راج ترنگنی کے ترنگ سویم صفحہ ۲۲۲ میں سادات بیہقی کا ذکر کر کے دوران میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے سید ناصر اور اس کے اقربا کو اس لحاظ سے کہ وہ پیغمبرؐ کی اولاد سے تھے۔ اور قابل اور عزت کے مستحق تھے۔ اپنے دربار میں نہ صرف اعلیٰ مراتب عطا کئے اور جاگیریں عطا کیں۔ بلکہ اپنی لڑکیاں دے کر ان کی مزید عزت افزائی کی۔

سادات بیہقی میں سے سید ناصر کا بیٹا سید حسن بڈشاہ کا داماد تھا۔ بادشاہ کی اس لڑکی سے سید حسن کے ہاں دو اولادیں ہوئیں۔ ایک حیات خاتون جو سلطان حسن شاہ یعنی بادشاہ کے پوتے کی بیگم بنی۔ دوسری اولاد ایک نواسہ تھا۔ جس کا نام سید میر محمد تھا۔ گویا ہیبت خان قرلغ اور سید میر محمد خالہ زاد بھائی تھے۔ اور دونوں بادشاہ کے نواسے تھے۔ اس کا ثبوت بھی زینہ راج ترنگنی کے ترنگ سویم صفحہ ۲۵۳ و ۲۳۴ سے سلطان حسن شاہ کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ جہانگیر ماگرے نے خلوت میں موقع پا کر سادات کے ظلم و تشدد کے متعلق حسن شاہ سے کہا۔ ''سادات کو قبل ازیں جلاوطن کر کے

ملک کو ان کے مظالم سے نجات دی گئی تھی۔ مگر آپ نے ان کو جو ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہیں، معافیاں دلوا کر اور واپس بلوا کر دوبارہ اس پُر امن ملک میں ہمارے سروں پر نازل کیا۔ اب جس طرح بڈشاہ کے پوتے کی حیثیت سے سلطنت پر آپ کا حق ہے۔ اسی طرح بادشاہ مغفور کے نواسے کی حیثیت سے سید میر محمد بھی اس ملک پر اپنا حق جتارہا ہے''۔

زینہ راج ترنگنی سے بھی یہ امر واضح طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دونوں لڑکیاں بیہقی بیگم ہی کے بطن سے تھیں۔ یا ان میں سے کوئی راجہ مدر دیش کی لڑکی کے بطن سے بھی تھی۔ مگر اس خیال سے کہ شریور نے مدر دیش کی راجکماریوں کے بطن سے صرف چار لڑکوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ بادشاہ کی دونوں لڑکیاں بیہقی بیگم کے بطن سے تھیں۔ چونکہ وہ کو دسادات خاندان سے تھی۔ اس لئے اس نے ایک لڑکی اپنے بھتیجے سید ناصر کے بیٹے سید حسن کے ساتھ بادشاہ کو کہہ کر بیاہ دی۔ اور دوسری لڑکی سلطان پکھلی کے ہاں جو غیر سید تھا۔ ملکی مصلحتوں کی وجہ سے یا کسی اور بنا پر بیاہی گئی۔

چونکہ بادشاہ کی ان تین بیگمات کے علاوہ اور کوئی بیگم نہ تھی۔ ان میں سے دو کے ہاں چار فرزند تھے۔ اور بیٹی کوئی نہ تھی۔ کم از کم اس کے ہم عصر اور درباری مورخ نے ان راج کماریوں کے بطن سے اس کی کسی بیٹی کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے لامحالہ بادشاہ کی دونوں بیٹیاں بیہقی بیگم ہی کے بطن سے تھیں۔ جو اولاد نرینہ سے محروم تھی۔ لیکن صاحب اولاد ضرور تھی۔

بادشاہ کے بھائی کی وفات

بادشاہ کو اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمد خان سے کمال محبت تھی۔ اس نے

آغاز سلطنت ہی سے محمد خان کو وکیل مطلق بنا رکھا تھا۔ محمد خان نے بھی پوری متابعت سے کام لیا۔ جب بادشاہ تبت کی مہم پر گیا تو محمد خان نے اندرون ملک میں کوئی خرابی نہ ہونے دی۔ بلکہ ایسا انتظام کیا کہ بادشاہ نے واپس آکر اپنی دلی خوشنودی کا اظہار کیا۔

لیکن ایسے فرمانبردار اور منتظم و مدبر و سعادت نشان بھائی کو موت نے اس کے دست و بازو و کمزور کر دیئے۔ بھائی کے مرنے کا اس نے بڑا غم کیا۔ اور اس کے فرزند حیدر کو اس کا جانشین بنا کر اس کی دستار بندی کرائی اور بھائی کی جگہ مہمات ملکی کے تمام اختیارات اپنے بھتیجے کو سونپ دیئے۔

زونراج نے زینہ ترنگنی میں شہزادہ محمد خان کی موت کا جو سبب لکھا ہے اس کے متعلق دوسرے مورخین خاموش ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ایک شہزادے کو جلا وطن کر رکھا تھا۔ وہ کشمیر میں واپس آکر اپنے مصائب کا بدلہ اپنے دشمنوں سے لینا چاہتا تھا۔ لیکن اسے کوئی موقعہ نہ ملتا تھا۔ آخر وہ اس بہانے سے کشمیر میں داخل ہوا کہ وہ کسی بادشاہ کا پیغام بادشاہ کشمیر کے نام لے کر آیا ہے۔ لیکن جب وہ کشمیر میں داخل ہوا تو اس نے موقعہ پا کر شہزادہ محمد خان کو قتل کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جلا وطن شہزادہ محمد خان کے ایماء سے ہی جلا وطن ہوا ہوگا۔ یا ممکن ہے یہ وہی شہزادہ ہو جس کو سکندر بادشاہ کی بیگم شوبھا دیوی بنے لے پالک بنا رکھا تھا۔ اور جو مدت سے کشمیر سے جلا وطن تھا۔ اس کے بعد زونراج خاموش ہے۔ اور نہیں معلوم ہوسکتا کہ بادشاہ نے اپنے عزیز بھائی کے قاتل کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا۔ زونراج شہزادہ محمد خان کے اخلاق و عادات کی تعریف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ وہ بہت اچھے کیریکٹر کا ٹھاکر رئیس یا جاگیردار تھا۔ زونراج نے اپنی تاریخ ۱۴۵۹ء تک لکھی ہے۔ اس کے بعد اس کا انتقال

ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شہزادہ محمد خان کی موت ۱۴۵۹ء سے پیشتر ہو چکی تھی۔

بادشاہ کا بھانجا

بادشاہ کے بھانجے کا نام قیام الدین تھا۔ بادشاہ کو بھائی کی طرح اس کے ساتھ بھی بڑی محبت تھی۔ بادشاہ نے اسے سندھو (سندھ) کے ملک میں کسی حصے کا حاکم بنا کر بھیجا تھا۔ وہاں وہ ایک جنگ میں زبراہیم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اس کی موت پر ایسا محسوس کیا کہ گویا اس کا دایاں بازو کٹ گیا ہے۔

بادشاہ کے دودھ بھائی

بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی جب نگاہ دوربین سے چاروں طرف دیکھا تو اسے نظر آیا۔ کہ ملک میں فتنہ پردازوں کی ایک جماعت موجود ہے۔ جو اپنی ذاتی اغراض یعنی لوٹ مار کے لئے ملک میں شورش و سرکشی کے آثار پیدا کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے نہایت نرمی و ملائمت اور کمال حکمت و تدبر سے خون کا ایک قطرہ بہانے کے بغیر اس جماعت کے کئی سرکردہ لوگوں کو وظائف و جاگیر عطا کر کے یا تو اپنا فرمانبردار بنا لیا یا حکمت عملیوں سے کام لے کر ان کو ذلیل و خوار اور کمزور و بے جان کر دیا۔

لیکن فرقہ چکان ایسا عروج پا چکا تھا کہ اس کے بعض افراد جو کئی پشتوں سے سلاطین کے کوکہ یا رضاعی بھائی چلے آتے تھے۔ اور جو کشمیر میں دودھ بھائی کے نام سے مشہور تھے۔ سلطنت میں دخل انداز ہوتے تھے۔ اور اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے بعض اوقات بادشاہوں کے احکام کو بھی پس پشت ڈال دیتے تھے۔ زین العابدین ان کا تسلط وتغلب نائب السلطنت ہونے ہی کے زمانے سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ بادشاہ ہوگیا تو اس نے ان کا رعب وداب اور اثر ورسوخ کم کرنا شروع کر دیا۔

تاریخوں میں بادشاہ کے چار رضاعی بھائیوں کا ذکر ہے۔ دو کا ذکر تو زونراج نے زینہ ترنگنی میں کیا ہے۔ اور دو کا نام اس کے شاگرد شریور نے اپنی تاریخ زینہ راج ترنگنی میں لکھا ہے۔ زونراج لکھتا ہے۔ ایک کا نام مسعود اور ایک کا نام شیر تھا۔ لیکن یہ دونوں باہمی حسد وعداوت کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اور ہر چند یہ بادشاہ کی عنایات سے مرفع الحال تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کو ذلیل وخوار دیکھنے کے ہمیشہ خواہش مند رہتے تھے۔ بادشاہ نے ان کو بہت سمجھایا اور مراعات چھین لینے کی دھمکی بھی دی۔ اس خوف دلانے سے بادشاہ کی کوشش کچھ نہ کچھ کامیاب تو ہوگئی۔ اور انہوں نے باہمی مخالفت ترک بھی کردی۔ لیکن باطن دونوں کا صاف نہ ہو سکا۔

لیکن اس خدشہ کے مٹانے کا قدرت نے ایک اور سامان پیدا کر دیا۔ رات کا وقت تھا اور بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا۔ درباریوں میں ٹھاکر مسعود درجہ اختصاص رکھتا تھا۔ بادشاہ کے یہ دو بھائی بھی حاضر دربار تھے۔ باتوں باتوں میں کچھ ایسا سلسلہ چھڑا کہ ان دونوں کی ٹھاکر مسعود سے تکرار ہوگئی۔ مسعود ٹھاکر بھرے دربار میں بادشاہ کی

موجودگی میں اپنی بے عزتی نہ دیکھ سکا۔ اور دربار سے اُٹھ کر چلا آیا۔ اس وقت بدقسمتی سے نہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی اس کا کوئی آدمی اس کے ساتھ تھا۔ شیر بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ درباریوں نے اور بادشاہ نے بھی سمجھا کہ اب یہ اس کو منانے اور واپس لینے کے لئے جا رہا ہے۔ لیکن اس ظالم نے رات کی تاریکی میں تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ مسعود ٹھاکر کے بھائی کا نام وون ٹھاکر تھا۔ اس نے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بادشاہ سے اجازت طلب کی۔ بادشاہ بھی اپنے دودھ بھائی کی اس حرکت پر رنجیدہ خاطر تھا۔ اس نے اجازت دے دی۔ اور وون ٹھاکر نے نہ صرف شیر کو بلکہ اس کے ان ہمراہیوں کو بھی جو اس کے مقابلہ پر آئے قتل کر دیا۔

شریور نے بادشاہ کے جن دودھ بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نام حسن اور حسین تھے۔ وہ لکھتا ہے۔ جب حاجی خان نے ۱۴۵۲ء میں بادشاہ سے بغاوت کی اور باپ بیٹے میں لڑائی چھڑی تو بادشاہ کے رضاعی بھائی بادشاہ کی طرف سے شہزادہ کے بالمقابل نبرد آزما تھے۔ ان دونوں کے مقابلے میں دو راجپوت جو نہایت خوبصورت اور وجیہہ تھے، شہزادے کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ ایک کا نام سورن (٦) اور دوسرے کا نام سے سنہگیر (٧) تھا۔ لیکن یہ دونوں خوبصورت نوجوان حسن اور حسین کے ہاتھوں سے قتل ہو گئے۔

لیکن بادشاہ کے آخری ایام میں اس کے حقیقی بیٹوں کی طرح اس کے دودھ بھائیوں نے بھی اس کی زندگی تلخ کر دی۔ چنانچہ شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کے رضاعی بھائیوں نے جو بادشاہ کی عنایت سے ملک کے اعلےٰ عہدوں پر سرافراز تھے اور جن

سے بے وفائی کی توقع اسے خواب میں بھی نہ آسکتی تھی۔اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔اوراس کے باغی بیٹے حاجی خان کے پاس پونچھ میں چلے گئے۔

حواشی:

(۱) آپ کا سلسلہ نسب چار واسطوں سے سید جلال الدین بخاریؒ سے ملتا ہے۔ فتحیات کبرویہ قلمی صفحہ ۳۱۲۔

(۲) دیکھو ضمیمہ ٦۔

(۳) شریور نے بیہقی بیگم کا نام وداع خاتون لکھا ہے۔ وداع تو الوداع اور رخصت کو کہتے ہیں۔ اس لئے وداع یا وداہ ضرور کوئی بگڑا ہوا نام ہے۔ جیسا کہ زینہ ترنگنی اور زینہ راج ترنگنی میں اور بھی کئی ایسے نام آتے ہیں۔ جن کا تلفظ سنسکرت میں جا کر بدل جاتا ہے۔ اور پھر ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہوئے کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔

(۴) مدر دیش کے مفصل حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۳

Kings of Kashmir Page 86 Vol. III

Like Dasharatha the king had four sons given unto him and they were the delight to the people,and were born of the two daughters of the king of madra.

(۵) قرلغ کسی فرقے یا کسی قوم کا نام ہے۔ کشمیر کے مسلمان مورخوں نے نہ سلطان زین العابدین کی کسی بیٹی کا ذکر کیا ہے اور نہ اس کے کسی نواسہ کا۔ اس لئے ان کے ہاں تو قرلغ کا لفظ ہی نہیں ہے۔ شریور نے بھی صرف اسی قدر لکھا ہے کہ ہیبت خان بادشاہ کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ البتہ ہیبت خان کی قبر پر اس کے نام کے ساتھ قرلغ کا لفظ درج ہے۔ توزک جہانگیری میں جہانگیر نے پکھلی کا ذکر کرتے ہوئے تھوڑی سی روشنی اس لفظ پر ڈالی ہے۔ دیکھو تاریخ کشمیر جلد دوم ص ۲۶۰ تا ۲۶۳۔

(٦) Swarna

(۷) Suihanagar

ساتواں باب

بادشاہ کے فرزند حاجی خان کی بغاوت اور باپ بیٹے کی جنگ

شہزادوں کی باہمی خانہ جنگیاں

اپنے فرزندوں کی باہمی خانہ جنگیوں اور عداوتوں کی وجہ سے بادشاہ کے آخری ایام بڑے تلخ گزرے۔ ادہم خان سب سے بڑا تھا۔ اور اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بادشاہ کو بہت عزیز تھا۔ لیکن اپنی شرارتوں اور شوخ چشمیوں سے ہمیشہ اس کی دل آزاری کا باعث بنا رہتا تھا۔ منجھلے بھائی حاجی خان سے جس میں اکثر لڑپن کی عادتیں پائی جاتی تھیں، اس کی سخت عداوت تھی۔ تیسرا بیٹا بہرام خان بھی اپنے دونوں بھائیوں سے صاف نہ تھا۔ بادشاہ کے رضاعی بھائیوں نے جو شہزادوں کے اتالیق تھے۔ اپنے اغراض کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا دشمن بنا رکھا تھا اور افسوس ہے کہ نہ وزراء اور نہ خود بادشاہ شہزادوں کی باہمی کشیدگی کو کسی طرح دور کر سکے۔ جب شہزادوں کے باہمی

رشک وحسد نے ایک خوف ناک اور تباہ کن صورت اختیار کرلی۔تو ملک میں تین پارٹیاں تینوں شہزادوں کی اور ایک پارٹی بادشاہ کی ہوگئی۔اور طاروں طرف بدامنی اور فتنہ وفساد کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

شہزادہ ادہم خان کی روانگی بجانب پونچھ

رفع شر کے لئے بادشاہ نے اپنے بڑے فرزند ادہم خان کو پرنوتس (پونچھ) کی طرف روانہ کر دیا اور کہا کہ اگر تم میرے احکام سے روگردانی کرو گے تو تمہاری عزت و دولت اور زندگی سب خطرے میں ہے۔شہزادے نے اپنے آدمیوں سے بہ حسرت رخصت طلب کی اور کہا مجھے بادشاہ نے جلاوطن کرکے پرتونس (پونچھ) جانے کا حکم دیا ہے۔اس لئے آج سے میرا تمہارا ساتھ چھوٹتا ہے۔شہزادے کے آدمیوں نے کہا ہم مرنا قبول کرینگے۔لیکن آپ کا ساتھ نہیں چھوڑینگے۔اور نہ آپ کے بے رحم بھائیوں کے رحم پر ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔

ادہم خان مہم تبت پر

آخر شہزادہ اپنی جماعت سمیت پونچھ چلا گیا۔لیکن حاجی خان برابر اس کے درپے رہا۔جب بادشاہ نے دیکھا کہ ادہم خان کی جلاوطنی کے باوجود حاجی خان اس کے پیچھے اپنے آدمی بھیج رہا ہے۔تو اس نے ادہم خان کو واپس اپنے پاس بلا لیا۔ان

ہی ایام میں تبت سے شورش اور فساد کی خبریں آرہی تھیں۔ بادشاہ نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر ادہم خان کو ایک جرار لشکر دیا۔اور بغاوت تبت کے فرد کرنے کے لئے دار الحکومت سے بہت دور بھیج دیا۔ ادہم خان ہوا کی طرح گیا اور ملک کو تہہ و بالا اور باغیوں کا قلع قمع کر کے بگولے کی طرح واپس آگیا۔ بلکہ بہت سا مال غنیمت بھی بادشاہ کے پاس لایا اور اپنی مردانگی وشجاعت اور فتح ونصرت کی بدولت نوازش ہائے خسروانہ کا مورد ہوا۔ ادہم خان کے اس طرح مظفر ومنصور واپس آنے اور دوبارہ بادشاہ کی نظروں میں وقار وعزت حاصل کرنے سے حاجی خان کو بڑا صدمہ ہوا۔ بھائیوں کی کدورت لڑائی کی صورت میں ظاہر ہونے والی ہی تھی کہ بادشاہ نے حاجی خان کو لوہر (علاقہ پونچھ) کے پہاڑوں کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔

بادشاہ جانتا تھا کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔اس لئے کبھی ادہم خان کو پونچھ اور کبھی حاجی خان کو پونچھ یا دیگر مقامات پر بھیج دیا کرتا تھا۔

شہزادہ حاجی خان کی بغاوت

دراندازوں اور فتنہ پروروں کا کام اسی وقت تک چل سکتا ہے جب تک فریقین میں بدمزگی ونفاق قائم رہے۔ چنانچہ مفسدوں اور خودغرضوں نے حاجی خان کو باپ اور بھائی کے کلاف بھڑکانا شروع کیا۔

شریور پنڈت لکھتا ہے۔ ۲۸ لوکک (۱) کا ذکر ہے۔ حاجی خان کے ایک مصاحب لول راوتر (۲) نے اس سے کہا کہ آپ کے بڑے بھائی اور ان کے مشیر

کشمیر میں عیش کر رہے ہیں۔اور بادشاہ کی قربت ومصاحبت کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ اور ہم ان پہاڑوں میں خراب وکستہ پھر رہے ہیں۔آپ کو خیال ہے کہ ہم تنہا ہیں۔یہ غلط ہے۔کشمیر میں راجا نک (۳) پرتھی ہار اور کولج مار گا پتی جو نہایت طاقتور اور صاحب اثر ہیں۔ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ہم کو قسمت آزمائی کے لئے پہاڑوں سے باہر نکلنا چاہیئے۔ہم ادہم خان کو ناکوں چنے چبا سکتے ہیں۔علاوہ ازیں راجپوری (راجوری) کے لوگ ہمارے خیر خواہ ہیں۔اور اگر خدانخواستہ ہم ناکامیاب بھی ہو گئے تو بادشاہ رحم دل ہے۔ہم معافی طلب کر لینگے۔اور وہ ہمیں ضرور معاف کر دیگا۔لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم بہادر سپاہی جو آپ کے جان نثار ہیں،آپ کی فتح مندی کی خاطر جان ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں۔

حاجی خان نے اپنے دو اور مشیروں سے بھی اس امر میں مشورہ طلب کیا۔جن میں ایک سفیری ڈامر اور دوسرا تاج تانترے تھا۔انہوں نے حاجی خان کو اس ناشائستہ حرکت سے منع کیا اور کہا کہ آپ کو جن لوگوں نے اس قسم کے مشورے دیئے ہیں۔وہ خود غرض ہیں۔اور ملک کے امن وامان کے دشمن ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اہل وعیال کی محبت نے کشمیر جانے کے لئے بےتاب کر رکھا ہے۔آپ ذرا غور فرمائیے۔ہم ایسے بادشاہ کو کیسے شکست دے سکتے ہیں جو آپ کا باپ ہو اور ابھی زندہ ہو اور طاقتور حکمران ہو۔یاد رکھئے کوئی شخص اس وقت تک کشمیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ زندہ ہے۔بادشاہ کو اپنی سعادت مندی سے خوش رکھو۔تاکہ آرام واطمینان اور دولت وحکومت آپ کے استقبال کے لئے فرش راہ بنیں۔

ہمارے اور کشمیر کے درمیان بلند ترین پہاڑ واقع ہیں۔اس لئے اس محفوظ ملک پر جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔اور جو بادشاہ نے اپنی خوشی سے آپ کو سونپا ہے کوئی حملہ آور نہیں ہو سکتا۔آپ یہاں آرام سے بیٹھے رہیے۔بادشاہ ہم سے اور ہم

بادشاہ کی زد سے بہت دور ہیں اور ایک کو دوسرے سے تعرض بھی نہیں۔اس لئے نہ بادشاہ کو پریشان کیجئے اور نہ بلا وجہ مصیبتوں کو دعوت دیجئے۔

لیکن حاجی خان پر ایسے دانش مندانہ مشورے کا کوئی اثر نہ ہوا۔باپ کی زندگی ہی میں اس کے سر پر بادشاہ بننے کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔اور اس کے خود غرض مصاحب مبارک سلامت کے نعروں سے اس کو باپ اور بھائی سے جنگ کرنے پر آمادہ کرر ہے تھے۔چنانچہ وہ راجپوری کو ایک طرف چھوڑ کر سیدھا ہور پور (۴) آیا۔

باپ بیٹے میں جنگ کی تیاریاں

بادشاہ کو بھی حاجی خان کی حرکات وسکنات کا پتہ لگ رہا تھا۔وہ اپنی فوج لے کر دارالحکومت سے باہر نکلا۔بادشاہ سب سے آگے تھا۔فوج اس کے پیچھے پیچھے تھی۔اس کو اپنی ضعیف العمری اور اپنے روحانی صدمات کی وجہ سے اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔اس لئے اس نے حکم دیا کہ یہ شعر سب لوگ پڑھتے جائیں۔یہاں صرف شعر کا مطلب ہی لکھا جاتا ہے۔

"جنگ کا خطرہ ہمیشہ ایک قسم کا الام ہوتا ہے۔اور جب کسی کو یہ خطرہ اپنے بیٹے ہی سے ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اس بدنصیب باپ کی زندگی ختم ہو چکی ہے"(۵)۔

جس گاؤں سے اور جس راستہ سے بادشاہ کا گزر ہوتا سب لاگ اس کی فتح و ظفر کی دعائیں مانگتے اور کہتے افسوس ہے ایسے نیک دل اور انصاف کے دیوتا بادشاہ کو اس کے نالائق بیٹے نے بُرے مصاحبوں کی صحبت کی وجہ سے تکلیف دے رکھی ہے۔

بادشاہ اس قسم کی دعائیں لیتا آخرایک مقام سوپرش (٦) میں پہنچ گیا۔

بادشاہ کا پیغام باغی بیٹے کے نام

جب باپ اور بیٹے کی فوجیں مل شلا کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں۔تو خون پدری جوش میں آیا۔اور بادشاہ نے خلق خدا کو خون ناحق سے بچانے کے لئے اپنے ایک معتبر برہمن کو بیٹے کے پاس پیغام دے کر بھیجا۔

''اے فرزند! والدین ثمر دار درخت کی مانند ہوتے ہیں اور اولاد اس درخت کا پھل ہوتی ہے۔اولاد کا فرض ہے کہ والدین کو خوش رکھے۔ان کی متابعت کرے اور بڑھاپے میں ان کا سہارا ہو۔لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو کیا سعادت منداولاد ایسا ہی کیا کرتی ہے۔تم سے مجھے جو امیدیں تھیں۔کیا تم نے ان پر پانی نہیں پھیر دیا۔تم مفسد،شریر اور بدمعاش لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہو۔اور میرے دشمنوں اور ملک کے امن و امان کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہو۔یہ تمہارے لئے کہاں تک مناسب ہے۔میری اطاعت سے منحرف ہو کر اور باپ سے بغاوت اور سرکشی کر کے کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔اور میرے ہمسایہ ملکوں میں مجھے بدنام کرتے ہو۔یاد رکھو یہ سرکش کھش قبیلہ جو تباہی اور لوٹ مار کے لئے ہمیشہ کمر بستہ رہتا ہے۔زیادہ دیر تک تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔تم میری اجازت کے بغیر کیوں لوہر کوٹ سے باہر نکلے۔اور کشمیر کی طرف بُری نیت سے آئے۔

سنو اور خوب غور سے سنو۔اگر میری قسمت میں ابھی اور کچھ دن اس ملک کی

حکومت لکھی ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔تم وادی کشمیر سے باہر کے پہاڑی ملک پر حکومت کر رہے ہو۔کیا وہ تمہارے لئے کافی نہیں اور اگر نہین تو کیا باپ کا ملک چھین کر دنیا میں روسیاہی حاصل کرنا چاہتے ہو۔اے فرزند! اس قسم کے باغیانہ اور احمقانہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔دو فوجوں کا اور باپ بیٹوں کا آپس میں جنگ کرنا اور اس جنگ میں ملک کے ہزارہا آدمیوں کا مارا جانا کیا تمہیں پسند ہے۔اور کیا یہ ناقابل عفو گناہ تم اپنے سر لینے کے لئے تیار ہو؟''

اسی قسم کے الفاظ کہہ کر برہمن نے کہا بادشاہ کا پیغام تو ختم ہو گیا۔اب میری ایک گزارش ہے۔اس پر بھی غور فرمایئے۔اور وہ یہ ہے کہ میں آپ کو سچ سچ کہتا ہوں۔جس طرح ایک چڑیا کی حقیقت ایک شاہین کے سامنے ہے۔اسی طرح آپ کی فوج خواہ وہ بہادری میں کیسی ہی لاف زنی کرے۔بادشاہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

بادشاہی ایلچی پر شہزادے کے آدمیوں کا ظلم

حاجی خان اس وقت سخت تذبذب میں تھا۔وہ بادشاہ کے اس پیغام سے متاثر بھی تھا اور اپنی خودسر فوج سے بھی ڈرتا تھا۔ابھی وہ کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکا تھا۔کہ اس کے سپاہیوں میں سے چند ایک عاقبت نا اندیشوں نے برہمن کے الفاظ کو اپنی توہین تصور کر کے اس کے کان کاٹ ڈالے اور سب نے اس کے خون سے اپنی پیشانیوں پر تلک لگائے۔

شہزادے پر باپ کے پیغام کا اثر

حاجی خان فوج کے آدمیوں کو تو کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن ان کی پاجیانہ حرکت پر جو ایک سفیر کے ساتھ کی گئی تھی۔ اور جو آئین سفارت کے بالکل خلاف تھی۔ وہ بھی نادم ہوا۔ اس نے پنڈت کی دلجوئی کی۔ اور ابھے منیو نام پرتھی ہار کے پاس جو اس کا مشیر تھا مشورہ کرنے کے لئے گیا۔ اور کہا مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے باپ اور بادشاہ کے پاس معذرت طلب کرنے کیلئے جاؤں۔ وہ یقیناً میرے ساتھ پدرانہ شفقت سے کام لے گا۔ میرا بڑا بھائی میرے مدمقابل ہے اور باپ لڑائی کے لئے آمادہ ہے۔ میں پدرکش اور برادرکش کہلانا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں اب لڑائی نامناسب ہے۔ میرے باپ نے ہمیشہ میری خطاؤں کو معاف کیا ہے اور وہ اب بھی مجھے معاف کرے گا۔

شہزادے کی بے بسی اپنے خودسر افسروں کے سامنے

جب تاج تانترے اور دوسرے فوجی افسروں اور مصاحبوں کو شہزادے کے ان خیالات کا علم ہوا۔ تو انہوں نے شہزادے کو درست اور ناملائم الفاظ میں مخاطب کر کے کہا۔ جب پہلے پہل ہم نے تم کو باپ کے ساتھ جنگ کرنے سے منع کیا۔ تو تم نے ہماری ایک نہ سنی۔ اب جب کہ بادشاہ ہم کو اپنا دشمن اور بدخواہ سمجھ چکا ہے۔ اور

مفسد اور شریر بتا رہا ہے۔ تو ہم لوگوں کو آگ میں دھکیل کر خود علیحدہ ہو رہے ہو۔ اگر تم باپ بیٹوں میں صلح ہوگئی تو بتایئے ہمارا کیا حشر ہوگا۔ کیا ہمیں چن چن کر قتل نہ کیا جائے گا۔ لڑائی ہونے دیجئے۔ اگر ہم لڑائی جیت گئے تو سارے ملک کے آپ ہی بادشاہ ہونگے۔ اور اگر ہم ہار گئے تو آپ پھر بھی معذرت طلب کرکے بادشاہ کے پاس جا سکتے ہیں۔ ہم لوگ اب جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے ہوئے ہیں۔ یا مر جائیں گے یا ماریں گے۔ اگر ہمارے مشورے پر آپ نے عمل نہ کیا اور باپ کے دھوکے میں آگئے تو ہم کسی معاملہ میں آپ کا ساتھ نہ دینگے۔

جب شہزادے نے اپنے فوجی افسروں کی یہ دھمکیاں سنیں تو وہ بہت گھبرایا۔ بلکہ اس کو اپنی جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ آخر اس نے ہر چہ بادا باد کہہ کر بادل ناخواستہ لڑائی کی منظوری دے دی۔

مل شیلا کے مقام پر خونریز لڑائی

جب بادشاہ کا ایلچی کان کٹوا کر واپس آیا تو بادشاہ اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے اپنے کیمپ کے گرد ایک گہری کھدائی کروائی اور خود ایک بلند ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ دونوں فوجیں اس کے سامنے تھیں۔ مل شیلا کے مقام پر سامان حرب کے شوروشر اور گولوں اور بندوقوں کی آواز سے آسمان گونج اٹھا۔

شریور زینہ راج ترنگنی میں اس لڑائی کی چشم دید کیفیت لکھتا ہے۔ ہم اس کے الفاظ میں مختصر طور پر یہاں اس لڑائی کا کچھ حال لکھتے ہیں۔

حاجی خان لڑنے کو تو لڑ رہا تھا مگر اس کی فوج کے ڈھول اور باجوں کی آواز سے یہ صدا آرہی تھی کہ میرا دل لڑنے کو نہیں چاہتا۔ لیکن فوج کی خودسری کی وجہ سے مجبور ہوں۔ شریور لکھتا ہے۔ کہ پرتھی ہار اور حاجی خان کے دوسرے افسروں کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اتنے میں بادشاہ کے دو ٹھاکر حسن اور حسین نام جو بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے، دست بدست لڑائی کے لئے فوج سے باہر نکلے۔ ان کے مقابلہ پر دو وجیہہ اور نوجوان راجپوت سورن اور سے ہنگر دوسری طرف سے آئے۔ ان میں دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ آخر دونوں راجپوت مارے گئے۔

اس موقع پر طرفین کی فوجیں اپنے افسروں کے احکام کے مطابق کبھی آگے بڑھتی اور کبھی پیچھے ہٹتی تھیں۔ شریور لکھتا ہے۔ فوجی نقاروں کی آواز اور ان کی دل ہلا دینے والی گونج جس سے اردگرد کے پہاڑ بھی لرز جاتے تھے۔ میں نے اس سے قبل کبھی نہ سنی تھی۔ فوج میں مرنے مارنے کا جوش ظاہر کر رہا تھا کہ ان کو اپنی سدھ بدھ ، اہل وعیال کی خبر اور گھربار کا کچھ خیال نہ تھا۔ ان حالات میں بادشاہی افواج نے پورا حق نمک ادا کیا۔ تیروں کی بوچھاڑ طرفین سے بارش کی طرح جاری تھی۔ مل شیلا کا میدان انسانی خون سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔

باغی شہزادہ حاجی خان کی شکست

طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک لڑائی ہوتی رہی۔ شہزادے کی فوج نے بہادری دکھائی۔ لیکن یہ فوج بادشاہی فوج کی تاب نہ لاسکی۔ شہزادہ بچی کچھی فوج

لیکر ہیرا پور کے رستہ پونچھ کو روانہ ہوگیا۔ اس لڑائی میں اس کے بہت سے نامی سردار مر چکے تھے۔ تاہم پسپائی کے دوران میں اس نے ایک مقام پر سب کو جمع کیا۔ اور اپنے کیے پر بہت دیر تک افسوس کرتا اور پچھتاتا رہا۔ رات اس نے ایک پہاڑی پر بسر کی۔ اور اپنے آخری فیصلہ کے مطابق وہ پونچھ جانے کی بجائے چتر ادیش (۷) میں چلا گیا۔

ادہم خان اپنے بھائی حاجی خان کی گرفتاری کے لئے اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔ مگر بادشاہ نے جو دونوں کی باہمی عداوت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ادہم خان اسی بہانے سے اسے ہلاک کردے گا۔ ادہم خان کو تعاقب کرنے کی اجازت نہ دی۔ بلکہ بادشاہ نے حکم جاری کردیا کہ کوئی شخص شہزادے کا پیچھا کرکے اس کو دق نہ کرے۔

باغیوں کے سروں کا بلند مینار

بادشاہ نے اپنی انتہائی رحم دلی کو اپنی عاقبت نااندیشی پر محمول کیا۔ اور حکم دیا کہ میدان جنگ میں جس قدر باغی قتل ہوگئے ہیں، اس سب کے سروں کو دارالحکومت میں جمع کیا جائے۔ اور ان سے ایک بلند مینار قائم کیا جائے۔ تاکہ پھر کسی اور ناخلف بیٹے یا کسی سرکش رئیس کو بغاوت کی جرأت نہ ہوسکے۔ بلکہ قیدیوں میں سے بھی بہت سے آدمی قتل کیے گئے۔ اس قسم کی سزاؤں کا نتیجہ ہی ہوا کہ بہت سے لوگ حاجی خان

سے خود بخود علیحدہ ہو گئے۔

شریور لکھتا ہے۔اس جنگ میں جو باپ بیٹے کے درمیان ملک کے بدخواہوں نے جاری کرا رکھی تھی، جانبین سے ملک کے بڑے بڑے نامور فوجی افسر اور ملکی مدبر قتل ہو گئے۔

حواشی:

(۱) مراد ۴۳۲۸ سنہ لوکک مطابق ۸۵۶ھ موافق ۱۴۵۲ سنہ ء۔

(۲) راؤتر سے راتھر یا راٹھور مراد ہے۔

(۳) راجہ نک سے رینہ اور مارگا پتی سے قوم ماگرے مراد ہے۔

(۴) موجودہ نام ہیرپور یا ہرپور بجانب شوپیان تحصیل کولگام۔

(۵) اصل شعر معلوم نہیں کہ کس زبان میں تھا۔ فارسی میں یا سنسکرت میں۔ ہم نے زینہ ترنگنی کے انگریزی ترجمہ سے صرف اس کا مفہوم یہاں لکھ دیا ہے۔

(۶) موجودہ نام شوپیان۔

(۷) چترادیش کہاں ہے اور چترا کس ملک کا نام ہے۔ اس کے متعلق کوئی مزید واقفیت بہم نہیں پہنچ سکی۔

آٹھواں باب

ولی عہد کی بغاوت اور جلاوطنی

ولی عہد سلطنت ادہم خان کا کیرکٹر

بادشاہ کا بڑا بیٹا ادہم خان باپ کا منظور نظر بلکہ ولی عہد تھا۔ بادشاہ نے امور ملکی اور مہمات سلطنت میں بھی اس کو شامل کر لیا۔ لیکن اس قسم کے مراحم خسروانہ اور شفقت پدررانہ نے ایک نا اہل پر کوئی اچھا اثر نہ ڈالا۔ وہ بھائی سے انتقام لینے کے لئے ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ اور باپ کے منع کرنے کے باوجود بھی یہ خیال اس کے دل سے نہ نکلتا تھا۔

شر یور پنڈت نے اس کے خصائل اور خد وخال کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی عہد کے غرور اور اس کی اخلاقی برائیوں نے اس سے بہت سے نامناسب اور ناواجب کام کرائے۔ وہ لکھتا ہے۔

علم اور عالموں سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ کتوں کے ساتھ اس کو بہت محبت تھی۔ شکار کا بہت شوقین تھا۔ اس کے محلات میں عورتوں کی کثرت تھی۔ ادنے خصلتوں کے لوگ اس کی سرکار میں ملازم تھے۔

کامراج کے علاقے میں اس نے لوگوں پر اس قدر تشدد کیا کہ کسی کے پاس نقد و جنس قسم کھانے کو بھی نہ رہا۔ عوام اس کے ظلم سے چیخ اٹھے۔ اس کی لوٹ نے گھروں کے گھر تباہ کر دیئے۔ جو لوگ خاندانی یا رئیس تھے، ان میں سے کسی کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے، کسی کو کوئی اعلیٰ عہدہ دلانے اور کسی کو کسی بہانے سے لوٹ لیا۔ اس کے اور اس کے ملازموں کے ہاتھوں۔ دیہاتیوں کی بہو بیٹیاں اور عورتوں اور لڑکیوں کی عصمت محفوظ نہ تھی۔

بادشاہ نے جب بیٹے کے مظالم کے یہ حالات سنے تو اس قدر صدمہ محسوس کیا کہ کئی دن تک کھانا نہ کھایا۔ ادہم خان ابھی کامراج میں ہی تھا کہ بادشاہ نے اس قسم کی بدکرداریوں سے باز رکھنے کا اسے پیغام بھیجا۔ شہزادے کے آدمیوں نے بادشاہ کے مخبروں کو شہزادے سے ملنے بھی نہ دیا۔ اور پیغام سن کر یہ کہا کہ بادشاہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ مرنے کے قریب ہے۔ وہ یوں ہی شور مچاتا رہے گا۔

حاجی خان کی شکست کے بعد ادہم خان پانچ سال تک بڑے استقلال سے بادشاہ کا ولی عہد بن کر رعایا پر ظلم کرتا رہا۔ بادشاہ کبھی اس کو اس کی حرکات ناشائستہ سے منع کرتا اور کبھی محبت پدری اور مصلحت ملکی کے باعث مخلوق خدا کو جنگ کی مصیبتوں سے بچانے کے لئے اس کی گستاخیوں اور بدکرداریوں کو نظر انداز کر دیتا۔

ادہم خان کی بغاوت

شہزادہ جانتا تھا کہ بادشاہ اب چراغ سحری ہے۔ اس لئے عمداً اور علانیہ

باپ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا۔اس کے مصاحبوں اور فوجی سرداروں نے اس کو بادشاہ کے خلاف یہاں تک بھڑکایا کہ اس نے بہت سا لشکر جمع کر کے باپ پر حملہ کرنے اور اس کو گرفتار کر کے خود بادشاہ بننے کے لئے قطب الدین پورہ میں جہاں اس کے محلات تھے، ڈیرے ڈال دیئے۔ بادشاہ کو بھی اس کی اس نالائق حرکت کا علم ہو چکا تھا۔اس نے بھی اپنی فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ دونوں فوجوں کی تیاریوں سے شہر خصوصاً جینا نگر (۱) میں جو بادشاہ کا دار الحکومت تھا اور جس کو تباہ کرنے کے لئے ادہم خان نے یہ لاؤ لشکر جمع کیا تھا۔لاگ اپنی جانوں کی سلامتی کے لئے دست بدعا تھے۔

بادشاہی حکم سے زینہ کدل کا انہدام

بادشاہ نے وتستہ پر ایک پل بنام زینہ کدل اپنے نام پر تیار کرایا تھا۔اس پر لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے چار برج تھے۔اور شریور پنڈت کے قول کے مطابق اس سڑک پر جو دردستان سے شہر میں آتی تھی۔ یہ دسواں پل تھا جو مضبوط تھا۔لیکن ادہم خان کے اس حملے میں یہی پل جو اس نے بڑے شوق سے تعمیر کرایا تھا اس کے لئے سب سے زیادہ خطرے کا باعث ہو رہا تھا۔بادشاہ نے وزراء کے مشورے سے نہایت رنج وقلق کے ساتھ اس پل کو گرانے کا حکم دیا اور چونکہ یہ پل بہت مضبوط تھا اس لئے بڑی مشکل سے گرایا جا سکا (۲)۔

اس موقع پر فارسی مورخوں نے لکھا ہے۔کہ آخر بادشاہ نے اس کو سمجھا بجھا کر ملاقات کرنے کے بغیر ہی کامراج میں واپس جانے کا حکم دیا۔لیکن شریور پنڈت

جس کی آنکھوں کے سامنے یہ تمام واقعات ہوتے رہے۔ لکھتا ہے۔ جب ادہم خان نے دیکھا کہ پل ٹوٹ چکا ہے تو محاصرہ ترک کر کے خود بخود واپس کامراج چلا گیا۔ اور یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پل ٹوٹ جانے کے بعد عبور کرنے کے لئے بہت سی جانیں ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

حاجی خان حاکم پونچھ کے نام بادشاہ کا مکتوب

ہر چند ادہم خان پل کی شکستگی کے بعد شکستہ دل ہو کر واپس چلا گیا لیکن بادشاہ اس کے ارادوں سے غافل نہ تھا۔ اس بے چارگی کے عالم میں جبکہ ضعیف العمری کے ساتھ اس کے فرزند کی بغاوت اس کے لئے سوہان روح ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے حاجی خان کو جو اس کے حکم سے پونچھ ہی میں بہ ظاہر حاکمانہ مگر بہ باطن جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، یاد کیا۔ اور اسے ذیک کا خط لکھ کر اپنے پاس بلایا۔

"اے فرزند من مجھ پر عمر کی اس آخری منزل میں مختلف قسم کے مصائب نازل ہو رہے ہیں۔ جن کی مدافعت بظاہر بہت مشکل نظر آ رہی ہے۔ اس وقت جبکہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ مجھے خدائے برتر و توانا کی ذات کے بعد تمہارے سوا اور کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ تم جس حال میں ہو کسی تاخیر کے بغیر میرے پاس آ جاؤ۔ اگر تم نے غفلت اور کوتاہی سے کام لیا تو قیامت کے دن میں اپنے مصائب کے لئے تمہارا دامنگیر ہوں گا۔ میری موت کے بعد تمہارا یہاں آنا محض بیکار ہے۔ میری زندگی کے آخری لمحوں میں میرا سہارا بنو۔ جو یقیناً تمہارے لئے بہت اچھے نتائج پیدا

کریگا"۔

حاجی خان اس وقت سدوارن (۳) کے علاقے میں مقیم تھا۔ باپ کا خط پڑھتے ہی وہ کشمیر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب وہ اپنی فوج سمیت ورمل (۴) کے نزدیک آیا۔ اور بادشاہ کو خبر ہوئی۔ تو اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے بہرام خان کو اس کے استقبال کے لئے بھیجا۔ دونوں بھائی بڑے تپاک سے ملے۔ اور حاجی خان نے اپنے چھوٹے بھائی سے بغلگیر ہوکر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

سوپور میں جنگ عظیم

گومراج کے علاقہ میں ادہم خان کی حکومت تھی۔ مگر سوپور سرکاری علاقہ میں شامل تھا۔ ادہم خان نے دریا کو عبور کرکے کامراج کے شاہی برگیڈ کے ساتھ جو وہاں مقیم تھا، جنگ کی۔ دردستان اور باقی اطراف کے لوگوں نے خونخوار ادہم خان کے خوف سے بھاگنا شروع کیا۔ اسی افراتفری میں بہت سے آدمی دریا میں غرق ہوگئے۔ لاشیں دریا میں تیرتی نظر آتی تھیں۔ اور وہاں کا پانی خون کی کثرت سے لالہ رنگ بنا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ دریا کو عبور کرتے ہوئے ادہم خان نے دست بدست لڑائی کرکے بادشاہی آدمی مدت کے گھاٹ اتار دیئے۔

جب باپ کو خبر ہوئی کہ فرزند سعادت مند یہاں سے چپ چاپ چلا گیا ہے مگر سوپور میں جاکر کھیل کھیلا ہے۔ تو اس کی تنبیہ کے لئے باہر نکلا۔ رستہ میں اس نے ایک جماعت عظیم کو دیکھا۔ جس میں اکثر زخمی تھے۔ کسی ایک کے پاؤں جلے ہوئے

تھے۔ بہت سے شور وغوغا اور واویلا کر رہے تھے۔ ان میں کئی ایسے تھے جن کے دیہات اور مال واسباب کو ادہم خان نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا۔ ان مظلوموں کو اس حال میں دیکھ کر بادشاہ کے دل پر بڑا اثر ہوا۔

جب بادشاہ کے ہاں ادہم خان پیدا ہوا تھا تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ سارے شہر میں چراغاں ہوا۔ جشن شاہانہ نے شہر کو عروس البلاد بنا دیا تھا۔ لیکن کیا خبر تھی۔ یہی بچہ جوان ہو کر دشمن جان ثابت ہوگا ؎

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائیگا
دوست کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائیگا

اس موقعہ پر شریور لکھتا ہے۔ ''نالائق فرزند غیر ممالک کو فتح کرنے کی بجائے اپنے ہی باپ کے ملک کو غارت کر رہے تھے۔ جس طرح خود غرض لوگوں نے ولی عہد کے زمانے میں بادشاہ بڈشاہ کو اس کے بڑے بھائی علی شاہ سے لڑا دیا تھا۔ اور آخر علی شاہ گرفتار ہو کر ایک ملک کے بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہو گیا تھا۔ اسی طرح بد باطن اور سیاہ دل لوگ بادشاہ کو اور اس کے بیٹوں کو باہم لڑا رہے تھے۔ اس کے فرزندوں کے باہمی حسد نے بادشاہ پر اس کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ خدا کرے کسی بادشاہ کے ہاں ایک سے زیادہ فرزند نہ ہوں''۔

حاجی خان پونچھ سے کشمیر میں

غرض باپ اور بیٹے کی فوجیں سوپہ پور (سوپور) میں وتستہ کے دونوں

کناروں پر تھیں۔ادہم خان کا لشکر دریا سے پار کامراج کے علاقے میں تھا اور بادشاہ کی فوج سنگرامہ سے لیکر سوپور کے درمیان تین میل کے دوران میں پھیلی ہوئی تھی۔اس موقعہ پر حاجی خان بھی اپنی فوج لے کر آپہنچا۔بادشاہ نے تین سال کے جلاوطن فرزند کو فرط مسرت کے ساتھ چھاتی سے لگایا۔اور اسے آئیندہ کے لئے بہت سی توقعات دلائیں۔

ادہم خان کی فراری اور جلاوطنی

جب ادہم خان نے سنا کہ حاجی خان بھی پونچھ سے فوج لے کر باپ کی امداد کے لئے آپہنچا ہے۔اور بادشاہ نے بہرام خان کو اس کے استقبال کے لئے بارہمولا تک بھیجا ہے۔تو اس پر ایس خوف غالب آیا کہ وہ لڑائی کرنے کے بغیر ہی فوج سمیت میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔اور شاہی بھنگ کی راہ سے دریائے سندھ(۵) (اٹک) کو عبور کر گیا۔

بادشاہ سوپور آیا۔اس نے عرایا کے زخموں پر تسلی وتشفی کا مرہم رکھا۔جو کچھ ہوا اس پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا۔خدا کو یہی منظور تھا کہ ان تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد تمہیں امن وامان نصیب ہو۔

بادشاہ اپنے سب سے بڑے فرزند کو ملک بدر کر کے اور شکست دے کر اپنے دوسرے دونوں فرزندوں سمیت دارالحکومت میں واپس آ گیا۔

حواشی:

(۱) جینا نگر یا زینہ نگر عرف دارالحکومت نوشہرہ کا ذکر شاہی تعمیرات کے سلسلہ میں تفصیل سے ہوگا۔

(۲) یہ واقعہ ۴۴۲۵ء لوکک کا ہے۔ جس کے مطابق انگریزی ۱۴۵۹ء اور ہجری ۸۶۳ھ بتایا جاتا ہے۔

(۳) سدورن کا تلفظ انگریزی میں اس طرح لکھا ہے Sadvarana ۔ یہ وہی مقام ہے جس کا موجودہ نام سورن ہے۔ اور پونچھ کی تحصیل مہینڈر کا سرد ترین اور فرحت بخش مقام ہے۔

(۴) درہ مل کا موجودہ نام بارہمولہ ہے۔ جو جہلم ویلی روڈ پر شمالی کشمیر کے مشہور ضلع کا صدر مقام ہے۔

(۵) فارسی مورخوں نے لکھا ہے کہ ادہم خان آخر جان سلامت لے کر نیلاب (دریائے اٹک) کی طرف بھاگ گیا اور شاہی بھنگ شاید شاہیہ خاندان (اودبانڈ پور) کے کسی علاقہ کا بگڑا ہوا نام ہو۔

نواں باب

حاجی خان کی ولی عہدی کا اعلان اور اس کا کیریکٹر

حاجی خان کی ولی عہدی کا اعلان

بادشاہ نے سوپور سے واپس آکر اپنے بڑے فرزند ادہم خان کی نافرمانی اور اس کی جلاوطنی کا ذکر کرنے کے بعد ولی عہدی سے اس کی علیحدگی کا اعلان کیا اور ایک دربار منعقد کر کے حاجی خان کو خلعت ولیعہدی عطا کیا۔ بلکہ ایک کمر بند اور ایک شمشیر کہ دونوں قیمتی جواہرات سے مرصع ومطلا تھے۔ عنایت کر کے اپنی مزید خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ حاجی خان نے بھی اخلاص وادب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ تقصیرات سابق کی تلافی بوجہ احسن کی اور اپنے مصاحبین کو جو سفر وحضر میں اس کے رفیق تھے۔ بادشاہ سے سفارش کر کے منصب ہائے اعلیٰ تک پہنچایا اور جاگیریں ان کے نام مقرر کرائیں۔ بادشاہ سلطنت کے تمام کاموں میں اسے شریک رکھتا اور جہاں

جاتا اس کو اپنے ساتھ لے جاتا۔

حاجی خان کی علالت شراب نوشی کی بدولت

حاجی خان اب باپ کا خدمت گزار تھا اور اس کے خلاف کسی سازش یا کسی بغاوت میں کوئی حصہ نہ لیتا تھا۔ لیکن مے نوشی کا مرض اندر ہی اندر اس کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑ چکی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو رہا تھا اور دل و دماغ اپنا صحیح کام کرنے سے عاری تھے۔ باپ نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو امراء وزراء کو اس کے پاس بھیجا۔ انہوں نے اس عادت بد کے نشیب و فراز اس کو سمجھائے۔ مذہب نے جو احکام اس لعنت کے متعلق دے رکھے تھے، وہ اس کو بتائے۔ سلطنت پر جو اس کا اثر پڑیگا وہ اس کو سمجھایا۔ لیکن حاجی خان اس قسم کی ہدایت و نصیحت کو اس کان سنتا اور اس کان اُڑا دیتا۔

آخر وہ رفتہ رفتہ بیمار ہو گیا اور بیماری روز بروز بڑھنے لگی۔ بادشاہی اس کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھ رہا تھا۔ اس کی علالت کا اس کی صحت پر بھی اثر پڑنے لگا اور اپنے ملک اور اپنی سلطنت کے متعلق جو امیدیں اس کو حاجی خان سے وابستہ نظر آئی تھیں۔ وہ منقطع ہونے لگیں۔ آخر ایک دن اس نے اپنے فرزند کو اپنے سامنے بلوایا اور اس کو بہت کمزور دیکھ کر ایک آہ بھری اور بہ تقاضائے محبت پدری اس سے اس طرح مخاطب ہوا۔

بادشاہ کی تقریر شراب کے خلاف

اے فرزند! جب تمہیں اس ام الخبائث کا چسکا نہ تھا۔ تمہاری صحت کیسی اچھی تھی۔ تم بہادر اور نوجوان تھے۔ لیکن آج میں تم کو جس حال میں دیکھ رہا ہوں۔ خدا اپنے فرزند کا اس طرح کا حال کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ مجھے رنج وقلق کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ شراب نوشی کی بدولت تمہاری قیمتی زندگی خطرے میں ہے۔ کیا تمہارے پاس تمہارا کوئی ایسا خیر خواہ نہیں ہے۔ جو اس لعنت سے تم کو بچائے۔ صحت کی خرابی اور بدنامی اور رسوائی کے علاوہ عاقبت کی تباہی کیا ان باتوں کی طرف تمہارا خیال نہیں گیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ شراب کے سوا دنیا میں اور کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انسان فرحت بھی حاصل کر سکے اور دنیا کی رسوائی اور اپنی صحت کی تباہی سے بھی بچے۔ کیا شراب ہی دنیا میں تمام نعمتوں کا بدل ہے۔ اپنے دماغی توازن کو درست کرو اور بیوقوفوں کی طرح اپنے انجام سے غافل نہ رہو۔

دنیا میں ایسی ایسی عظیم القدر اور شجاع وشیر دل ہستیاں گزری ہیں۔ جن کا نام ہی سن کر ان کے دشمنوں کی روح فناہ ہو جاتی تھی۔ پھر معلوم ہے ان ہستیوں کو ان کے روباہ صفت دشمنوں نے کس طرح چاروں شانے چت گرا لیا۔ اس کا سبب صرف ان کی بکثرت شراب نوشی تھی۔ ملک جمرتھا (ا) کا نام تم نے سنا ہوگا۔ وہ زندگی بھر شراب کے نزدیک نہ گیا۔ اس نے اپنی طاقت کو برقرار رکھا۔ اپنے ہوش وحواس درست رکھے۔ دل ودماغ کو ضعیف نہ ہونے دیا اور ساری عمر دشمنوں پر غالب رہا۔ لیکن اس کے فرزند شاہ مسعود نے اوباشوں کی صحبت میں پڑ کر نہ صرف باپ کی سلطنت ہی شراب کے ایک پیالہ کے عوض بیچ دی۔ بلکہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی

مملکت کا سب سے بڑا شہر جو تمام نعمتوں سے مالا مال تھا۔ آج اس کے ناخلف بیٹے کی وجہ سے صرف ایک پرانی تباہ شدہ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

تم کو پیالہ میں شراب کا رنگ سرخ نظر آتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ پیالے میں یہ شراب نہیں ہے۔ بلکہ شراب پینے والے کے دل وجگر کا خون جمع کیا ہوا ہے۔ یاد رکھو شراب خانہ خراب کی وجہ سے انسان ایسے ایسے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے جن کا کوئی کفارہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے جس طرح ہو سکے اپنی اور ملک کی خاطر اپنی زندگی بچاؤ اور اس لعنت سے نجات حاصل کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زندگی سے جلد ہاتھ دھو بیٹھو گے اور اگر زندہ بھی رہے تو قسمت تمہارا ہاتھ چھوڑ دیگی۔

شہزادے نے باپ کی اس طویل تقریر کا ندامت کے ساتھ مختصر الفاظ میں یہ جواب دیا کہ میں اس کو رفتہ رفتہ کم کردوں گا۔ شریور لکھتا ہے۔ لیکن نصیحت کے الفاظ بدقسمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتے۔ چنانچہ باپ سے رخصت ہو کر شہزادہ جب اپنے محلات میں گیا تو باپ کی تقریر کا جو تھوڑا بہت اثر اس پر ہوا تھا۔ وہ اس کے بدطینت مصاحبوں نے دور کردیا اور وہ پھر اسی طرح شراب میں بدمست رہنے لگا۔

باسیہ دل چہ سود گفتن وعظ نہ رود میخ آہنی در سنگ

وزراء کا پیغام جلاوطن ادہم خان کے نام

بادشاہ حاجی خان کی ناگفتہ بہ حرکات سے روز بروز آزردہ خاطر ہو رہا تھا اور چونکہ ترک شراب اس سے محال تھی اور اوباشوں کی صحبت سے وہ کنارہ نہ کرتا تھا۔

اس لے بادشاہ نے کئی مرتبہ اس سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ان وزراء نے جو ہمیشہ کسی نئے انقلاب کے منتظر رہتے ہیں۔ ہوا کا یہ رخ دیکھ کر بادشاہ کے بڑے فرزند ادہم خان سے جو ملک کے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کررہا تھا، خط وکتابت شروع کی۔اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ انہوں نے حاجی خان کی خرابی صحت اور بادشاہ کی ضعیف العمری بلکہ چندروزہ زندگی کے حالات لکھ کر اسے کشمیر پر حملہ کرنے اور بادشاہ بننے کی دعوت دیدی۔

ادہم خان کا حملہ کشمیر پر

بادشاہ نے جب یہ خبر سُنی کہ ادہم خان وزراء کی سازش سے کشمیر پر حملہ کرنے والا ہے۔تو اس کو سخت فکر دامنگیر ہوئی۔ یہ خبر رفتہ رفتہ پونچھ بھی جا پہنچی۔ جہاں حاجی خان کا فرزند حسن خان صاحب اختیار تھا۔وہ راجوری کے رستے فوج لے کر ادہم خان کا رستہ روکنے کے لئے آیا۔ چچا اور بھتیجے کے درمیان قلعہ آرڈروٹ کے موقعہ پر گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں حسن خان (۲) نے شجاعت ومردانگی کے وہ جوہر دکھائے کہ ادہم خان بھی اس کا لوہا مان گیا۔اس موقعہ پر شریور لکھتا ہے کہ حسن خان نے دادا یعنی بادشاہ کا اس قدر احترام کیا کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے ملک میں قدم رکھنا بھی اس نے مناسب تصور نہ کیا۔

آخر ادہم خان کشمیر میں داخل ہوگیا۔ جب وہ باپ کے پاس گیا تو حاجی خان اور اس کا چھوٹا بھائی بہرام خان شاہی محل کے دروازے پر کھڑے تھے۔ادہم خان نے دونوں کے ساتھ مصلحتاً مصافحہ اور معانقہ کیا اور دونوں بھائیوں نے باہم

عہدو پیمان کر کے اور مقدس ہستیوں کا حلف اٹھا کر باامن رہنے کا اقرار کیا۔ یہ سب کچھ ہوا۔لیکن دل کسی کا صاف نہ تھا۔ایک دوسرے کوشکست دینے بلکہ ہلاک کر دینے کے منصوبے سوچتا رہتا۔

دراندازوں اور خودغرضوں نے بھی سوچا کہ اگر دونوں بڑے بھائیوں میں صلح صفائی ہوگئی۔تو ہمارا الّو کس طرح سیدھا ہوگا۔ چنانچہ کچھ تو بھائیوں کی اندرونی خباثتوں کی وجہ سے یہ منافقانہ صلح دیرپا نظر نہ آتی تھی۔اور کچھ خودغرضوں نے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکا کر ملک کی تباہی کے مزید سامان پیدا کرنے شروع کئے۔

لکھا ہے کہ جب ادہم خان باپ کے علم واطلاع کے بغیر اس کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے بیٹے کی طرف کوئی التفات نہ کی۔ بلکہ اس نے ضعف کے عالم میں بھی امراء کی اس حرکت پر اپنی ناراضگی اور رنجیدگی کا اظہار کیا۔

بادشاہ کی توجہ تیسرے بیٹے کی طرف

بادشاہ نے یہ سوچ کر کہ چونکہ دونوں بڑے بیٹے نالائق اور نافرمان ہیں اور ملک میں فتنہ وفساد پیدا کر کے رعایا کی تباہی کا باعث بنے رہتے ہیں۔ایک دن بہرام خان کو خلوت میں اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ تم حاجی خان سے ملے رہتے ہو۔ حاجی خان کی طرفداری کسی دن تمہاری ہلاکت کا باعث ہوگی۔ ادہم خان اور حاجی خان کی باہمی مناقشت اور عداوت تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔اس لئے تم ادہم خان کے ارادوں سے بے خبر رہ کر بھی محفوظ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ وہ تو تمہارا دشمن ہے ہی۔

لیکن تم حاجی خان کو بھی اپنا ہمدرد نہ سمجھو۔ وہ اپنے فرزند حسن خان کو چھوڑ کر تم سے کس طرح محبت کر سکتا اور اس کے حقوق تم کو کس طرح منتقل کر سکتا ہے۔ اس لئے تم ان دونوں کا ساتھ چھوڑ کر میرے احکام کی تعمیل کو اپنی سعادتمندی کا نشان سمجھو۔ مجھ پر بھروسہ رکھو اور میرے پاس رہو۔ اگر تم نے میری اس نصیحت پر عمل نہ کیا تو اے بیوقوف لڑکے تم اپنے بڑے بھائیوں کی باہمی دشمنی میں مفت میں کچلے جاؤ گے۔

بہرام خان نے جواب میں عرض کیا۔ حاجی خان مجھے اپنے سے زیادہ عزیز جانتا اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس وقت اس کی طاقت کا مقابلہ مشکل ہے۔ میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ میری حفاظت کیلئے وہ ضرور اپنی جان لڑا دے گا۔ بادشاہ نے ناراضگی کے عالم میں کہا۔ تم نے میری عزت وعظمت کا کوئی خیال ولحاظ نہ کیا۔ زندہ باپ کو چھوڑ کر اپنے بھائی کو جو تمہارے باپ کا نافرمان ہے۔ باپ کا مرتبہ دیتے ہو۔ جاؤ تمہاری سب امیدیں انشاءاللہ خاک میں مل جائیں گی۔

حواشی:

۱) معلوم نہیں ملک جمر تھا اور اس کا فرزند کس ملک کے بادشاہ تھے۔

۲) یہی حسن خان بعد میں حسن شاہ کے نام سے کشمیر کا بادشاہ ہوا ہے اور اسی کی فوج نے تاتارخان حاکم پنجاب کو شکست دیکر جموں کے راجہ کو اس کے ظلم سے نجات دلائی تھی۔

دسواں باب

آخری ایام میں بادشاہ کی پریشانیاں

بادشاہ کو قتل کرنے کے منصوبے

جہانگیر نے اپنی توزک (۱) میں بڈشاہ کی خوارق عادات کا جو اہل کشمیر میں مشہور ہیں ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

بادشاہ زینہ لنک کے عبادت خانے میں تھا کہ ایک ناخلف شہزادہ اس کو تنہا سمجھ کر اس کے قتل کرنے کے مقصد سے شمشیر کشیدہ آیا۔ مگر جب اپنے باپ پر اس کی نظر پڑی تو صلابت پدری سے سراسیمہ ہو کر اُلٹے پاؤں واپس آ گیا۔ اسی اثنا میں سلطان بھی اپنے عبادت خانے سے نکل کر اسی بیٹے کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر شہر کو روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں بیٹے سے کہا۔ میں عبادت خانے میں اپنی تسبیح بھول آیا ہوں۔ جاؤ اور کشتی پر سوار ہو کر میری تسبیح لے آؤ۔ جب تسبیح لینے کے لئے عبادت خانے میں آیا تو دیکھا کہ باپ سابق کی طرح عبادت میں مستغرق ہے۔ یہ بے سعادت از روئے شرمندگی واپس آ کر باپ کے قدموں پر گرا اور معافی کا خواستگار رہا۔

بادشاہ بیٹوں کے اوضاع واطوار اور اخلاق وعادات سے واقف تھا کہ وہ

حکومت وریاست کی طلب میں میری طبعی موت کے بھی منتظر نہیں رہنا چاہتے۔ چنانچہ تو زک جہانگیری کے الفاظ میں اس نے اپنے فرزند کو معافی کا خواستگار دیکھ کر کہا۔ ''بر من ترک حکومت چہ گزشتن از حیات بسیار آسان است اما بعد ازیں کار مے نخواہید۔ ساخت و مدت دولت شمایاں بقا نخواہد داشت و بہ اندک زمانے بہ جزائے عمل زشت نیست خود و خواہد رسید۔ ایں سخن گفتہ ترک خوردن و آشامیدن نمود''۔

اس واقعہ کو کشمیر کے نامور مورخ حیدر ملک چاڈوڑہ نے بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ البتہ اس نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس ناخلف کا نام جس نے بادشاہ کا کام تمام کرنا چاہا تھا ادہم خان تھا۔ جو سب سے بڑا بیٹا تھا۔

اس کے قول کے مطابق بادشاہ نے اس کو یہ شعر بھی پڑھ کر سنایا تھا ؎

پدر کش بادشاہی را نہ شاید وگر شاید بجز ششماہ نباید

بادشاہ کا بہ یک وقت عبادت خانہ اور کشتی میں موجود ہونا صحیح ہو یا غلط لیکن اس میں کلام نہیں کہ جو الفاظ اس نے اپنی ناخلف اولاد کے متعلق بیٹے سے کیے تھے۔ وہ آخر پورے ہو کر رہے۔ یعنی پچاس ساٹھ سال کے بعد ہی سلطنت اس خاندان کے ہاتھ سے نکل کر کشمیر کے ایک دوسرے اولوالعزم خاندان چک کے قبضہ میں چلی گئی۔

بادشاہ پر بیٹوں کی نافرمانیوں کا اثر

بادشاہ بہت ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ بیٹوں کی حرکت نے اس کی جان کو اجیرن کر رکھا تھا۔ حاجی خان کو ولی عہد مقرر کر کے کچھ آرام کا سانس لیا تھا۔ کہ اس کی

شراب نوشی نے کاروبار سلطنت میں خلل عظیم پیدا کر دیا۔ اس رنج اور صدمہ سے بادشاہ اس قدر بیمار ہوا کہ اس کو اسہال دموی یعنی خون کے دست شروع ہو گئے۔

بادشاہ کی اب یہ حالت تھی کہ کھانا پینا قطعاً ترک ہو چکا تھا۔ ضعف پیری بیماری سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اہل نفاق کو بھائیوں کے لڑانے کا موقع مل گیا۔ ہر شہزادہ اپنی اپنی جگہ ولی عہدی کا دعوے کرنے لگا۔ بہرام خان نے جو سب سے چھوٹا تھا۔ سخنان نفاق سے دو بڑے بھائیوں میں اور بھی زیادہ کشیدگی پیدا کر دی۔ چنانچہ ادہم خان شاہی محلات سے رخصت ہو کر قطب الدین پور میں چلا گیا۔

امرائے دربار نے شہزادوں کی باہمی منافقت اور آئندہ فتنہ وفساد کا اندیشہ مدنظر رکھ کر یہ فیصلہ کر دیا۔ کہ بادشاہ کا کوئی فرزند بادشاہ کی عیادت کے لئے نہ آئے۔

بادشاہ کو رعایا کی تباہی کا غم

بادشاہ نے امراء سے کہا میں نے اپنے دست وبازو سے حکومت حاصل کی اور طویل عرصہ تک بادشاہ کے لطف اُٹھائے اور اپنے تدبرّ اور اپنے وزراء کی دانشمندیوں سے اس ملک کو اس درجہ تک پہنچایا کہ کشمیر کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ہے۔ میں نے مذہب کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ علم اور صاحبان علوم وفنون کی جی بھر کر قدر کی۔ موسیقی کے کمالات سے بھی کافی حظ حاصل کیا۔ رعایا کے آرام وآسائش کا بھی ہر وقت خیال رکھا۔ عمر بھی خدا نے کافی دی ہے۔ اب مجھے دنیا میں کوئی کام نظر نہیں آتا۔ صرف یہ فکر دامنگیر ہے کہ جس ملک کی خشک کھیتی کو میں نے نصف صدی تک

اپنے خون سے سینچا ہے اور اپنے پسینے کے قطروں سے جس کی آبیاری کی ہے۔میرے بعد اس ملک کا کیا حال ہوگا اور میری عزیز رعایا کو ان نالائقوں کے ہاتھوں کس طرح امن چین نصیب ہوگا۔میری صحت ان تفکرات کی وجہ سے مجھے جواب دے رہی ہے۔ اب میری یہی خواہش ہے کہ میں جلد تر اس دنیا سے رخصت ہو کر ابدی آرام حاصل کروں۔

بادشاہ نے ذرا دم لینے کے بعد پھر کہا کہ اگر میرے فرزند آپس میں لڑتے لڑتے مر بھی جائیں گے۔تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے ان کی موت کا کوئی صدمہ نہ ہوگا۔البتہ ان کی باہمی عداوتوں ،لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کی بدولت رعایا پر مصیبت اور تباہی آئے گی۔اس کا غم مجھے اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔جب میری زندگی ہی میں میرے نالائق فرزندوں کی وجہ سے رعایا مصائب و آرام کا شکار ہوگئی ہے۔تو بتاؤ میرے زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے؟

شریور لکھتا ہے کہ بادشاہ اس قسم کے روحانی صدمات کی وجہ سے روز بروز اُداس اور کمزور ہو رہا تھا اور بُری افواہوں کے پھیلنے سے شہر کے خورد وکلاں سب مضطرب الحال رہتے تھے۔

ایک دن ایک وزیر نے بادشاہ سے کہا۔جب فرزندوں کی طرف سے یہ نا امیدی ہے۔تو پھر یہ خزانہ عظیم کس لئے رکھا ہے۔بادشاہ نے کہا۔یہ آپ نے درست کہا ہے۔لیکن سنو میں نے خزانہ کیوں محفوظ رکھا ہے۔تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ میرے بعد میرے بیٹوں میں سے قتل وخون کے بعد آخر کوئی نہ کوئی بادشاہ تو بنے گا اور بادشاہ ہو کر اگر اس نے خزانہ خالی دیکھا تو میری عزیز رعایا کو جو مجھے ان نالائق فرزندوں سے بھی عزیز تر ہے۔لوٹ کر تباہ کر دے گا اور اگر وہ خزانے کو بھرپور پائے گا تو اس جمع

شدہ خزانے کی بدولت میری عزیز رعایا اس کے آئندہ ظلم وستم سے ایک حد تک محفوظ رہے گی۔ یاد رکھو اگر شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہو تو وہ اپنے غار میں مزے سے خراٹے مارتا رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ بھوکا ہو تو وہ گائے، بھیڑ، بکری اور انسان اور ان کے علاوہ جو کچھ اُس کو اس کی خوراک کے قابل ملے چیر پھاڑ کر تمام کر دیگا۔

شریور لکھتا ہے کہ وزیر بادشاہ کی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

بادشاہ کے آخری ایام کی تلخیاں

بادشاہ کی یاس انگیز علالت اور شہزادوں کی عاقبت نا اندیشیوں کی وجہ سے ملک میں اس قسم کا ماحول پیدا ہو چکا تھا کہ ماتحت حکام بھی ایک دوسرے کا کہنا نہ مانتے تھے۔ بادشاہ سلطنت کے معاملات سے قریباً بے خبر رہتا تھا۔ بادشاہ کو اپنے رضاعی بھائیوں سے جن کو اس نے بڑے بڑے عہدے دے رکھے تھے۔ بیوفائی کی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن وہ بھی بادشاہ کے آخری ایام میں اس کا ساتھ چھوڑ کر حاجی خان کے پاس چلے گئے۔ کئی بے مروت لوگ جو دن کو بادشاہ کے ساتھ صلاح ومشورے کرتے رہتے تھے۔ رات کو حاجی خان کے ساتھ ملی بھگت بن کر رہا کرتے تھے۔ بادشاہ جو محلات سے باہر نکلنا تو کجا بستر علالت سے اُٹھنے کے قابل بھی نہ تھا۔ ان سیاہ دلوں کی اس قسم کی منافقت سے قطعاً لاعلم تھا۔ آج جو بادشاہ کا خیر خواہ بن کے آتا تھا۔ دوسرے دن سُنا جاتا تھا کہ وہ حاجی خان کے طرفداروں میں ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو اپنے کسی خیر خواہ پر کوئی اعتبار نہ رہا اور نہ کوئی ایسا آدمی اسے نظر آتا جو اس کے دل کو تسکین دیتا اور

بادشاہ اس کے سامنے اپنے دردِ دل کا اظہار کرسکتا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں   معلوم کیا کسی کو رازِ نہاں ہمارا

بادشاہ نے ارشادات، حکم ناموں اور فرمانوں پر دستخط کرنے ترک کر دیئے۔ تمام انتظام وزراء پر چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے گہری سانس لی اور کہا افسوس ملک کے دشمنوں نے میرے گھر میں تفرقہ ڈال کر سارے ملک میں آگ لگا دی۔

بادشاہ سے اگر کوئی وزیر کچھ دریافت کرتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتا۔ وہ ہر وقت متفکر اور غمگین رہتا۔ ایک مرتبہ وزراء نے معاملات سلطنت کے متعلق چند امور دریافت کئے۔ بادشاہ نے آہستگی کے ساتھ جواب میں چند الفاظ کہے۔ لیکن وہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔

بادشاہ کے بعض مصاحبین اور اعزّا کی موت

سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ انہی ایام میں بادشاہ کی پیاری ملکہ جو خاندان سادات (۲) سے تھی۔ انتقال کرگئی۔ بادشاہ کو اس کی موت سے سخت صدمہ ہوا۔ بادشاہ نے اپنا ایک بھانجا قیام الدین نام سندھو کے ملک میں حاکم بنا کر بھیجا ہوا تھا۔ وہ بادشاہ کو بے حد عزیز تھا۔ بادشاہ نے جب سنا کہ وہ ابراہیم (۳) سے لڑتے ہوئے قتل ہو گیا ہے۔ تو اس نے کہا کہ آج میرا دایاں بازو کٹ گیا ہے۔ دریاؤ خان (۴) نام اس کا ایک معتبر مصاحب تھا۔ اس کے مرجانے کا اسے بہت ملال ہوا۔ انہی ایام میں اس کے چند اور درباری بھی جن میں میر خوشامد (۵) قابل ذکر ہے مر

گئے۔ میر خوشامد کی خدمات سے بادشاہ بہت خوش تھا اور اس کو اپنا حقیقی خیر خواہ سمجھا کرتا تھا۔

شریور لکھتا ہے۔ ان ایام میں کوئی نہ کوئی بُری خبر بادشاہ کو سننی پڑتی تھی۔ بادشاہ ان لوگوں کو ہمیشہ یاد کرتا رہتا تھا۔ جو اس کے رفیق اور خیر خواہ تھے لیکن موت نے ان کو بادشاہ سے جدا کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے ان درباریوں سے جو اس کے پاس حاضر تھے۔ کہا میں نے اپنے ذاتی شوق اور ان وزراء کے مشورے سے جن کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے گزشتہ ایام گزارے ہیں۔ اپنے ملک کا نام تمام دنیا میں روشن کر رکھا ہے۔ افسوس یہ لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کی موت کا غم میری زندگی کے آخری لمحوں تک میرے ساتھ رہے گا۔ اب میں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کے لئے ہر وقت کمر بستہ ہوں ؎

ہوش وحواس وعقل وخرد جا چکے ہیں سب
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

بادشاہ کا ولیعہد مقرر کرنے سے انکار

بادشاہ کے پاس ایک دن چند درباری بیٹھے تھے اور بادشاہ کی شدّت علالت کی وجہ سے سب خاموش تھے۔ دفعتاً بادشاہ کا خیال اپنی نالائق اولاد کی طرف چلا گیا۔ اس نے وزراء سے کہا۔ ان حالات میں کہ میرے نالائق لڑکے ایک دوسرے کے

دشمن ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ وزراء میں سے ایک نے کہا حضور والا جس کو لائق وافضل اور سعادت مند تصور کریں۔ کاروبار سلطنت اس کے سپرد کردیں تاکہ ملک میں نظام امن قائم رہ سکے۔ بادشاہ تمام فرزندوں کی نیتوں اور انکی عارضی ومنافقانہ صلح صفائی سے خوب واقف تھا۔ اس نے کہا ادہم خان میں چند خصوصیتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ بہت ہی جزورس اور سخت گیر ہے۔ اس کے اخلاق بھی اچھے نہیں ہیں۔ اس لئے کوئی قابل اور تدبر شخص اس کے پاس نہیں ٹھہر سکتا۔ حاجی خان بہت آزاد طبع ہے۔ وہ اس قدر فضول خرچ ہے کہ اگر اس کے قبضہ میں کوئی سونے کا پہاڑ بھی آجائے تو وہ چند دنوں میں اسے ختم کرسکتا ہے۔ نیز شراب خوری کی وجہ سے اس کی قواء بھی حکومت کے قابل نظر نہیں آتے۔ تیسرا فتنہ پرور اور احمق ہے۔ وہ میرے ملک کو بہت جلد تباہ کردے گا۔ میرے مرنے کے بعد جو ہوسو ہو۔ میں اپنی زندگی میں کسی نالائق اور نااہل کو تخت کشمیر پر بٹھا کر رعایا پر ظلم کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ۔

عروس ملک کسے درکنار مے گیرد   کہ بوسہ برلب شمشیر آبدار زند

جو لوگ اپنی خود غرضانہ چالوں سے میرے فرزندوں کو باہم لڑاتے اور میرے خلاف ان کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔ جب میرے مرنے کے بعد کسی نالائق اور عیاش بادشاہ کی ان پر حکومت ہوگی۔ تو اس وقت ان کو میری قدر یاد آئے گی ۔

یاد آئے گی انہیں میری وفا میرے بعد

بادشاہ کی فاقہ کشی

انہی ایام میں رمضان کا مہینہ آیا۔ بادشاہ نے حسب معمول اس مبارک مہینے میں گوشت کا شوربہ تک ترک کر دیا۔ رمضان کے بعد کا ذکر ہے کہ بادشاہ کے درباری حکیم شیو بٹ نے ایک دن بادشاہ کے سامنے حسب معمول کھانا رکھا۔ بادشاہ نے ذرا کبیدہ خاطر ہو کر حکم دیا کہ کھانا واپس لے جاؤ۔ جو میں کھا سکتا تھا کھا چکا۔

شریور لکھتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے روحانی صدمات کو کم کرنے کے لئے فاقہ کشی شروع کر دی تھی۔ اس نے کئی دن تک ضعف کے اس عالم میں بھی کھانے کی طرف کوئی توجہ ظاہر نہ کی۔ رعایا اپنے نیک دل اور ہمدرد بادشاہ کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی اور اس کے اوصاف کے گن گاتی رہتی تھی۔

بادشاہ کی نظروں میں وزراء، امراء، بیٹوں، دوستوں اور آشناؤں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کے تفکرات کو دور کر سکتا۔ لیکن بادشاہ کے فرزندوں پر کوئی اثر اس کی فاقہ کشی کا نہ ہوا۔ وہ برابر اپنے جوڑ توڑ میں مصروف رہے۔

بادشاہ کی تسکین خاطر کے لئے شریور کی کوششیں

بادشاہ کا قیام شاہی محل کے درمیانی کمرے میں رہتا تھا۔ وہ اس کمرے سے کسی دوسرے کمرے میں جانے کے قابل بھی نہ تھا اور ویسے بھی وہ اپنے آپ کو اس کمرے میں محفوظ خیال کرتا تھا۔ جب بادشاہ فاقہ کشی کی زحمت سے اور بھی زیادہ کمزور ہونے لگا۔ تو شریور پنڈت نے جو بادشاہ کی طبیعت سے بہت حد تک واقف تھا۔ اس کی تسکین خاطر کے لئے یہ تجویز نکالی۔ کہ اس کو ایک کتاب کی جو روحانیت کے

مضامین سے لبریز تھی کتھا سنانی شروع کی۔ وہ لکھتا ہے:

میں نے کئی راتیں بادشاہ کے پاس بسر کیں اور ہر رات کو اسے سم ہتھا (نام کتاب) پڑھ کر سنایا کرتا۔ میں اس کتاب کو اس خوش الحالی سے پڑھا کرتا اور پھر اس کے مضامین کی شرح اس تفصیل سے کرتا کہ بادشاہ کو لطف خاص حاصل ہوتا اور میں سمجھ لیتا کہ میں کسی حد تک اس کی تسکین خاطر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

شریور نے اپنی تاریخ میں سم ہتھا (٦) کے ایک اشلوک کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس کا ترجمہ جے سی دت نے انگریزی میں کیا ہے اور یہاں انگریزی سے اردو میں لکھا جاتا ہے۔

مجھے یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ نیک آدمیوں کا یہ زندہ سراب آسمان کے رنگ کی طرح معدوم ہو جانے والا ہے اور اس کی کوئی یاد بھی باقی نہ رہے گی۔

اے رگھو کے بیٹے یہ طویل ہو یا خوشگوار سمجھ لے کر یہ حیات مستعار ایک غیر فانی اور خیالی سلطنت کی طرح لمبا خواب (٧) ہے۔ اگر یہاں پیدائش، بڑھاپا، موت اور محبوب ترین چیزوں سے جدائی کا سلسلہ نہ ہوتا اور ہر چیز آنی جانی نہ ہوتی۔ تو کون تھا جو اس دنیا میں پیدا ہونے کی خواہش نہ کرتا۔ آدمی جن چیزوں کی تمنا چھوڑ دینگے ان سے آزاد ہو جائیں گے۔ عنائق دنیا سے قطع تعلق کرنے کے بغیر آدمی مسرت سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔

شریور کے قول کے مطابق بادشاہ نے سم ہتا کے مندرجہ صدر شلوک کے علاوہ اس کتاب کے اور بھی کئی شلوک زبانی یاد کر لئے۔ ان میں کئی ایسے تھے جو اس کے حسب حال تھے۔ وہ ان کو بار بار پڑھتا تھا۔ ان سے روحانی حظ اٹھاتا تھا اور دیر تک

ان کے معانی ومطالب پرغور کرتا رہتا تھا۔

لیکن تسکین بھی عارضی تھی۔ حقیقی تسکین اس کو مرتے دم تک نصیب نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس کے فرزند اس کے آئین وقوانین کی خلاف ورزی کر کے ملک میں جو اودہم مچا رہے تھے۔اس کی خبریں اس کو لحظہ بہ لحظہ ملتی رہتی تھیں۔اور وہ ایک لمبی سرد آہ بھر کر رہ جاتا تھا۔

حواشی:

۱) مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

۲) شری ور نے اس بیگم کا نام وداع خاتون لکھا ہے۔ یہ بیگم بیہقی سادات کے قدیم خاندانی قبرستان میں دفن ہے۔ عام طور پر اس کو مخدومہ خاتون کہتے ہیں۔

۳) شری ور نے اس کا نام اوراہیم لکھا ہے۔

۴۔۵) دریاؤ خان اور میر خوشامد کی نسبت جن کی وفات پر بادشاہ نے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ نہ شری ور نے کچھ تشریح کی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک معزز درباری تھے اور نہ کشمیر کے فارسی مورخوں نے ان کا کچھ ذکر کیا ہے ۔ البتہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ملاّ دریا نام ایک شخص کو بادشاہ نے معمولی حالت سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ بہ خطاب دریا خان سرافراز ساخت وتمامی کاروبار مملکت بہ اُو سپرد"۔ معلوم ہوتا ہے شری ور نے جس کو دریاؤ خان لکھا ہے وہ یہی دریا خان ہے۔ میر خوشامد کے متعلق تاریخ فرشتہ بھی خاموشی ہے۔

۶) سم ہتا (Samhitta) یہ کتاب آج ملک احمد اور ملا نادری کی تاریخوں کی طرح بالکل ناپید ہے۔ آخری دونوں تاریخیں فارسی میں تھیں۔ جو بڈشاہ کے عہد میں لکھی گئیں۔ اور یہ روحانی کتاب سنسکرت زبان میں تھی۔

۷) بقول حضرت فانی بدایونی ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

گیارھواں باب

شہزادہ ادہم خان کی موت اور دوسرے شہزادوں کے حالات

ادہم خان کو بادشاہ سے کورا جواب

ادہم خان بادشاہ کی حفاظت اور اس کی خدمت کے بہانے اب بادشاہ کے پاس رہنے کا آروز مند تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اپنے دوسرے دونوں بھائیوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ اپنی حفاظت کے بھی ناقابل تھا۔ آخر اس نے ایک دن بادشاہ کی خدمت میں یہ عریضہ ارسال کیا کہ بہرام (۱) حاجی خان کے ساتھ مل کر میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ میرے لئے اب آپ کی پناہ میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کرسکوں۔

اس پر شریور لکھتا ہے اگر بادشاہ پہلے کی طرح صحتیاب اور طاقتور ہوتا تو ادہم خان کی حفاظت کرسکتا۔ مگر اب تو وہ خود دوسروں کی امداد واعانت کا محتاج تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کو کہلا بھیجا۔ مجھے اب سلطنت کے کاروبار بلکہ اپنی زندگی سے بھی

کوئی سروکار نہیں۔ تمہارے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ اور جس طرح اپنے آپ کو بچا سکتے ہو بچاؤ۔ ادہم خان مایوس ہو کر قطب الدین پورہ میں چلا گیا اور وہاں جا کر بھی اسے حاجی خان کے خوف سے اطمینان قلب نصیب نہ ہو سکا۔

بادشاہ کے مرنے کی افواہیں

شاہزادوں کی باہمی مخالفت اور بادشاہ کی خطرناک علالت بلکہ اس کے قریب المرگ ہونے کی وجہ سے سارے ملک میں انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے انتقال کی افواہیں ہر روز اڑتی تھیں۔ اور چونکہ ہر افواہ کے ساتھ بدامنی اور بدنظمی کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لئے وزراء ہر روز ڈھنڈورے کے ذریعہ ان افواہوں کی تردید کرتے اور رعایا کو اپنے اپنے مذہبی طریقوں پر بادشاہ کی صحت و سلامتی کے لئے دعاؤں کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ اس ڈھنڈورے کے علاوہ امراء سلطنت نے امن پیدا کرنے کی ایک یہ تجویز بھی نکالی کہ زندگی سے ناامید بادشاہ کو تکلیف و تکلف کے ساتھ شاہی محل کی ڈیوڑھی کے سامنے لے جاتے۔ جہاں سب لوگ اسے بآسانی دیکھ سکتے۔ وہاں اسے مسند شاہی پر بٹھاتے اور نقارے بجاتے۔ تاکہ لوگوں کو بادشاہ کے صحتیاب ہونے کا یقین آجائے اور شورہ پشت لوگ اور شہزادے بدامنی سے باز رہیں۔

اسی سلسلہ میں ہاتھی اور گھوڑے سجا کر بادشاہ کے سامنے سے گزارے جاتے۔ لوگ جوق در جوق بادشاہ کی زیارت کو آتے اور اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں

مانگتے۔شریورلکھتا ہے۔بادشاہ نے اس حال میں بھی جب اپنی عزیز رعایا کو دیکھا۔تو اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ دوڑ گئی۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بہرام خان اور حاجی خان

یہ دونوں بھائی اپنے بڑے بھائی ادہم خان کے سخت دشمن تھے۔ان میں بہرام خان زیادہ فتنہ انگیز تھا۔جب شہر میں یہ خبریں پھیلنی شروع ہوئیں۔کہ بادشاہ اب رفتہ رفتہ صحتیاب ہورہا ہےاوروہ شاہی محل کی ڈیوڑھی پرلوگوں کا سلام بھی لیتا اور ہاتھی گھوڑوں کا ملاحظہ بھی کرتا ہےتو بہرام خان اپنی آنکھوں سے بادشاہ کی حالت دیکھنے کے لئے شاہی محل میں گیا۔لیکن جب اس نے بادشاہ کو دیکھا تو سمجھ لیا کہ یہ آخری سنبھالا ہےاور بادشاہ اب صرف چند دنوں کا مہمان ہے۔

چنانچہ واپس آکراس نے حاجی خان سے کہا کہ بادشاہ مردہ بدست زندہ کی مثال ہے۔اسے دنیا ومافیھا کی کوئی خبرنہیں۔وزراء محض ہمیں خوفزدہ اور مایوس کرنے کے لئے اسے جھروکے میں لے آتے ہیں۔اس وقت موقعہ ہے۔ہمارے پاس کافی جمعیت ہے۔ادہم خان ہمارے خوف سے قطب الدین پورہ میں مقیم ہے۔چلوشاہی محلات پر قبضہ کرکے وزراءکوگرفتارکرلیں اورکشتیوں کے پل کوتوڑدیں تاکہ ادہم خان اس طرف نہ آسکے۔

حاجی خان نے کہا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا میں باپ کے آخری لمحوں میں اس کی روح کو صدمہ پہنچاؤں۔ جو کچھ تم چاہتے ہو۔ وہ اپنے وقت پر ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت جو کیفیت تم نے بادشاہ کی بیان کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس سے اب ایک لمحہ بھی علیحدہ نہ رہوں۔ چنانچہ حاجی خان باپ کے پاس چلا گیا۔ اور یہ رات اس نے بادشاہ کے پاس بسر کی۔

وزارئے دربار کے عہد و پیمان حاجی خان کے ساتھ

ادہم خان نے جب یہ سُنا کہ بادشاہ کے ہوش وحواس میں بھی فرق آرہا ہے اور اس پر کئی کئی گھنٹے بیہوشی بھی طاری رہتی ہے۔ تو اس خیال سے کہ معلوم نہیں کس وقت اس کا دم نکل جائے وہ فوج لیکر زینہ نگر (۲) یعنی راج دہانی نوشہرہ کی طرف آیا تا کہ دونوں بھائیوں سے لڑ کر تخت پر قبضہ کرے۔

لیکن اسی دوران میں حسن (۳) مہتمم خزانہ اور دیگر وزراء نے حاجی خان کے ساتھ عہد و پیمان کر کے اس کو ولی عہدی اور جانشینی کی مبارکباد دی۔ بلکہ شاہی محل میں بلا کر خزانہ اور دیگر تمام لوازمات شاہی اس کے سپرد کر دیئے۔

وزراء نے جب یہ سنا کہ ادہم خان بھی دارالحکومت کی طرف آرہا ہے تو انہوں نے اس کو قطب الدین پورہ میں واپس جانے پر مجبور کیا اور اس کی واپسی کے ساتھ ہی قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

جب حاجی خان کی فوج نے یہ سنا کہ وزرائے دربار نے اس کے ساتھ

عہد و پیمان کرلیا ہے تو وہ بھی لوٹ میں حصہ لینے کے لئے مسلح ہوگئی۔ ابھی منیو اور پرتھی ہار اور بعض دوسرے افسروں نے شہزادے کی فوج کو محلات میں آنے سے روکنا چاہا۔ لیکن فوج نے ایک نہ سنی۔ بلکہ ان کو بے عزت کیا۔

حاجی خان کو خبر ہوئی۔ تو اس نے اپنی فوج کو ایسی حرکات سے منع کیا۔ اس کا دلی منشا اس وقت بادشاہ کے پاس ہی رہنے کا تھا۔ لیکن اس کو چونکہ ہر وقت اپنی فوج کے بے قابو ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لئے باپ کے ان آخری لمحوں میں وہ فوج کے ساتھ ہی رہا۔

اسی اثناء میں دادا کی وفات کی افواہیں سن کر حاجی خان کا فرزند حسن خان بھی (۴) پونچھ سے سری نگر آ گیا۔ جس سے حاجی خان کی طاقت وقوت اور بھی زیادہ ہوگئی۔ جب ادہم خان وزراء کے مجبور کرنے سے تارہ بل کے رستے اپنے ہمراہیوں سمیت واپس جا رہا تھا۔ تو اس کے سب سے چھوٹے بھائی بہرام خان نے اس کا تعاقب کر کے اس کے کئی آدمی ہلاک کر دیئے۔

ادہم خان نے ان کا بدلہ اس طرح لیا کہ اس کو جو کوئی رستہ میں ملتا وہ مسافر ہوتا یا راہرو، سرکاری آدمی ہوتا یا غیر سرکاری۔ وہ سب کو موت کے گھاٹ اتارتا۔ وہ درحقیقت اپنے مستقبل سے اس وقت بالکل مایوس ہو چکا تھا۔

ادہم خان کا حسرت ناک انجام

طبقات اور فرستہ اور دیگر تاریخوں میں لکھا ہے کہ ادہم خان نہایت شجاع اور جواں مرد تھا اور کچھ شک نہیں کہ اگر وہ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے بادشاہ کو ناراض نہ کر

لیتا۔تو وہ بادشاہ کا بہترین جانشین ثابت ہوتا۔اس کی شجاعت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ ہر چند اس کے تعاقب میں ایک جماعت تھی اور اس کے ہمراہی چند ہی آدمی تھے۔ تاہم وہ مردانہ وار دشمنوں کو کاٹتا، مارتا اور چیرتا ہوا نکل گیا۔

ادہم خان اب کشمیر سے ہجرت کر چکا تھا۔اور ہر چند اب تخت کشمیر حاصل کرنے کی اسے توقع نہ تھی۔ کیونکہ اس کی تباہ حالی کی وجہ سے اس کے ساتھی بھی اسے بُرے وقت میں اس کو جواب دے چکے تھے۔لیکن جب اسے یہ خبریں پہنچیں کہ حاجی خان باپ کی وفات کے بعد ایک حجام بنام لولی کو مصاحب ومشیر بنا کر لہو ولعب میں مبتلا ہے اور کئی نامی آدمی اس حجام کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں اور ملک میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔تو اس کے دل میں پھر ایک دفعہ کشمیر پر قبضہ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا۔اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس نے ایک خاصی فوج جمع کر لی اور فوج بھی لوٹ مار کی امید پر مرنے مارنے کے لئے ہمہ تن تیار تھی۔اس اثناء میں مانک دیو راجہ جموں پر مغلوں نے حملہ کر دیا۔راجگان جموں (مدردیش) اور سلاطین کشمیر کے جو تعلقات تھے۔ان کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔انہی تعلقات کی بنا پر راجہ مانک دیو نے ادہم خان سے امداد طلب کی۔اس نے بھی سوچا کہ اس مدد و اعانت کے معاوضہ میں کشمیر پر حملہ کرنے کیلئے مجھے بھی مانک دیو سے مدد ملے گی۔چنانچہ حملہ کشمیر کا ارادہ ملتوی کر کے وہ راجہ کے ہمراہ مغلوں کی لڑائی میں شامل ہو گیا۔لیکن دوران جنگ میں اتفاقاً ایک تیر اس کے منہ پر آ کر لگا۔جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

شریور نے حکومت سلطان حیدر کا ذکر کرتے ہوئے مانک دیو کی امداد اور ادہم خان کی موت کے متعلق حسب ذیل سطور لکھی ہیں۔ اس دوران میں مانک دیو کی ایک منظّم فوج مدر دیش میں ترشکوں کے ساتھ لڑتی ہوئی تباہ ہوگئی۔ ادہم خان بھی اپنے ماموں راجہ مانک دیو کی حمایت میں ترشکوں کے ساتھ جنگ کررہا تھا۔ لیکن ایک تیر نے جو سیدھا اس کے منہ پر آکر لگا تھا۔ اس کو ہلاک کردیا۔

حاجی خان کو جو اس وقت حیدر شاہ کے نام سے کشمیر کا بادشاہ تھا خبر ہوئی تو اس نے بہت افسوس کیا اور راجہ جموں کی معرفت اس کی نعش منگوا کر بہ اعزاز تمام اپنے باپ کے مقبرے کے نزدیک (۵) دفن کرائی۔ راجہ نے بھی بڑی عزت وحرمت کے ساتھ اس کی نعش بادشاہ کے پاس کشمیر میں بھجوادی۔

حواشی:

۱) شریور بہرام کو ہر جگہ برہمہ ہی لکھتا ہے۔

۲) شریور جس طرح سلطان زین العابدین کا نام ہر مقام پر شری جین العابدین لکھتا ہے۔ اسی طرح اس کے دارالحکومت زینہ نگر کا نام شری جینا نگر لکھتا ہے۔

۳) طبقات اکبری میں اس کو حسن کچھی لکھا گیا ہے اور لکھا ہے کہ امرائے بڈشاہی میں وہ بزرگ تر تھا۔ اس کو حیدر شاہ کے مصاحب لولی حجام نے قتل کرا دیا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے حسن خان کچھی را کہ بیشتر ہمہ در بیعت او سعی مے نمودہ بود لولی حجام بہ قتل آمد۔

۴) شریور نے اپنی زینہ راج ترنگنی میں پونچھ کا نام ہر مقام پر پرنوتش ہی لکھا ہے جو پونچھ کا قدیم نام ہے۔

۵) تاریخ فرشتہ میں بھی صفحہ ۳۴۷ پر ادہم خان کے واقعہ مرگ کے ذکر میں لکھا ہے۔ ''و بہ رفاقت ملک دیو (ملک دیو غلط ہے۔ صحیح مانک دیو ہے) راجہ جموں بہ جنگ مغولانے کے در آں نواحے آمدہ بوونند، رفتہ تیرے بر دہن او خورو۔ و بہماں زخم در گزشت شاہ از خبر وفات او متاثر شدہ فرمود۔ تا قالب او راز جنگ گاہ آوردہ نزدیک مقبرہ پدر مدفون نمودند''۔ لیکن ان دو شہادتوں کے باوجود جن میں شریور کی شہادت چشم دید ہے۔ سرینگر میں یہ مشہور ہے کہ محلّہ سیہہ یار میں جو ایک چھوٹا سا قبرستان ہے اور جہاں کبھی ملک سیف الدین سیہہ بٹ وزیر سلطان سکندر بُت شکن کے مکانات تھے۔ شہزادہ ادہم خان مدفون ہے۔ راقم الحروف خود بھی ۱۹۳۷ء میں وہاں گیا۔ قبر کا تعویذ سنگ سیاہ کا ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا ہوا ہے جو افسوس کہ پڑھا نہیں جاتا۔ البتہ مشرقی و مغربی جانب یہ مشہور رباعی جو کشمیر کی اکثر قبروں پر لکھی ہوئی نظر آتی ہے درج ہے۔

زیں جہاں رفیتم ودل برداشتیم — با جہاں داراں جہاں بگذاشتیم
ایمنے جستیم از دست اجل — اے دریغا ما غلط پند اشتیم

ایک جانب وفات ماہ رمضان کے الفظ بھی ہیں لیکن سنہ نہیں ہے۔ایک قبر کو اس کے فرزند سلطان فتح شاہ کی قبر بتایا جاتا ہے۔عناب کے بے برگ وبار بوٹے قبرستان میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔مناقب السادات مولوی محمد شاہ سعادت مفتی کے صفحہ ۲۰ پر محلّہ سیہہ یاروالی قبر ہی کو ادہم خان کی قبر لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ادہم خان یقیناً مقبرہ بڈشاہی میں دفن ہے۔محلّہ سیہہ یار ملک سیہہ بٹ کے نام سے مشہور ہے۔

بارھواں باب

بادشاہ کی وفات

بادشاہ کے آخری لمحے

ہر چند ضعیف العمری بجائے خود ایک بیماری ہے لیکن بادشاہ ۶۹ سال کی عمر میں بھی جوان ہی نظر آتا تھا۔ اگر اس کے بیٹے اس کو روحانی صدمات نہ پہنچاتے تو شریور کے قول کے مطابق وہ ہمیشہ جوان ہی رہتا۔ اس عمر میں بھی کہ وہ پون صدی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی ڈاڑھی میں جو اس کے چہرے پر نہایت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ صرف چند بال ہی سفید نظر آتے تھے۔

لیکن جب فرزندان ناہموار باہمی لڑائیوں میں مصروف ہوں۔ بلکہ باپ کا مقابلہ کرنے اور اس کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرتے ہوں اور دراندازمصاحبین فتنہ پروازیوں اور فتنہ سازیوں سے ایک دوسرے کو گرانے اور ذلیل کرنے اور اس کے فرزندوں میں عداوت و منافقت پیدا کرنے کے درپے رہتے ہوں۔ تو ان روحانی صدمات کی وجہ سے موت وحیات کی جو کشمکش ہے۔ اس کو کسی بدنصیب باپ کے لئے دائمی رخصت کا پیغام لانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

بادشاہ اب ہر وقت بیہوش سا رہتا تھا۔ اس کو اس بات کا کوئی علم نہ تھا کہ اس کے فرزند کیا کر رہے ہیں اور اس کے وزراء کن سازشوں میں مصروف ہیں۔ وہ کوئی بات کرنے، کسی بات کے سننے اور کسی بات کا جواب دینے سے قطعی عاجز تھا۔ اس کے منہ میں جو کچھ ڈالا جاتا تھا۔ اس کے نگل لینے کی طاقت بھی اس میں نہ تھی۔

شریور لکھتا ہے۔ آخری وقت میں کبھی کبھی اس کے ہونٹ ہلتے نظر آتے تھے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کس کو کہہ رہا ہے۔ عام خیال اس وقت یہی تھا کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنے آخری لمحوں میں خدا کا نام لے رہا تھا۔

بادشاہ کی وفات

جمعہ کا دن تھا۔ دوپہر کا وقت اور جیٹھ کا مہینہ۔ چاند اپنی مسافت کا بارہواں دن ختم کرنے والا تھا۔ کہ بادشاہ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔

خدائے قدوس کا نزولِ جلال آفتاب عالمتاب کی شکل میں ساری دنیا پر چھا رہا تھا۔ اسی وقت اس جلیل القدر بادشاہ کی مقدس اور سعید روح لقائے محبوب کے شوق میں رفیق اعلیٰ سے جا ملی اور اپنے فداکاروں کو تڑپتا چھوڑ گئی۔

شریور لکھتا ہے۔ میں بادشاہ کے آخری لمحوں میں اس کے پاس موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ نہایت اطمینان اور شانتی کے ساتھ وہ آخری سانس لے رہا ہے۔ ساعت وفات کے قریب اس کا چہرہ بارونق ہو گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر موت کے پسینہ کے چند قطرے نزع کے عالم میں نظر آیئے۔ جن کی شان اور چمک اس وقت

گوہر آبدار سے کم معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی قطرات اشک موتیوں کی طرح ٹپک رہے تھے اور اس کے مرنے کے بعد بھی ان کا کچھ سلسلہ جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی عزیز رعایا کے مستقبل کے غم میں روتا ہوا اس جہاں سے رخصت ہو رہا ہے۔

بادشاہ کی موت دنیائے شریعت وطریقت کے لئے ایک سانحہ عظیم تھی۔ اس کی موت ملکی ترقی، فارغ البالی اور ہنر نوازی ومعارف پروری کے لئے ایک صدمہ روح فرسا تھی۔ امراء، وزراء، عالم اور صوفی ومشائخ اور شاعر، ہندو اور مسلمان سب اس مقدس انسان کے انتقال اور اس متاع عزیز کے لٹ جانے پر جس کو وہ مرشد عالم وعالمیان سے کم نہ سمجھتے تھے۔ جس قلب وزبان سے ماتم کناں تھے۔ کاش یہ ہردلعزیزی ومقبولیت اس کے جانشینوں کو بھی نصیب ہوسکتی۔

بادشاہ کا صحیح سال وفات

کشمیر کی تاریخوں میں بادشاہ کا سال وفات ۸۷۸ھ اور ۸۷۹ھ درج ہے۔ یوم وفات کا کہیں ذکر نہیں۔ عمر ۶۹ سال اور مدت حکومت کسی نے ۵۲ سال، کسی نے ۵۰، کسی نے ۵۱ لکھی ہے۔ لیکن جیسا کہ بادشاہ کی وفات کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے۔ شریور جو بادشاہ کے آخری لمحوں میں اس کے پاس موجود تھا۔ اس کا یوم وفات جمعہ لکھتا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دوپہر کے وقت اس کے مرغ روح نے قفس عنصری سے پرواز کی۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مہینہ جیٹھ کا تھا اور تاریخ بارہ ۱۲ جیٹھ تھی۔ نیز وہ اپنے

محبوب بادشاہ شری جینا کی حکومت ۵۰ سال بتاتا ہے۔

اورلکھتا ہے کہ وہ گزشتہ صدیہ کے ماہ جیٹھ ۹۶ لوکک (۱) میں تخت نشین ہوا تھا اور موجودہ صدی کے ماہ جیٹھ ۴۶ لوکک میں اس نے انتقال کیا۔ عمر اس کی ۶۹ سال تھی۔

لوکک ۴۶ کے مطابق عیسوی ۱۴۷۰ء تھا اور ۱۲ جیٹھ کے مطابق ۲۷ مئی کی تاریخ تھی۔ اس وقت ہجری کا سال ۸۷۴ھ تھا۔ ذی قعدہ کی ۲۵ تاریخ تھی۔ ایام حکومت میں مختلف مورخین نے سال دوسال اور عمر میں جو چار سال کا فرق ظاہر کیا ہے۔ وہ قمری و شمسی حساب کی وجہ سے نظر آرہا ہے۔ درحقیقت سال وفات اور مدت حکومت وہی صحیح اور درست ہے۔ جو شریور نے لکھی ہے (۲)۔ کیونکہ اس سے زیادہ معتبر سند اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔

بادشاہ کی تجہیز وتکفین

شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کی وفات کے بعد شہر بے رونق اور سنسان دکھائی دیتا تھا۔ کسی شخص نے اس دن شہر میں کھانا نہیں کھایا۔ نہ کسی مکان سے دھواں اُٹھتا نظر آتا ہے۔ ہر گھر بجائے خود ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ بادشاہ نہیں۔ بلکہ اس کے اپنے خاندان کا کوئی بزرگ ان سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا ہے۔ آخر اس متبرک نعش کو بیش قیمت لکڑی کے تابوت میں رکھا گیا۔ چند آدمیوں نے اس تابوت کو کندھوں پر اٹھایا اور نعش پر شاہی چتر کا سایہ کیا گیا۔ اس موقعہ پر وزراء، امراء، عام

وخاص، چھوٹے ، بڑے ، امیر وغریب ، مرد و عورت ، ہندو مسلمان سب آہ وزاری کر رہے تھے۔

جب بادشاہ کا جنازہ شہر میں سے گذر رہا تھا تو تمام لوگ روتے اور سینہ کوبی کرتے تھے اور اس قسم کے ماتمی الفاظ ان کی زبان سے نکل رہے تھے۔ کہ ان کو سن کر پتھر سے پتھر دل بھی پگھل جاتا تھا۔ بادشاہ کی نعش پر نہایت قیمتی کپڑے ڈالے گئے تھے اور لوگ اشک آلود آنکھوں سے نعش کو دیکھ رہے تھے۔ آخر بادشاہ کی نعش بادشاہی قبرستان میں لائی گئی ۔ جہاں اس کے بزرگ اسلاف اور اس کے خاندان کے کئی شہزادے ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے۔ بادشاہ کی قبر اس کے باپ کے پہلو میں بنائی گئی اور وہی نادر الوجود ہستی جس نے اپنی انصاف پرور، علم دوست اور بے تعصب حکومت کی وجہ سے کشمیر کی عظمت کا سکہ ہندوستان کے علاوہ عرب وروم ایران وخراسان تک بٹھا رکھا تھا۔ فوجی جاہ وجلال کے ساتھ سپرد خاک کر دی گئی۔

شریور جو شاہی مزار تک جنازے کے ہمراہ تھا۔ لکھتا ہے۔ سب لوگوں نے اپنے مراسم کے مطابق نعش کے صندوق کو قبر میں رکھنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس پر مٹی ڈالی۔ بادشاہ کی قبر پر ایک بلورین پتھر رکھا گیا۔ اس پر بادشاہ کی وفات کے اشعار کندہ کرائے گئے۔ یہ پتھر ان تمام پتھروں سے بڑا اور قیمتی تھا۔ جو دوسرے بادشاہوں اور شہزادوں کے مزاروں پر پہلے سے موجود تھے۔

بادشاہ کی وفات کے بعد بھی کئی دن تک ایک جم غفیر دعائیں مانگنے کیلئے آتا رہا اور کئی لوگ تو بے اختیار ہو کر رویا کرتے تھے۔ جمعہ کے دن اس کثرت سے لوگ وہاں جاتے تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔

ولی عہد حاجی خان باپ کی قبر پر

شریور نے یہ نہیں بتایا کہ بادشاہ کے پاس اس کی موت کے وقت کون کون تھا۔ وہ صرف اپنا ہی نام بتاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت اور بھی کئی درباری وہاں موجود ہونگے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے فرزندوں میں سے اس کے انتقال کے وقت کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ اس کا بڑا فرزند ادہم خان اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے کشمیر سے باہر چلا گیا تھا۔ حاجی خان اور بہرام خان دونوں باہم متفق تھے لیکن وزراء نے ان کو بھی آخر وقت میں بادشاہ کے پاس نہیں آنے دیا۔ بلکہ شریور لکھتا ہے کہ حاجی خان نے شاہی قبرستان میں آخر باپ کا منہ دیکھا۔ جہاں وہ اس کو بالکل سویا ہوا نظر آیا۔ وہ باپ کا منہ دیکھ کر زار زار روتا رہا اور بے اختیار ہو کر کہتا رہا۔ سکندر میرا دادا بڑا خوش قسمت ہے۔ جو اپنے ہر دلعزیز فرزند کے ساتھ اس وقت ملاقات کر کے خوش ہو رہا ہے اور مجھ فرزند پر افسوس ہے کہ میں اپنے مشہور عالم باپ کی آخری ساعتوں میں بھی اس کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔

والد محترم آپ جنت میں تن تنہا چلے گئے۔ آپ نے ہر تقریب میں مجھے ساتھ رکھا۔ یہاں کیوں مجھے ساتھ نہ لیا۔ آپ وہ تھے کہ آپ کو شاہی بستر کے بغیر نیند نہ آسکتی تھی۔ اب آپ منوں مٹی کے نیچے کس طرح آرام سے سو رہے ہیں۔

میشود دیدۂ بنیاز غبارے تیرہ زیر خاک آمدہ اے دیدہ بنیا چونی

ہم نالائق فرزندوں نے آپ کا آرام حرام کیا۔ آپ کی زندگی اجیرن کر دی اور ہماری ہی ان نافرمانیوں کی وجہ سے آپ ہم سے ناراض ہو کر ایسی جگہ چلے گئے

ہیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہ آسکا۔

والد محترم میں آپ کے خوبصورت چہرے کو ایسے تصور اور آپ کی تصویر دونوں میں دیکھ رہا ہوں۔ اب مجھے نصیحت آمیز باتیں کون سنائے گا۔ آپ کے بغیر مجھے دن رات کی مانند ہے اور سدا بہار باغ پُرانے کھنڈر ہیں۔ اور زندگی مجھے موت کی ہیبت ناک شکل میں نظر آرہی ہے۔

میرے بادشاہ اور میرے باپ! کسی طرح واپس آؤ۔ اور اپنے شرمسار بیٹے کو اپنا منہ دکھاؤ اور اس نالائق کی تسلی کے لئے کوئی لفظ اپنی شیریں زبان سے نکالو۔

شریور لکھتا ہے۔ شہزادہ وہاں رو رو کر نڈھال ہو گیا۔ آخر وزراء اس کو بہ مشکل تمام شام کے دیر بعد واپس لائے اور اس نے وہیں مستک (۳) کی رسم ادا کی۔

شہزادے نے باپ کی قبر پر ہی یہ حکم نافذ کیا کہ اس کی ذاتی جاگیر میں سے سالورہ (۴) نام گاؤں اس مزار کے ساتھ اس لئے وقف کیا جائے کہ گرمیوں کے ایام میں اس کی آمدنی سے یہاں مسافروں کو پانی پلانے کا انتظام کیا جائے۔ اور جو لوگ اس خدمت پر مامور ہوں۔ ان کو اس گاؤں میں کاشت کیلئے اراضی مفت دی جائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا انتقال چونکہ مئی اور جیٹھ کی پسینہ بہا دینے والی گرمیوں میں ہوا تھا اور شہزادے نے گرمی کو خاص طور پر محسوس کیا۔ اس لئے صرف پانی کی سبیل کے لئے ہی ایک گاؤں اُس نے وقف کر دیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کی قبر کی حفاظت و تعمیر وغیرہ کے لئے کیا کچھ انتظام نہ ہوا ہوگا (۵)۔

شہزادہ اپنے کئے پر بہت کچھ نادم تھا۔ لیکن بادشاہ کی روح تو اس کی آہ وزاری کے جواب میں یہی کہتی ہوگی۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بادشاہ کی تصویر اور اس کا حلیہ

شہزادہ حاجی خان جو باپ کی وفات کے بعد حیدر شاہ کے نام سے کشمیر کا بادشاہ ہوا۔ بادشاہ کی قبر پر جب یہ الفاظ کہتا ہے۔ ''میں آپ کے خوبصورت چہرے کو آپ کے تصور اور آپ کی تصویر دونوں میں دیکھ رہا ہوں''۔ تو خیال پیدا ہوتا ہے کہ بادشاہ کی تصویر بھی ضرور موجود تھی اور جب بادشاہ کو صنعت وحرفت اور موسیقی وشاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کا قدردان بلکہ بانی اور سرپرست پایا جاتا ہے۔ تو ضرور اس کے زمانے میں مصوروں کی بھی قدر افزائی ہوتی ہوگی اور اس نے خود اپنی تصویر بھی بنوائی ہوگی۔ مگر افسوس ہے سعی موفور کے باوجود بادشاہ کی تصویر نہ مل سکی۔ البتہ اس کے درباری شاعر اور مورخ پنڈت شریور نے اس کے خدوخال کا دھندلا سا نقشہ بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

بادشاہ کا سینہ بہت کشادہ تھا۔ ناک لمبی اور خوشنما اور نازک تھی اور مشکہ (۶) جانور سے مشابہت رکھتی تھی۔ بادشاہ کی آنکھیں کنول کے پھولوں کی طرح بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ پیشانی خوبصورت تھی اور ڈاڑھی میں جو اس کے چہرے پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ چند سفید بال بھی موجود تھے۔

زین العابدین بڈشاہ اور شہنشاہ اکبر

بڈشاہ بادشاہ کو کشمیر میں اور اکبر کو سارے ہندوستان میں عظیم شہرت وہردلعزیزی حاصل ہے اور اس ہر دلعزیزی میں ان دونوں کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ اکبر چونکہ سارے ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ بڈشاہ کی حکومت چونکہ کشمیر کے علاوہ کاشغر، تبت، پنجاب اور سرحدی علاقہ کے بعض حصص پر تھی۔ اس لئے بقول صاحب ''اسلامک کلچر ان کشمیر'' ان کی مماثلت ومشابہت وسعتِ ملک کے لحاظ سے نہیں بلکہ وسعت اخلاق کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔

بڈشاہ کے دربار میں بھی ابوالفضل، فیضی، بدایونی اور ٹوڈرمل جیسے یگانہ روزگار مصاحب موجود تھے۔ لیکن دقعت یہ تھی کہ بڈشاہ کے حالات کی کتابیں اور تاریخیں کشمیر کی چہار دیواری ہی میں محدود رہیں اور انقلاب روزگار نے آج ان میں سے بھی کئی ایک کو صفحۂ عالم سے مٹا رکھا ہے۔ اکبر کے عہد کی تاریخیں اس کی توسیع حکومت کے ساتھ ساتھ سارے ہندوستان میں پھیلتی گئیں اور جب ہندوستان میں مطابع کا اجراء ہوا۔ تو ان کی شہرت نے ان کو زیور طبع سے آراستہ ہونے کا موقعہ بھی دیدیا۔

نیز اس کے دربار میں اہل فرنگ بھی آئے اور انہوں نے اپنے ملکوں میں جاکر مشرقی درباروں کا بطور عجائبات ذکر کیا اور بادشاہ کے حالات پر جس نے نصاریٰ کو اپنے ملک میں ہر قسم کا آرام دیا۔ بلکہ ان کا بڑا اعزز کیا تھا۔ کتابیں لکھیں اور شائع کیں اور مدارس کی تاریخ ہند نے نمایاں طور پر اکبر کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔ پھر اکبر کے حالات جب مولانا آزاد دہلوی نے اردو زبان میں لکھے تو انہوں نے اپنی

مشہور جادونگاری سے اس کی شہرت کو بقائے دوام کا خلعت پہنایا (۷)۔

چھاپے کی برکت سے نہ صرف اکبر کے عہد کی بلکہ اس سے پہلے زمانے کی کئی کتابیں بھی آج عام طور پر مل سکتی ہیں۔ لیکن کشمیر کی جتنی فارسی، کشمیری (۸) یا سنسکرت کی تاریخیں اور دیگر علوم وفنون کی کتابیں ہیں۔ اہل کشمیر کی تنگدلی و جہالت کی وجہ سے ہنوز پردہ گمنامی میں ہیں۔ بلکہ اکثر ضائع ہوچکی ہیں۔ کچھ انگریزی اور جرمن سیاح خرید کر لے گئے ہیں اور کچھ مالکان کتب کی نااہلیت کی وجہ سے کیڑوں کی نذر ہو رہی ہیں۔ ورنہ زین العابدین کے حالات میں ملا نادری نے تاریخ نادری اور سوم پنڈت نے زینہ چرت اور بعض مصنفوں نے اس کے عہد میں جو تاریخی کتابیں فارسی اور سنسکرت زبان میں لکھی ہیں۔ ان کا ترجمہ اگر کہیں شائع ہو جائے تو دنیا کو بڈشاہ کی طرز حکومت اور اس کی لازوال ہردلعزیزی کا شاید کچھ علم ہو سکے۔ کیا کسی اور مسلمان بادشاہ کے حالات بھی آج تک سنسکرت زبان کی تاریخوں میں لکھے گئے ہیں۔

یہ دعویٰ نہایت وثوق سے کیا جا سکتا ہے کہ زین العابدین سوائے توسیع مملکت کے تمام باتوں میں اکبر سے زیادہ رتبہ رکھتا تھا۔ اور یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ زین العابدین نے ۸۷۴ھ میں انتقال کیا اور اکبر ۹۶۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ یا بہ الفاظ دیگر اکبر زین العابدین کی وفات کے ۸۹ سال بعد تخت پر بیٹھا۔ اور جب اس نے ۹۹۸ھ میں کشمیر پر قبضہ کیا اور اس کو بڈشاہ کی ہردلعزیزی کا علم اور اس کے عہد کی تاریخوں اور کتابوں کا پتہ چلا تو اس نے بڈشاہ کے حالات دریافت کرنے کے لئے کشمیر کی تاریخوں اور کتابوں کے ترجمے کرائے اور بڈشاہ کی اور اس کی اس قابل تقلید طرز حکومت سے بھی یقیناً بہت واقفیت پیدا کی۔

بڈشاہ خود عالم تھا۔ کئی زبانوں سے آگاہ تھا۔ علم حدیث وفقہ میں درجہ اجتہاد نہ رکھتا ہو۔ لیکن ان علوم پر اسکو کامل عبور تھا۔ مذہبی کتابوں کے لئے سرزمین حجاز تک زادراہ دے کر لوگوں کو بھیجتا تھا۔ علماء ومشائخ کی قدر کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اکبر دین ومذہب سے بالکل کنارہ کش تھا۔ اس نے بڑے بڑے عالموں کو اور مفتیوں کو شراب پلوادی۔ وہ علماء ومشائخ کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ اور ایک نئے دین کا بانی بنا تھا۔ جس کا نام اس نے ''دین الٰہی اکبر شاہی'' رکھا تھا۔

وہ کبھی آگ کو پوجتا، کبھی مریم وعیسیٰ کی تصویروں کو چومتا، کبھی آفتاب کی پرستش کرتا، کبھی ماتھے پر ٹیکہ لگاتا اور کبھی شاہی خاندان کے کسی فرد کی موت پر ہندوؤں کی طرح سر اور داڑھی منڈواتا اور اس طرح غیر مسلموں میں ہردلعزیزی حاصل کرتا۔ بڈشاہ اپنے آخری سانس تک اپنے مذہب پر قائم رہا۔ اس نے آفتاب کی پرستش کی نہ آگ کی، نہ اس نے بتوں کو پوجا۔ لیکن بایں ہمہ اس کو تمام ہندوؤں نے بڈشاہ سے بٹہ شاہ (۹) یعنی ہندوؤں کا بادشاہ بنادیا۔ اس نے مندروں اور بت خانوں کی جو مسمار اور منہدم تھے از سر نو تعمیر کرائی اور ساتھ ہی مسجدوں کی تعمیرات سے بھی غافل نہ رہا۔ اس نے ہندو جوگیوں اور باعمل سنیاسیوں سے ہمیشہ عقیدت وارادت کا اظہار کیا لیکن مسلمان علماء ومشائخ سے بھی کبھی منہ نہ موڑا۔ اس نے ہندوؤں کے علم وفن کی کتابیں ہندوستان کے مختلف ممالک سے منگائیں اور سنسکرت کو ترقی دینے کی تدابیر نکالیں۔ بلکہ یجروید کا ایک نسخہ جب اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس نے اس کی تصحیح کے لئے ایک آدمی کو دکن میں بھیجا۔ لیکن عربی، فارسی کی ترویج واشاعت کو بھی اپنا فرض سمجھا۔ اکبر کی پرائیویٹ زندگی عیش وعشرت کا نمونہ تھی۔ راجپوت راجاؤں اور مسلمان امراء

کی لڑکیوں نے جو اس کے رشتہ مناکحت میں بندھی ہوئی تھیں۔ محل شاہی کو اندر کا اکھاڑہ ہی بنا رکھا تھا اور عہد اکبری کا مینا بازار جس میں صرف عورتیں اور بیگمات ہی شامل ہوتی تھیں۔ اب تک مشہور ہے۔ اس کے خلاف زین العابدین نے یکے بعد دیگرے تین بیگمات کیں۔ جن میں ایک بیگم زرینہ اولاد سے محروم تھی۔ تزکیہ نفس اور ضبط نفس کی یہ ایسی لاجواب مثال ہے کہ اس زمانہ کے کسی مشرقی بادشاہ کو بہت کم نصیب ہوئی ہوگی۔

جس نے دین اسلام میں اپنا علیحدہ مذہب قائم کر کے ایک نیا رخنہ پیدا کر دیا ہو اور اس کی تخریب وتضحیک کے درپے رہا ہو۔ اس سے نماز روزے کی پابندی کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ لیکن بڈشاہ اس کے مقابلہ میں نماز روزے کے علاوہ چلہ کشی جیسی سخت ریاضت بھی کیا کرتا تھا اور اس کی شہادت خود اکبر کا بیٹا جہانگیر اپنی توزک میں دیتا ہے۔

اکبر نے مذہب پر ملکی مصلحتوں کو ترجیح دی اور اس کو ضعف پہنچا کر دوسرے لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بڈشاہ نے ملکی مصلحتوں سے بھی کام لیا۔ غیر اقوام کو بھی خوش رکھا اور دامن اسلام بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ خراج محبت واحترام حاصل کر رہا ہے۔

راقم الحروف یہاں تک لکھ چکا تھا کہ لفٹننٹ کرنل سر دلزلی ہیگ کی ہسٹری آف انڈیا جلد سوم نظر سے گزری۔ جس کے صفحہ ۲۸۱/۲۸۲ پر قابل مصنف نے مختصر الفاظ میں اکبر اور بڈشاہ کے اخلاق عادات کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"زین العابدین کو کشمیر کا اکبر اعظم کہنا چاہیئے۔ اگرچہ اس میں مغل اعظم جیسی فطری لیاقت، فتوحات کی کشش اور جوش کی کمی تھی اور اس کا منتہائے نظر اس تنگ

دامن سلطنت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر بھی علم وفضل کا وہ ذخیرہ جس کو اکبر اعظم اپنی جوانی کی لاپرائیوں سے حاصل نہ کر سکا۔ بڈ شاہ کے پاس وافر موجود تھا۔ اکبر تو صرف مذہبی بے تعصبی کا درس ہی دے کر رہ گیا لیکن زین العابدین نے اپنی مذہبی سرگرمیوں کے ساتھ مساوات اور رواداری پر سختی سے عمل کیا۔ اس لحاظ سے وہ اکبر کی نسبت بہت زیادہ روشن خیال اور حقیقی طور پر رواداری کا مجسمہ تھا۔

وہ جان لینے کے معاملے میں اکبر کی طرح نرم دل تھا۔ اس نے شکار کی ممانعت کر رکھی تھی۔ رمضان کے مہینے میں وہ گوشت قطعاً ترک کر دیتا تھا۔ لیکن اخلاقی لحاظ سے وہ بلاشک وشبہ اکبر سے بہت بلند درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی بیگم کے سوا عمر بھر کسی غیر عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بالکل زاہد خشک ہی نہ تھا۔ بلکہ فرصت کے موقعوں پر گویئے، رقاص، سازندے، نٹ، نقارچی، بازیگر وغیرہ اسکی خوش دلی وتفریح کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ وہ آتشبازی کے فن کا ماہر تھا۔ اس کی قابلیت امن کے زمانہ کی صنعتوں کے لئے ہی وقف نہ تھی۔ بلکہ اسے کشمیر میں آلات حرب اور توپ وتفنگ کا بانی کہا جاتا ہے۔"

حواشی:

۱) ۹۶ء سے مراد ۴۴۹۶ لوکک اور ۴۶ سے مراد ۴۵۴۶ لوکک ہے۔

۲) دیکھو زینہ راج ترنگنی از شریور پنڈت۔ ترنگ اول فصل ۷۔

۳) مستک کی رسم قدیم ہندوانہ رسم ہے۔ یہ رسم لاش کو جلانے سے قبل لاش کے گرد پھر کر ادا کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کا فرزند یا کوئی اور جانشین اپنی تقصیرات کی معافی چاہتا ہے اور خدمت ادا نہ کر سکنے پر اپنی ندامت کا اظہار کرتا ہے۔ پنڈتوں میں اس رسم کو آلت کہتے ہیں۔ یہی رسم بادشاہ کے ولی عہد نے بھی قبر کے گرد طواف کر کے ادا کی۔

۴) یہ گاؤں اب بھی تحصیل خاص میں موجود ہے اور علاقہ گاندربل میں کھیر بھوانی کے نزدیک واقع ہے۔

۵) بادشاہ کا مقبرہ زینہ کدل سے چند قدم آگے برلب دریا ڈاک خانہ مہاراج گنج کے سامنے ہے۔ یہ شاہی قبرستان جو روز بروز معدوم و محدود ہو رہا ہے۔ اپنی شکستگی و کہنگی کی وجہ سے عبرت گاہ عالم ہے۔

۶) مشکہ سنسکرت لفظ ہے۔ کشمیری شوگا ہے اور طوطے کو کہتے ہیں۔

۷) دربار اکبری عہد اکبری کی شاندار تاریخ ہے۔ اس کے مقابلے میں بڈشاہ کے حالات اردو زبان میں لکھے تو مجھ جیسے ہیچمدان نے۔

۸) دیباچہ اسرار الابرار میں لکھا ہے۔ تواریخ کشمیر بعضے بہ لغت کشمیری وبعضے بہ زبان پارسی۔

۹) گلدستہ کشمیر میں پنڈت ہرگوپال لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بادشاہ کی ہندونوازی کی وجہ سے اس کا نام بٹ شاہ مشہور کر رکھا تھا۔

تیرھواں باب

بڈشاہ اور اس کے ہمعصر اور زمانہ مابعد کے مصنف ومورخ

بڈشاہ علوم وفنون کا قدر دان تھا۔ مصنف، شاعر اور اہل ہنر اس کی موت کے ساتھ ہی اپنے مستقبل کی بہتری سے مایوس ہو گئے۔ چنانچہ اس کے فرزند اور جانشین سلطان حیدرشاہ کے عہد میں ایک حجام نے اس کے دربار میں یہاں تک رسوخ حاصل کرلیا کہ اس نے دربار کے منتخب اور چیدہ ارکان چن چن کر کسی نہ کسی بہانے قتل کردیئے۔ بادشاہ دن رات شراب کے نشہ میں مست رہتا تھا اور یہ حجام قرب شاہی حاصل کرکے ہر قسم کے احکام اس سے لکھوالیتا تھا۔

بڈشاہ کی حکومت ملک کے لئے رحمت الٰہی کا نمونہ تھی۔ بعض مصنفوں اور مورخوں نے اس کے عہد حکومت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا ذکر سابقہ سطور میں کہیں کہیں آچکا ہے اور آئندہ کے ابواب میں بھی حسب موقعہ ان کا ذکر آتا رہے گا۔ لیکن یہاں چند ایک تاریخوں کے مختصر سے اقتباسات علیحدہ علیحدہ درج

کیئے جاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ کشمیری اور غیر کشمیری اہل الرائے کے نزدیک اس بادشاہ کا کیا مرتبہ اور کیا درجہ تھا؟

پنڈت شریور مصنف زینہ راج ترنگنی کی رائے

شریور لکھتا ہے بادشاہ کیا مرا؟ شعرا اور اہل علم کی قدروانی بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔ جو کتابیں ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ اب وہ طاق نسیاں ہوگئیں۔ ہنرو اور اہل فن لاوارث رہ گئے۔ مصنفوں اور مورخوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ ملک کے اہل علم و فضل جو سرکاری قدردانیوں پر ملکی زبان کی ترقی اور فلسفہ و منطق اور صرف و نحو کی چھان بین اور تحقیقات کیا کرتے تھے، اب دم بخود تھے۔ یہ بادشاہ ہی کی علم پروریوں کا ایک کرشمہ تھا کہ ملک میں نہ صرف ملکی علماء فضلاء ہندو مسلمان کی کثرت تھی۔ بلکہ بیرون کشمیر سے بھی بڑے بڑے علماء اور نامی اہل ہُنر اس کی شہرت سُن کر یا خود اس کی دعوت پر کشمیر میں آکر اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھاتے تھے۔ یہ ملکی و غیر ملکی علماء سنسکرت زبان کے علوم و فنون کو فارسی اور کشمیری زبان میں منتقل کیا کرتے تھے۔

شریور لکھتا ہے۔ ایسے قدردان، ہر دلعزیز اور نیک دل بادشاہ کے مرنے کے بعد تعجب ہے کہ ہم سخت جان زندہ کس طرح رہ گئے

شرمندہ جی کے کیوں ہوئے ہم ہجر شاہ میں
اب مر رہے ہیں اس کی پشیمانیوں میں ہم

مرزا حیدر کاشغری حاکم کشمیر و مصنف تاریخ رشیدی کی رائے

''سلطان زین العابدین (۱) پنجاہ سال سلطنت کردہ در تعمیر کشمیر کوشیدہ تمام طوائف را رعایت کرد۔ و نظر در کفر و اسلام نہ انداختہ و در زمان وے کشمیر شہرت یافتہ۔ دتا۔ ایں زماں آثار دے ظاہر است''۔

محمد نظام الدین ہروی مصنف طبقات اکبری کی رائے

''وخود (۲) و نیز در تشخص مہمات کوشش بلیغ مے نمود۔ و بہ جمیع طوائف بہ جہت کسب و دانش صحبت مے داشت۔ و در مجلس او اہل دانش از ہندو و مسلمان ہمہ وقت حاضر مے بودند و در علم موسیقی مہارت تمام داشت و در تعمیر و تکثیر زراعت ہیچ کس از حکام کشمیر ایں توفیق نیافتہ بودند۔''

محمد قاسم مصنّف تاریخ فرشتہ کی رائے

''وخود (۳) تشخیص قضایا مے کرد۔ با جمیع طوائف مردم صحبت داشت و چوں کسبِ علوم و فنون کردہ بود۔ ہمیشہ مجلس او پر از دانایان مسلمان و ہندو مے بود، علم موسیقی

۔اورزیدہ بودواکثراوقات اور بہ تعمیر ولایات ولایات وتکشیر زراعات وبرآوردنِ آب ہامصروف گشت وحکم عام کردہ بود۔ کہ درتمام ولایت ہرچہ ازکس دزدیدہ شود رئیسان قریات تاوان دہند۔ وقواعد وضوابط خودرا برفتہ ہائے مس کندہ در ہرشہرے ودیہے گزاشت۔ تارسوم ظلم از ولایت کشمیر براُفتاد گویند برتختہ ہائے مس نوشتہ بود کہ ہرکہ بیائید وبدین دستور کارکند۔ بہ لعنت خدا گرفتار باد۔"

شہنشاہ جہانگیر کی رائے توزک جہانگیری میں

شہنشاہ جہانگیر نے اپنی توزک میں جہاں کہیں بڈشاہ کا ذکر کیا ہے۔ بڑے ادب واحترام سے کیا ہے۔ وہ اس کی ایک کرامت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ "یکے از ناخلف زادگان بہ قصد قتل اور درآں عبادت خانہ اوررا تنہا یافتہ شمشیر کشیدہ درمے آید۔ چوں اوبرسلطان مے اُفتد۔ بنا برصلابت پدری وشکوہ صلاح سراسیمہ ومضطرب گشتہ مے گردو۔ بعد از لحظہ سلطان از عبادت خانہ برآمدہ باہماں پسر درکشتی مے نشیند۔ وردانہ شہرمے گردو۔ دراثنائے راہ بہ آں پسرمے گوید کہ تسبیح خودرا درعبادت خانہ فراموش کردہ ام۔ برزورقے سوارشدہ۔ تسبیح را خواہی آورد۔ پسر بہ عبادت خانہ درآمدہ پدررادراں جامے بیند۔ آں بے سعادت ازروئے شرمندگی تمام درپائے پدر اُفتاد۔ عذرخواہی تقصیرخودمے نماید"۔

حیدرملک چاڈورہ مورخ کی رائے

"دررعیت پروری مثل وے پادشاہے درتواریخ معتبرہ کم نشان دادہ اندوبہ

سبب اخلاق کریمہ واوصاف حمیدۂ او جمیع رعایا۔ مرفہ الحال بودند"۔ صفحہ ۳۲

اکثر شعراء وفضلا واہل کمال نظر برآں کہ سلطان قابل بود۔ میل تمام بہ صحبت ایشاں داد۔ بخدمت سلطان آمدہ بہرہ ورو منتفع مے گردیدند"۔ صفحہ ۳۴

نرائین کول عاجز مصنّف تاریخ کشمیر کی رائے

"سلطان ارباب ہنر وحرفہ راازقبیل کاغذ ساز ازسمرقند وبلخ طلبیدہ در پرگنہ پھاگ وجہ معاش برائے آں مقرر ساخت وبسیارے بہ کتب عربی وفارسی بہ فرمودہ او بہ ہندی کردہ کتاب مہابھارت کہ از کتب مشہور ہند است بہ فارسی ترجمہ شدہ سلطان بہ زبان ہندی وتبّتی وفارسی وقوف تمام ومہارت کلی داشت"۔

خواجہ محمد اعظم مصنّف تاریخ اعظمی کی رائے

"سلطان بہ صفات حمیدہ متصف بود ورعیت پروری بسیارے نمود تغیر لباس کردہ شب ہا برمے آید۔ تا حسن وقبح عمل خود بشنود"۔ درایام او ہنود ومسلمین بلکہ جمیع اہل ادیان نزاع باہم نداشتند۔ ہمہ را در مقام خود جا میداد۔ بلکہ از ہر ملتے۔ بہ جہت منصل قضایا شخصے را از ہمہ آئین تعین مے کرد۔ ازیں جہت اور بڈشاہ مے گفتند یعنی پادشاہ کلاں ہرجا از ہر طائفہ کہ مجمع مے شد حاضر مے گشتند۔ گویا وسعت مشربے

داشت و صلح کل مے خواست۔"

"اگر چہ ترویج اسلام و تائید سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام بہ مرتبہ پدر توفیق نیافت لیکن در ترویج علوم و اعزاز و علماء و فصحاء بلغا و اہل حرفہ و رعیت پروری بہ ابلغ وجوہ کوشش مے نمود۔ و تدارک ظلم ذوالچو کہ اراضی رو بہ ویرانی داشت حتی المقدور آباد فرمود۔"

دیوان کرپارام مصنّف گلزار کشمیر کی رائے

"از دیار بعیدہ درختان میوہ دار از قسم انگور و سیب و زعرو طلبیدہ باغ مرتب نمودہ و در اکثر تالاب ہا سنگارہ و تخم نیلوفر نشاندہ۔ اہل فضل و کمال ہر فرقہ را بہ جود و نوال بہرہ مند مقاصد مے داشت تالیف راج ترنگنی بزبان شاستری ابتدائے جے سہم (جے سنگھ) تا عہد خود از قدردانی ہائے اوست از بلاد دور ہر علم طلب داشتہ برہمنان را صدقہ میداد۔ ہنرہا را رواج داد۔ نگذاشت کہ ہیچ یکے بے شغل و عمل معطل مے ماند۔ (صفحہ ۱۶۶)

پنڈت بیربر کاہچرو مورخ کی رائے

"در رعیت پروری و داد گستری ہمت بہ اہتمام تمام برگماشت و در عہد حکومتش ہندو و مسلمین را باہم نزاعے نہ بود۔ ازیں جہت بہ رسم بڈشاہ کہ بہ اصلاح کشمیر بادشاہ

کلاں رامے گویندراشتہار یافت (ورق ۷۰۔ مختصر التواریخ)

پنڈت ہرگوپال کول مصنف تاریخ گلدستہ کشمیر کی رائے

''اس کے عہد میں کسی غریب پر زبردستی مذہبی تعصب نہ ہونے پاتا تھا۔ لوگوں کے املاک جو بعض سینہ زوروں نے زبردستی دبا رکھے تھے۔ اس نے واپس دلائے۔ ہر فرقہ کے اہل فضل وکمال کو یہاں آباد کیا اور ان کی معاش خاطر خواہ مقرر کی ۔بہت سے مدارس بھی بنوائے ۔صدہا کتب کا ترجمہ فارسی ،عربی ، ہندی اور شاستری میں کرایا۔ شاستری پستکیں جو کشمیر سے معدوم ہوگئی تھیں اور مقامات سے طلب کرائیں۔طبی کتب بھی اس کے حکم سے تصنیف کی گئیں۔ جے سنگھ کے عہد سے لیکر اپنے عہد تک کے حالات شاستری زبان میں لکھوائے۔ کئی شاستر دور دور سے منگوا کر برہمنوں کو مفت دیئے۔ جو ہندو یہاں سے بھاگ گئے تھے ان کو ان کے علماء فضلا سمیت طلب کر کے بلوایا اور نقد وجنس عنایت فرما کے یہاں آباد کیا۔ زراعت اور تجارت کو اس نے از حد ترقی دی اور کئی گاؤں اور کئی قصبے اپنے نام پر آباد کئے۔ یہ بادشاہ اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ میں بے نظیر تھا (۴)۔

لفٹنٹ کرنل سر ولزلی ہیگ

مصنّف ہسٹری آف انڈیا کی رائے

''وہ عالم اور علم نواز ہونے میں اپنے باپ کا پورا مقلد تھا۔لیکن باقی تمام امور میں اپنے باپ سکندر بت شکن کی ضد تھا۔اس کے دربار میں عام برہمنوں اور فاضل ہندوؤں کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔اس کی فیاضی سے اس کی رعایا اور اس کا ملک برابر فیضیاب ہوتا تھا۔اس نے بلاتمیز مذہب وملّت عوام الناس کو وہ آسائشیں بہم پہنچائیں۔جن کی اجازت ان کے پیشروؤں کے قوانین نہ دے سکتے تھے۔اس نے مندروں کو جو ضبط سرکار تھے،آزاد کر دیا۔وہ زاہد خشک ہی نہ تھا۔بلکہ فرصت کے اوقات میں گویئے، رقاص، ماہران موسیقی، بازیگر اور مداری بھی اس کی دل لگی وتفریح کا باعث ہوا کرتے تھے''۔

حواشی:

۱) تاریخ رشیدی غیر مطبوعہ ورق ۳۲۷۔

۲) مزاداز سنہ تاسنہ تاایام شہادت مرزا حیدر۔

۳) مطبوعہ یشیا نک سوسائٹی بنگال کلکتہ صفحہ ۲۰۸ ۴صفحہ ۳۲۲ مقالہ دہم حالات کشمیر

۴) صفحہ ۱۱۰و۱۱۲

چودھواں باب

بادشاہ کے ہمعصر سلاطین اوران میں سے بعض کے ساتھ دوستانہ تعلقات

جس زمانہ میں کشمیر کی مملکت پر سلطان زین العابدین نہایت جاہ وجلال اور استقلال سے حکومت کر رہا تھا۔ ان ایام میں گوہندوستان یکے بعد دیگرے خاندان تغلق وسادات ہی کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔لیکن یہ امرواقع ہے کہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں خودمختارانہ حکومت تھی۔ البتہ فرق یہ تھا کہ تخت دہلی پر جوقابض ہوتا تھا ہندوستان کی بادشاہت اس کی سمجھی جاتی تھی۔

چنانچہ دہلی کے علاوہ ہندوستان میں دکن، مالوہ، گجرات،سندھ، بنگال، بہار اورممالک مشرق یعنی جونپور وغیرہ سب جگہ الگ الگ بادشاہ تھے۔ ہم بادشاہ کے ہمعصر سلاطین اورراجگان کا یہاں کچھ ذکر کرتے ہیں۔ان میں سے جن کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھےان کا بھی تذکرہ کریں گے۔

شاہان دہلی

بڈشاہ کے پچاس سالہ عہد حکومت میں دہلی نے چار بادشاہ دیکھے۔ ابوالفتح مبارک شاہ (۱)، سلطان محمود شاہ (۲)، سلطان علاؤ الدین (۳)۔ یہ تینوں سید خضر خان (۴) بانی خاندان سادات کی اولاد سے تھے۔ ان تینوں کی مسلسل کمزوریوں کی وجہ سے ہر صوبہ تخت دہلی سے خودسر ہو رہا تھا۔ بلکہ انہی ایام میں جسرت گکھڑ نے اپنی اور بڈشاہ کی فوجیں سرحد دہلی تک پہنچائیں۔ لیکن جب سلطان بہلول لودی نے خاندان سادات کی بجائے افغان حکومت کی ۸۵۵ھ میں بنیاد رکھی۔ تو اس نے بڈشاہ بادشاہ کشمیر کے پاس جو اس کا ایک طاقتور ہمسایہ تھا۔ تحائب ونفایس بھیج کر رابطۂ مؤدت (۵) محکم کیا۔ بہلول ۸۹۳ھ تک دہلی کا بادشاہ رہا۔ شریور نے بھی اس بادشاہ کے ساتھ بڈشاہ کے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ دہلی کا بادشاہ ہمارے بادشاہ کی شہرت وعظمت کی وجہ سے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے پر مجبور تھا۔ کرنل سرہیگ نے بھی بہلول لودی اور بڈشاہ کے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

شاہان دکن

بڈشاہ کے طویل عہد حکومت میں دکن میں حسب ذیل تین بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ سلطان احمد شاہ بہمنی اس کے بعد نظام شاہ اور اس کے

بعد محمود شاہ بہمنی (۸۸۷ھ تک)۔لیکن شاہان دکن کے ساتھ بادشاہ کشمیر کے تعلقات کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

شاہان ملک گجرات

بڈ شاہ کی پچاس سالہ عہد حکومت میں تخت گجرات نے حسب ذیل پانچ بادشاہوں کے قدم چومے۔سلطان احمد شاہ بانی احمد آباد ۸۴۶ھ،اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ اور اس کی معزولی کے بعد ۸۹۵ھ میں سلطان قطب الدین تخت احمد آباد پر بیٹھا۔ اس کے بعد ۸۷۳ھ میں احمد شاہ بانی احمد آباد کے دوسرے بیٹے داؤد شاہ نے تخت احمد آباد پر قدم رکھے۔لیکن ابھی اس کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ سلطان قطب الدین کے چھوٹے بھائی محمود شاہ نے بادشاہ گجرات کا لقب حاصل کیا۔

شریور نے زینہ راج ترنگنی میں گجرات کے نام کے لحاظ سے گجرات کے بادشاہوں کو گجر بادشاہ لکھا ہے۔وہ سلطان محمد کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ محمد (٦) سلطان بادشاہ گجر نے خاص قسم کے اعلیٰ درجہ کے نفیس اپنے ملک کے بنے ہوئے پارچات تحفے کے طور پر بھیجے۔جن کا نام کتہہ،سہاس اور گلات تھے۔فارسی مورخین نے بھی لکھا ہے کہ احمد آباد گجرات کے بادشاہ نے اپنے آدمیوں کے ہاتھ اکثر تحائف ونادرات ایک عریضہ شوق کے ہمراہ بڈ شاہ کو ارسال کئے۔لیکن بادشاہ کا نام انہوں نے محمد شاہ کی بجائے محمود شاہ لکھا ہے اور وہی صحیح ہے۔کرنل سر ہیگ نے بھی سلطان محمود ہی نام لکھا ہے اور ساتھ بیگرہ کا لفظ بھی ایزاد کیا ہے۔جو شاہان گجرات کا لقب تھا۔

شاہان بنگال و بہار

بڈشاہ کے ابتدائی چار برس میں بنگال و بہار میں سلطان احمد بن سلطان جلال الدین بادشاہ تھا۔ اس کے بعد ناصر الدین نے ایک ہفتہ، ناہر شاہ نے ۳۲ سال اور باریک شاہ نے ۱۷ سال حکومت کی۔ ان بادشاہوں کے ساتھ بھی بڈشاہ کے تعلقات وابستہ نہیں تھے۔

سلاطین جونپور

سلاطین مشرق میں بزمانہ بڈشاہ ابراہیم (۷) شرقی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمود (۸) شرقی تخت پر بیٹھا۔ محمود کے بعد اس کا فرزند کلاں محمد شاہ صرف پانچ ماہ بادشاہ رہا۔ اس کے بعد حسین شاہ بادشاہ ہوا۔ جو بڈشاہ کی وفات کے زمانے تک زندہ تھا۔ سلاطین شرقی کے ساتھ بھی بڈشاہ کے کسی قسم کے تعلقات نہ تھے۔

شاہان سندھ

بڈشاہ کے طویل زمانہ حکومت میں تخت سندھ نے پانچ بادشاہوں کی

قدمبوسی کی ہے۔ جام (۹) تغلق بن جام سکندر، جام مبارک، جام سکندر، جام سنجر، جام نظام الدین عرف جام نندا۔ یہ ۸۶۶ھ میں بادشاہ ہوا اور اکسٹھ سال حکومت کرتا رہا۔ ارغون قوم نے ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں جام نندا سے سندھ چھین لیا۔

جام نندا کی حکومت ۱۵۲۶ء تک رہی ہے۔ بڈشاہ نے اس کے زمانے میں ۸۷۴ھ میں انتقال کیا۔ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ بادشاہ سندھ نے گھوڑے اور دیگر تحائف اور بہت سا اسباب شاہانہ بڈشاہ کے پاس بھیجا۔ بلکہ ایک قصیدہ بھی بادشاہ کی شان میں لکھ کر روانہ کیا۔ صاحب طبقات رقمطراز ہیں کہ قصیدہ پڑھ کر بادشاہ کشمیر نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا وہ اس قسم کا بادشاہ ہے کہ خود بادشاہ اس کی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھتے ہیں اور بہ اعزاز روانہ کرتے ہیں۔

سندھ کا یہ کون بادشاہ تھا۔ اس کی تشریح وتوضیح کسی نے نہیں کی۔ یہاں بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نہ صرف شریور نے ہی سندھ کو بڈشاہ کے زیر اقتدار لکھا ہے۔ بلکہ ابوالفضل اور صاحب طبقات کی تحریروں کے مطابق بھی زین العابدین سندھ تک جا پہنچا تھا۔ اور شریور نے یہ بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ بادشاہ کا بھانجا سندھ کے کسی حصہ کا حاکم تھا۔ کرنل سرہیگ نے جام نظام الدین والئے سندھ کو بادشاہ کا ہمعصر لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے اس کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔

مملکت پنجاب

بڈشاہ کے زمانے میں پنجاب ہر قسم کی بدامینوں اور بے چینیوں کا مرکز تھا۔ شاہان دہلی یہاں اپنے گورنر (ناظم) بھیجا کرتے تھے۔ لیکن گکھڑوں کا فرقہ کبھی ان کو

چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ بلکہ بڈشاہی فوجوں نے ہی حسرت گکھڑ کو یہاں استقلال دلایا۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ ''جسرت بہ قوت سلطان اگرچہ نہ تو انست تسخیر دہلی نمود۔ اما تمام پنجاب را در تصرف آورد''۔ جسرت گکھڑ اور شیخا گکھڑ کا نام تیمور کے حملہ ہند ۸۰۰ھ سے بھی بہت پہلے تاریخ کے صفحات پر نظر آرہا ہے۔ جسرت گکھڑ ۸۵۵ھ تک جب بہلول نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کیا ہے زندہ تھا۔ بادشاہ کشمیر سے اس کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے ہیں۔

راجہ پنج ند

کہا جاتا ہے کہ پنج ند سے مراد پنجاب کا ملک ہے۔ کیونکہ یہ پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ پنج ند کا لفظ آج بھی موجود ہے۔ اور گو وہ پنجاب ہی میں ہے۔ لیکن اس سے پنجاب مراد نہیں ہے۔ اس کی کچھ کیفیت سطور ذیل سے معلوم ہوگی۔ جب دریائے سندھ (اٹک) جو جھیل مانسرور سے نکلتا اور گلگت اور لداخ اور کشمیر کے دیگر بلند ترین مقامات کو طے کرتا ہوا اٹک کے مقام پر پہنچتا اور وہاں سے دریائے کابل کو اپنی آغوش میں لیکر مٹھن کوٹ (ضلع مظفر گڑھ پنجاب) کے مقام پر آتا ہے۔ تو پنجاب کے پانچوں دریا اس مقام پر اس کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ دریائے سندھ ان سب کو اپنے ہمراہ لیتا ہوا کراچی (سندھ) کے قریب بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ مٹھن کوٹ ہی وہ مقام ہے جہاں پنجاب کے دریا باہم مل کر پنج ند کے نام سے موسوم ہو جاتے ہیں اور یہ نام عرصہ دراز سے چلا آتا ہے۔ دریائے پنج ند ہی

سے وہ عظیم الشان نہر نکالی گئی ہے جو ریاست بہاولپور کے وسیع علاقے کو سیراب کرتی ہے اور اسی وجہ سے پنج ند محکمہ نہر کا ایک بھاری ڈویژن ہے۔ چونکہ سندھ کے ملک میں بھی بڈشاہ کا اقتدار تھا اور سندھ کے قریب ہی پنج ند واقع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پنج ند کے علاقے کا کوئی علیحدہ حکمران تھا جو سندھ کی طرح بڈشاہ کے زیر اقتدار تھا۔ یا بڈشاہ کو تحفہ تحائف بھیج کر اس سے اپنے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ زینہ راج ترنگنی کے مصنّف نے نہ پنج ند کا جائے وقوع بتایا ہے اور نہ راجہ پنج ند کا نام لکھا ہے۔ شائد اس معمہ کا حل آنے والے مصنفین کیلئے رکھ دیا ہو۔

بہر حال زینہ راج ترنگنی کی تحریر کے مطابق راجہ پنج ند نے اپنا خاص گھوڑا جس کا نام تاجک تھا اور جو بہت خوبصورت قد آور اور تیز رفتار تھا۔ بطور تحفہ ارسال کیا۔ شریور لکھتا ہے کہ یہ گھوڑا جب بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا تو طلائی زیورات اور ساز و سامان سے مرصع اور مزین تھا۔ اس کی ٹانگیں، اس کا سر اور اس کا زین پوش سنہری چمک دمک سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

راجہ کنبھ نے!

کنبھ کے ملک میں ناری کنجر کے نام سے ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا کپڑا بنا جاتا تھا۔ راجہ نے اس کپڑے کے چند تھان بادشاہ کے پاس بطور تحفہ ارسال کئے۔ یہ کپڑا ملکہ کشمیر یعنی بادشاہ بیگم نے بہت پسند کیا۔

راجہ گوالیار

گوالیار کو اکبر کے زمانے تک علم موسیقی میں خاص شہرت رہی ہے۔ تان سین جس نے اکبر کے دربار میں آکر ہندوستان میں بقائے دوام کی شہرت حاصل کی ۔گوالیار ہی کا رہنے والا تھا۔ یہاں کے فرمانروا بھی اس فن سے خاص نسبت رکھتے تھے۔

بقول صاحب طبقات اکبری راجہ گوایار کا نام ڈونگر سین تھا۔ جب اس نے بادشاہ کشمیر کی فیاضیوں اور علم نوازیوں کی شہرت سنی اور بالخصوص جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کو علم موسیقی سے بہت رغبت ہے اور وہ موسیقی دانوں کی بہت قدر کرتا اور خود بھی اس علم میں مہارت تامہ رکھتا ہے تو اس نے موسیقی اور سنگیت کی دو تین کتابوں کے نسخے اپنے معتبروں کے ہاتھ کشمیر بھیجے۔ بلکہ صاحب طبقات یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجہ گوالیار نے کتابوں کے علاوہ بادشاہ کے پاس اور بھی کئی تحفے بھیجے اور سلسلہ اخلاص واتحاد قائم کیا۔

دیگر تاریخوں کے علاوہ بیربر کاہچرو بھی مختصر التواریخ میں انہی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''راجہ گوالیار چوں اطلاع یافت کہ سلطان راجہ علم موسیقی رغبت است دوسہ کتاب ایں فن مرسل داشتہ سلسلہ اخلاص واتحاد مرعی داشت۔''

خود شریور نے بھی ایک جگہ اس قسم کا ذکر کیا ہے لیکن وہ گوالیار کی جگہ گوپال پور اور ڈونگر سین کی جگہ راجہ کا نام نگر سین لکھتا ہے اور چند کتابوں کی بجائے صرف ایک کتاب کا ذکر کرتا ہے جس کا نام سنگیت چودھمنی (Sangita Chudaman) تھا۔ اس کتاب میں گانے کی بہت سی ترکیبوں کے علاوہ علم موسیقی کے قواعد وضوابط اور

کئی قسم کے گیت درج تھے ۔ شریور لکھتا ہے نگرسین کے مرنے کے بعد جب اس کا فرزند تخت نشین ہوا۔ تو وہ بھی بادشاہ کو برابر تحفہ تحائف ارسال کرتا رہا۔

راجہ ڈونگرسین کا سال وفات ۸۷۲ھ ہے اور بڈشاہ کا سال وفات ۸۷۴ھ ہے گویا راجہ بادشاہ کی زندگی ہی میں انتقال کر گیا تھا۔ یہانتک تو شریور کی تائید ہے اور گوالیار و کشمیر یا گوپال پور و کشمیر کے تعلقات و مراسم جو قائم تھے۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بڈشاہ نے نگرسین یا ڈونگرسین کی تعزیت اور جدید راجہ کی مسند نشینی پر مبارک باد کیلئے ضرور اپنے معتبر گوالیار میں بھیجے ہوں گے۔ کرنل ہیگ نے اپنی ہسٹری آف انڈیا جدل سوم کے صفحہ ۲۸۲ پر لکھا ہے کہ راجہ گوالیار کے ساتھ بادشاہ کا رشتہ محبت موسیقی کی وجہ سے استوار تھا۔

والئی تبت

شریور نے مہمل و مختصر الفاظ میں لکھا ہے کہ کسی راجہ نے ہمارے بادشاہ کو راج ہنس جانور کا ایک جوڑا ارسال کیا۔ بادشاہ نے اس جوڑے کو شاہی تالاب میں چھوڑ دیا لیکن فارسی مورخوں نے اس کو زیادہ ہی وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ۔ والئی لاسہ (تبت سرحد چین) نے دو جانور جن کو راج ہنس (۱۱) کہتے ہیں جو نہایت خوش رنگ و خوش شکل تھے۔ جھیل مانسرور سے پکڑ کر بادشاہ کے پاس بھجوائے۔ ان جانوروں کی خاصیت یہ تھی کہ پانی اور دودھ ملا کر ان کے روبرو رکھ دیا جائے تو وہ اپنی منقاروں سے دودھ کے اجزا پانی سے جدا کر لیتے تھے۔ بادشاہ نے ان کی اس خاصیت کا خود

مشاہدہ کیا اور جب دیکھ کہ ان جانوروں نے پیالوں سے دودھ کے اجزاء پی لئے ہیں اور باقی پانی ہی پانی رہ گیا ہے تو وہ اس تحفہ سے بہت محظوظ ہوا۔

بادشاہ خراسان

شریور نے لکھا ہے کہ خراسان کے بادشاہ کا نام مرزا ابوسعید ہے۔ اس کے ماتحت اور بھی کئی بادشاہ ہیں۔ ایک بھاری مسلح فوج وہ ہمیشہ موجود رکھتا ہے۔ اس کے ملک میں گھوڑے بکثرت ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے دور دور تک مشہور ہیں۔ شمال کے اس زبردست بادشاہ نے بھی ہمارے بادشاہ کے ساتھ رابطہ اتحاد قائم کیا اور اپنے خاص قاصدوں کے ہمراہ اعلےٰ نسل کے گھوڑے اور عمدہ قسم کے خچر بطور تحفہ بھیجے۔

طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں بھی ان تحائف وتعلقات کا ذکر ہے۔

فرشتہ لکھتا ہے۔ ''خاقان سعید ابوسعید شاہ از خراسان اسپان تازی بادپیما واستران رہوار وعلیٰ وشتراں قوی ہیکل بادیہ پیما برائے اوہدیہ فرستاد وشاہ ازیں معنے بسیار خوشحال شد۔''

بادشاہ نے ان تحائف کے عوض زعفران، کشمیری کاغذ، عرق بید مشک، عطر گلاب، سرکہ، اعلیٰ قسم کے شال اور بلور کے صاف برتن اور کئی تحفے سلطان ابوسعید مرزا کے پاس بھیجے۔

آذربائیجان وگیلان

ان ممالک میں اس وقت جو بادشاہ تھا۔ کسی مورخ نے اس کا نام نہیں لکھا۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ گیلان کے بادشاہ کے ساتھ بھی بادشاہ کشمیر کے تعلقات قائم تھے۔ صرف کرنل سرہیگ ایک ایسا مصنف ہے جس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ گیلان وآذربائجان کا نام جہان شاہ تھا۔

شاہان مالوہ ومانڈو

مالوہ میں جو راجہ بکرماجیت اور راجہ بھوج کا ملک ہے۔ بڈشاہ کے زمانہ اوّل میں ہوشنگ اور ۸۳۸ھ میں اس کا بیٹا محمد شاہ تھا۔ ۸۳۹ء میں محمود خلجی نے اس خاندان کو تباہ کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ شریور نے زینہ راج ترنگنی میں محمود خلجی کو مانڈو کا راجہ کھل شاہ لکھا ہے۔ چونکہ مانڈو بھی مالوہ ہی کے ماتحت تھا اور اپنے مشہور قلعہ اور دارالحکومت ہونے کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس لے شریور نے اپنی تاریخ میں اس کو مانڈو ہی کا فرمانروا ظاہر کیا ہے۔ اور کھل شاہ یا کھلش کا لفظ صاف معلوم ہوتا ہے کہ خلجی کا بگڑا ہوا ہے۔ بلکہ شریور نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ میرا بادشاہ مالوہ کے ملک تک بھی شہرت رکھتا ہے۔ بادشاہ مالوہ نے بیش قیمت پارچات کے کئی تھان جو درن دام یا دراندام کے نام سے مشہور تھے۔ بڈشاہ کے پاس بھیجے۔ شریور لکھتا ہے۔ ہمارے

بادشاہ نے بھی ان ملبوسات کے عوض فرمانروائے مانڈو کو کئی تحفے ارسال کئے۔ ان تحائف میں ایک نظم بھی تھی۔ جو کشمیری زبان میں تھی اور بادشاہ کی اپنی تصنیف کردہ تھی۔ جب مانڈو کے بادشاہ کو بڈ شاہی معتمدوں کے ذریعے اس کشمیری نظم کے مطالب و معانی اور اس کے اعلیٰ مضامین سے آگاہی ہوئی۔ تو تمام تحائف سے زیادہ اس نے اس نظم کو پسند کیا اور اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

محمود خلجی نے ۸۷۳ھ میں یعنی بدشاہ سے ایک سال قبل انتقال کیا۔

حاکم ملک منڈلک

منڈلک (۱۲) کے حاکم نے جو دارالحکومت کا سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔ بڈ شاہ کی خدمت میں اظہار عقیدت کے لئے ایک قیمتی گھوڑے کے علاوہ انواع واقسام کے کئی جانور بھی بھیجے۔ جن میں مچ کُنڈ (Much Kunda) نام جانور بیت خوبصورت تھا۔

مکہ معظّمہ، مصر اور روم

اسی طرح شاہان مصر، روم، مکہ معظّمہ اور باقی ممالک کے بادشاہ بھی بادشاہ کشمیر کو تحائف و ہدایا بھیجا کرتے اور اس کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم رکھنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ بلکہ ترکستان وسیستان (۱۳) تک کے بادشاہوں نے اس کے ساتھ رابطہ

دوستی قائم کیا۔ غرض ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند میں بھی بادشاہ کی شوکت وسطوت اوراس کی رعایا نوازی کا کافی چرچا تھا۔ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ حاکم مکہ معظّمہ ومکرم ومصر وگیلان وغیرہ آں نیز تحفہ وہدایات فرستادہ ہمیں شیوہ را مرعی مے داشتند۔"

غرض کشمیر کے فرمانرواؤں میں سلطان زین العابدین ہی سب سے پہلا بادشاہ تھا۔ جس نے ممالک وغیرہ کے فرمانرواؤں کے ساتھ سلسلہ اتحاد قائم رکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ بلکہ اکثر والیان ملک نے خود تحفہ تحائف بھیج کر اس کے ساتھ تعلقات قائم کئے۔ یہ سب بادشاہ اور والیانِ ملک بادشاہ کشمیر کی دوستی پر فخر کرتے اور اس کی خوبیوں کے مداح تھے۔

حواشی:

۱) تخت نشینی ۸۳۳ھ

۲) تخت نشینی ۸۴۷ھ

۳) تخت نشینی ۸۴۹ھ

۴) صوبہ دار لاہور تھا۔ امیر تیمور ہندوستان کو تباہ کر کے ۸۰۱ھ میں سمرقند واپس جاتے ہوئے اس کو دہلی کا بادشاہ بنا گیا۔

۵) طبقات اکبری۔

۶) شریور سلطان محمد شاہ کا نام محمد سورتران (محمد سلطان) لکھتا ہے۔ اسی طرح کشمیر کے ایک موضع سلطان پور کا نام سورتران پور لکھتا ہے۔

۷) سال وفات ۸۴۴ھ

۸) سال وفات ۸۶۳ھ

۹) جام خاندان کو سام بھی کہتے ہیں۔ یہ خاندان سمر خاندان کے بعد ۷۵۲ھ میں سندھ کا حکمران ہوا۔ بعض مورخوں نے ان کی حکومت کی ابتدا مختلف سنین میں بتائی ہے۔ مثلاً مصنف بیگ لرنامہ لکھتا ہے۔ ۷۳۴ھ ۱۳۳۴ء میں یہ خاندان تخت سندھ پر بیٹھا اور ایک سو تیرانویں سال تک رہا۔ مصنف تاریخ ظاہری لکھتا ہے۔ ۸۴۲ھ/ ۱۴۳۹ء میں اس خاندان نے سندھ پر قبضہ کیا اور صرف ۸۴ سال اس نے حکومت کی۔ تحفۃ الاکرام لکھتا ہے یہ خاندان ۷۹۲ھ میں تخت نشین ہوا اور ایک سو پچھتر سال تک حکمران رہا۔ لیکن مسٹر ایچ ایم ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا جلد اول میں ایک طویل بحث کے بعد لکھتے ہیں۔ تاریخ ظاہری نے اس خاندان کی جو مدت حکومت لکھی ہے وہ اس لئے غلط ہے کہ جب فیروز تغلق بادشاہ دہلی نے ۷۶۲ھ ۱۳۶۱ء میں سندھ پر حملہ کیا۔ تو اس وقت

سندھ کے بادشاہ کا لقب جام تھا۔ لیکن جب اس سے دس سال قبل محمد تغلق نے سندھ کے حاکم پر حملہ کیا تو حاکم سندھ سمر خاندان سے تھا نہ کہ جام سہیام خاندان سے۔ اس لئے تحفۃ الاکرام نے جام خاندان کی حکومت کی ابتدا میں ۷۵۲ھ کا جو ذکر کیا ہے وہی درست ہے۔

۱۰) راجہ کنبھ (Kumbha) کو راجہ کمبایت بھی کہتے ہیں۔ جو آج صوبہ بمبئی میں کمبایت کے نام سے ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔

۱۱) راج ہنس کی عمر کا اندازہ ماہرین نے ایک سو سال بتایا ہے۔

۱۲) منڈلک کے جائے وقوع کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔

۱۳) اسلامک کلچر ان کشمیر۔

پندرھواں باب

بادشاہ کے عدل وانصاف کے چند واقعات

ایک جلیل القدر درباری کو پھانسی کی سزا

ایک دفعہ ایک جلیل القدر سید میر شاہ نامی نے جو بادشاہ کے معتمدوں میں تھا۔ شراب کے نشہ میں اپنی بے گناہ عورت کو مارتے مارتے جان سے مار ڈالا۔ بادشاہ نے عورت کی مظلومی پر رحم ولطف کی نظر ڈالی اور مقرب درباری کے اعزاز ومنصب کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس جرم کے عوض کہ اس نے بے زبان عورت کو بے گناہ ہلاک کر ڈالا۔ پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا۔

گائے کی چوری پر بادشاہ کا دانشمندانہ فیصلہ

جیاپیڈ پور (اندرکوٹ) کے ایک برہمن کی گائے ایک مرتبہ گم ہوگئی۔ کئی دن کے بعد وہ مددراج (مرزا جنوبی کشمیر) کے کسی تیرتھ پر اشنان کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ جب وہ شادی پور کے متصل پہنچا۔ تو وہاں اس نے ایک چراگاہ میں اپنی گائے کو

شناخت کرلیا۔ جب مال مویشی گھروں کو جانے لگے۔ تو وہ بھی اپنی گائے کے پیچھے روانہ ہوا کہ دیکھیں وہ کہاں جاتی ہے۔ جب گائے اپنے نئے مالک کے گھر پہنچی تو برہمن نے اس شخص سے کہا کہ یہ گائے تو میری ہے۔ نئے مالک نے کہا۔ یہ گائے میری ہے اور یہ بچھڑا بھی اسی کا ہے۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہوسکا تو یہ معاملہ عدالت تک پہنچا اور اس کی اپیل ہوتے ہوتے بادشاہ کے دربار میں آئی۔ بادشاہی نے دونوں کے بیانات سنے اور حکم دیا کہ سنگھاڑوں کا ایک ڈھیر لاؤ۔ عوام اور اہل دربار حیران تھے کہ اس مقدمہ سے سنگھاڑوں کا کیا تعلق؟

آخر سنگھاڑے لائے گئے۔ بادشاہ نے کچھ گائے کے آگے رکھوائے اور کچھ بچھڑے کے آگے۔ گائے تو کھا گئی۔ لیکن بچھڑے نے منہ تک نہ لگایا۔ چونکہ جیاپیڈ پور میں سنگھاڑے کثرت سے ہوتے ہیں اور وہاں مویشی اس کو کثرت سے کھانے کے عادی ہیں۔ اس لئے بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ گائے جیاپیڈ پور کے برہمن ہی کی ہے اور اس نے بچھڑا ایسے مقام پر دیا ہے جہاں سنگھاڑے نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ سنگھاڑے کھانے کا عادی نہیں ہے۔ اس پر بادشاہ کے حکم سے گائے جیاپیڈ پور کے برہمن کے حوالے کی گئی اور زبردستی کے مالک کو چوری کی سزا دی گئی۔

متنازعہ اراضی کا دلچسپ فیصلہ

مولراج نام ایک برہمن نے اپنی قابل فروخت اراضی کے دس ٹکڑے کر رکھے تھے۔ ایک ٹکڑا اس نے فروخت کر دیا۔ اور مشتری کو بیعنامہ بھی لکھ دیا۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ چالاک مشتری نے اس کے فرزندوں کی غریبی

اور مولراج کے انتقال کی وجہ سے بیعنامے کے کاغذ میں باقی نوٹکڑوں کی فروخت کا بھی اندراج کردیا۔ تاکہ اگراس کا کوئی وارث بعد میں دعویٰ کرے تو وہ چل نہ سکے۔

مولراج کے بڑی بیٹے کا نام نونراج تھا۔ وہ کمزور تھا اوراس کے مقابلے میں مشتری دولت مند اور صاحب رسوخ تھا۔ تاہم اس غریب نے کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ اوراس کے ماتحت عملہ کے انصاف کے بھروسہ پر دعوے کردیا۔ آخر جب بادشاہ کے سامنے یہ بیعنامہ پیش ہوا۔ تو بادشاہ نے حکم دیا کہ بیعنامے کے کاغذ کو پانی میں ڈبو دیا جائے۔ چنانچہ جب کاغذ کو پانی میں ڈالا گیا تو ایک نئی سطر جو نوٹکڑوں کی فروخت کے لئے جعلی طور پر بڑھائی گئی تھی۔ کاغذ پر سے حرف غلط کی طرح فوراً اڑ گئی اور باقی الفاظ پر پانی نے ذرا دیر کے بعد اثر کیا۔

زونراج لکھتا ہے۔ میں اس مقدمے کے وقت بادشاہ کی عدالت میں موجود تھا۔ مدعی کی صداقت آمیز چیخ پر اوراس کے دل ہلا دینے والے واویلا کا میرے دل پر بڑا اثر ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنے وزراء سے کہا دیکھو جعلی اور غلط الفاظ جو بعد میں اضافہ کئے گئے تھے۔ کس طرح فوراً ہی مٹ گئے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے اس غاصب دولتمند کو مناسب سزا دی۔

ایک یوگی کی ہلاکت پر ایک عرب کو عبرتناک سزا

بادشاہ کے پاس جو عرب مکہ معظّمہ سے کچھ کتابیں لایا تھا۔ اس کا نام سیّد سعد اللہ تھا۔ زونراج نے اس کا نام یادن سید لکھا ہے۔

دارالحکومت میں ایک جوگی تھا۔ جو روحانیت کا ماہر اور جذبات پر قادر تھا۔ کئی کئی دن بغیر کھانے پینے کے گزار دیتا تھا۔ اپنی آنکھیں بند رکھ سکتا تھا۔ حبس دم میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔ اور تپسیا (عبادت) کے وقت وہ فریاد مافیہا سے بالکل غافل ہو جاتا تھا۔ زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ اس خدا دوست یوگی کا بڑا عقیدت مند تھا اور اس کی دعا اور برکت سے بادشاہ کے ہاں فرزند اوّل (ادہم خان) پیدا ہوا تھا۔ جس کی پیدائش پر بادشاہ نے ایک بہت بڑا جشن کیا تھا۔

سید سعد اللہ عرب اس خیال سے کہ بادشاہ کو ایک غیر مسلم سے اس قدر عقیدت کیوں ہے؟ اس یوگی کے خلاف تھا۔ اس نے اس حسد کے باعث کوئی بہانہ تلاش کر کے یوگی کو جان سے مار ڈالا۔ عام لوگوں پر بھی اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ لیکن بادشاہ نے تو اس قدر صدمہ محسوس کیا کہ اس نے یہ اندوہناک خبر سنتے ہی کھانا پینا ترک کر دیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے اپنے مذہبی رہنماؤں، عالموں، قانون دانوں اور پیشواؤں کو بلوایا اور ان کے ساتھ سعد اللہ عرب کے متعلق مشورہ کیا۔ ان سب نے سعد اللہ کے قتل کا مشورہ دیا۔

بادشاہ کی رحمدلی کی وجہ سے سعد اللہ جان سے تو بچ گیا۔ لیکن بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو گدھے کی ننگی پیٹھ پر دُم کی طرف سوار کر کے شہر کے ہر بازار میں تشہیر کیا جائے۔ اس کی ڈاڑھی پیشاب سے تر کی جائے۔ اس کا سر مونڈ دیا جائے اور مردہ یوگی کی انتڑیاں نکال کر ان سے اس کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں اور جو شخص اس کو دیکھے۔ وہ سب کام چھوڑ کر اس کے منہ پر تھوکنا شروع کر دے۔

زونراج لکھتا ہے۔ ہر چند کہ سعد اللہ عرب زندہ تھا۔لیکن یہ سزا جو اس کو دی گئی تھی۔اس کی موت سے کم نہ تھی۔

سوکن کے جلاپے میں بچہ کے قتل کا مقدمہ

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کسی عورت نے سوکن کے جلاپے سے تنگ آ کر اپنے شیر خوار بچہ کو قتل کر دیا اور بچہ کے قتل کا الزام اپنی سوکن پر لگا دیا۔مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی عورت اپنے شیر خوار بچہ کو خود بخود ہلاک کر سکتی ہے۔ اس لئے اس مقدمہ نے اور اس قضیہ نے بہت طول کھینچا۔ یہاں تک کہ آخر بادشاہ کی عدالت تک نوبت پہنچی۔ بادشاہ اپنی فراست و دانشمندی سے بعض اوقات اہم معاملات بھی جلد سے جلد طے کر لیا کرتا تھا۔اس مقدمے میں بھی اس نے یہی کام کیا۔اس نے مفروضہ ملزمہ کو خلوت میں بلوایا اور معافی کا وعدہ دے کر اصل حقیقت دریافت کرنا چاہی۔لیکن وہ عورت بدستور اس جرم کے ارتکاب سے انکار کرتی رہی۔ آخر بادشاہ نے اس سے کہا کہ اگر واقعی تم بے قصور اور بے گناہ ہو تو کپڑے اتار کر اور برہنہ ہو کر دربار میں سے گزر جاؤ۔ملزمہ نے کہا اگر بادشاہ سلامت مجھ بے گناہ کو سزا ہی کے قابل سمجھتے ہیں۔تو اس سزا سے یہ بہتر ہے کہ مجھے تلوار سے ہلاک کر دیا جائے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے۔طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ عورت نے شرم و حیا سے سر نیچا کر لیا اور کہا۔ ''مزد من مُرون بہ ازیں عمل است : بہ خون خود راضی شدم و لیکن اختیار ایں عمل بہ خود قرار نمے توانمہ داد۔''

بادشاہ نے اس کے بعد مدعیہ کو بلایا۔ وہ بھی اپنی بیگناہی اور سوکن کے ملزم ہونے کی ضد پر اڑی رہی۔ بادشاہ نے اس کو بھی برہنہ ہوکر دربار میں سے گزر جانے کا حکم دیا۔ وہ عورت اپنی بیگناہی ثابت کرنے کے لئے فوراً تیار ہوگئی۔ بادشاہ نے اسے منع کیا اور جلادوں کو حکم دیا کہ اسے تازیانے لگائیں۔ آخر اس عورت نے چند تازیانے کھانے کے بعد اپنے بچہ کو ہلاک کرنے کا اقبال کرلیا اور کہا میں نے جو کچھ کیا اپنی سوکن کو ذلیل کرنے کے لئے کیا۔ لیکن چاہ کن راچاہ درپیش۔

بادشاہ نے اس کو کیا سزا دی۔ اس کی تشریح وتوضیح کہیں نہیں ہے۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ بادشاہ کے حکم سے آخر اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ فرشتہ لکھتا ہے۔ ''چوں اقرار بہ فعل زشت خود کرد وسلطان را یقین شد کہ قاتل اوست بہ فرمود تا بہ سیاست رسا نند(۱)۔''

ایک بدمست شاہی مصاحب کو عبرت انگیز سزا

بادشاہ کے مقربوں اور مصاحبوں میں ایک مسلمان تھا۔ جس کو شراب پینے کی عادت تھی۔ ایک مرتبہ شراب کے نشہ میں اس نے ایک پنڈت کو اس قدر زدوکوب کیا کہ اس کی جان ہی نکل گئی۔ پنڈت کے وارثوں نے بادشاہ کے پاس فریاد کی۔ بادشاہ نے مقدمے کے قاضیوں اور ججوں کے پاس بھیجنے کی بجائے اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کے وارثوں کے بیان اور گواہی کی شہادتیں لے کر حکم دیا کہ چونکہ ان تمام شہادتوں سے ظاہر ہے کہ اس کی نیت اس کو ہلاک کرنے کی نہیں تھی۔ شراب کے نشہ

میں اس نے متوفی کو کوئی ایسی ضرب لگائی۔ جس سے وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اس لئے اس کو پھانسی کی سزا تو نہیں دی جاتی۔ البتہ اس روسیاہ کو اُلٹے منہ گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں پھرایا جائے۔ تاکہ اس کو شراب نوشی کا انجام اور تقرب شاہی کے گھمنڈ میں اپنی اس حرکت نتیجہ کا نتیجہ معلوم ہو جائے اور باقی لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

بادشاہ پابرہنہ ایک برہمن کے مکان پر

مورخین ہنود لکھتے ہیں کہ بادشاہ کا ایک لڑکا کشتی میں سوار ہو کر دریا کی سیر کر رہا تھا۔ جب عالی کدل پہنچا تو ایک نوجوان اور خوش شکل پنڈتانی کو دریا کے گھاٹ پر پانی بھرتے دیکھا۔ جب اس نے گھڑا سر پر رکھا تو شہزادے نے تماشہ دیکھنے لئے گھڑے کو غلہ کا نشانہ بنایا۔ جس سے گھڑا ٹوٹ گیا۔ مگر اس کی پاکدامانی نے پانی کو اس کے سر پر معلق رکھا۔ اس نے گھر جا کر اپنے خاوند کو اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ وہ بیچارہ کیا کر سکتا تھا۔ بظاہر صبر تلخ کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کی یہ صبر آزما خاموشی پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

یہ تو سوچو کہ مرا صبر پڑیگا کس پر؟

مورخین ہنود کا بیان ہے کہ شہزادہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایسا بیمار ہوا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ جب بادشاہ کو اصل معاملہ سے آگاہی ہوئی تو اس نے بہت افسوس کیا۔ وہ پابرہنہ برہمن کے مکان پر گیا اور معذرت طلب کر کے دعائے صحت کا طلبگار ہوا۔ برہمن نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ جب شہزادے اپنی رعایا کی بہو بیٹیوں کے

ساتھ ایسا سلوک کرینگے تو غریب رعایا کا کہاں ٹھکانا ہوسکتا ہے۔ آخر برہمن نے شہزادے کی صحت کے لئے دعا مانگی۔ جو بارگاہ حقیقی میں قبول ہوئی۔ بادشاہ کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ اور وہ رعایا اور ہندوؤں کی دلجوئی میں اور بھی سرگرمی سے کام لینے لگا۔

حواشی:

۱) تاریخ فرشتہ جلد دوم درذکر سلطان زین العابدین صفحہ ۳۴۴

سولھواں باب

بڈشاہی تعمیرات

بڈشاہ کا تعمیری شوق

زونراج اور اس کے شاگرد شریور نے بڈشاہ کی تعمیرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان تاریخوں کے اقتباسات اسی باب کے آئندہ صفحات میں درج ہوں گے۔ کشمیر کے یہ دونوں نامور شاعر و مصنف بڈشاہ کے عہد ہی میں گزرے ہیں۔ بلکہ شریور تو بڈشاہ کے بعد بھی اس کے پوتے سلطان فتح شاہ کے عہد تک زندہ رہا ہے۔

مرزا حیدر کاشغری جو کشمیر میں صاحب حکومت بھی رہا ہے، کشمیر کے قدیم فارسی مورخوں میں نامور حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بڈشاہ کے شوق تعمیرات کا ذکر کرتا ہوا اس کے کئی عمارتوں اور اس کے کئی باغات بالخصوص زینہ لنک کی دلچسپ کیفیت سے اپنی تاریخ کے اوراق کو زینت دیتا ہے۔ اسی طرح بخشی نظام الدین احمد اپنی کتاب طبقات اکبری میں جو بڈشاہی کی وفات سے قریباً سوا سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ بڈشاہی تعمیرات کا ذکر کرتا ہے۔ جہانگیر بھی اپنی توزک میں کشمیر کے اس جلیل القدر بادشاہ کی بزرگی و برتری کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ لکھتا ہے۔ ’’اور ابڈشاہ (شاہ

کلاں) مے گونید خوارق عادات او بسیار نقل مے کند۔ آثار و علامات و عمارات او در کشمیر بسیار است (۱)۔"

رئیس الملک حیدر ملک جہانگیری اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔ "اکثر بہ شکار و سیر رغبت داشت در ہر شکار گاہ عمارتے ساختہ بود"۔ مابعد کی تاریخوں تاریخ فرشتہ، تاریخ خواجہ اعظمی، سیر المتاخرین وغیرہ میں بھی اس کی تعمیرات کا بالتفصیل ذکر ہے۔ غرض یہ بادشاہ اس قدر تعمیری دلچسپیاں اور جدید عمارات و باغات کا اس قدر شوق مبداء فیاض سے لے کر آیا تھا۔ کہ یقیناً اس لحاظ سے وہ اپنے زمانے کا شاہجہاں تھا۔

اس نے طب کو رواج دیا۔ حکیم حاذق اور طبیب کامل جگہ جگہ سے بلوائے۔ دارالحکومت (سرینگر) میں نو شفا خانوں کی تعمیرات کا عام ذکر ہے۔ ممکن ہے بعض دیگر مشہور مقامات میں بھی شفا خانے تعمیر کرائے ہوں۔ آمد و رفت کے راستوں میں سڑکیں، سرائے اور مسافر خانے اور جگہ جگہ پل تعمیر کرائے۔ بادشاہ نے اپنی مملکت کو دارالامان اور کشمیر کو جنت نظیر بنا دیا تھا۔ سچ ہے ؎

نام منظور ہے گر فیض کے اسباب بنا پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

چنانچہ زونراج زینہ ترنگنی (۲) میں لکھتا ہے۔ بادشاہ نے کشمیر کے ہر ایک بڑے گاؤں میں ایک ایک سرائے یعنی مسافر خانہ تعمیر کرایا اور اس کی مرمت و حفاظت کا گاؤں والوں کو ذمہ دار قرار دیا اور جنگلوں میں بھی چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر کرائے۔ تاکہ آنے جانے والوں یا سیر و شکار کرنے والوں کو وہاں آرام ملے۔ ان

مکانوں کو آجکل کے فاریسٹ ریسٹ ہاوس تصور کرنا چاہیے۔

زین العابدین کے زمانے میں چوبی طرز عمارت نے نمایاں ترقی حاصل کی۔ بادشاہ ہنر پرور تھا۔ وہ ذات، صفات اور من وتو کی پرورش کی بجائے علم وہنر کی قدردانی میں زیادہ لطف لیتا تھا۔ سمرقند، بخارا، ہندوستان اور وسط ایشیا سے جواہل ہنر وصاحب فن اس نے بلوائے۔ ان میں فن تعمیرات کے ماہرین بھی تھے۔ بادشاہ ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ وہ بھی قدردان بادشاہ کی خوشنودی مزاج کی خاطر اپنے کمالات جی کھول کر دکھاتے تھے۔ آج کشمیر کی عمارتوں میں جو بچی کھچی رنگینیاں دیکھ رہے ہو اور چھتوں کے نقش ونگار میں جس صنعت پر احسنت ومرحبا کہتے ہو۔ یہ سب بڈشاہی قدردانیوں کا ظہور ہے۔

بڈشاہی تعمیرات کا امیر عمارت

تاریخوں میں لکھا ہے کہ بڈشاہ دیگر علوم وفنون کے ساتھ فن تعمیر میں بھی خاص دلچسپی لیتا تھا۔ زینہ لنک اور بعض دوسرے مقامات کے تعمیر اس کے اپنے دل ودماغ کا نتیجہ تھی۔ تعمیرات اور انجینئرنگ کا ایک خاص محکمہ بھی تھا اور اس کا افسر اعلیٰ یا میر عمارت اودے بانڈ کے نام سے اس کا اپنا ایک ہموطن تھا۔

زونراج زینہ ترنگنی میں اس کے متعلق لکھتا ہے۔ یہ بہت قابل اور دوراندیش شخص تھا۔ دیگر عمارات کی طرح زینہ لنک کی حفاظت ونگرانی بھی اسی کے سپرد تھی۔ یہ شخص فن نقاشی میں ماہر تھا۔ اس نے عجیب عجیب نقش ونگار سے شاہی مکانات ومحلات

کومزین کیا۔ پرانے شاہی مکانات کی تعمیر ومرمت اور حفاظت بھی اس کے سپرد تھی۔ گویا اس زمانے میں بھی محکمہ آثار قدیمہ قائم تھا۔ جواودے بانڈ میر عمارت ہی کے سپرد تھا۔

بڈشاہ نے اپنے طویل اور پُر امن حکومت میں جس قدر باغات احداث کرائے، پل بنوائے، نہریں کھدوائیں، نئے شہر اور محلے اور دیہات آباد کیئے، مساجد ومنادر آباد اور مرمت اور تعمیر کرائے۔ ان کی تفصیل تو بہت طویل ہے۔ ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

بڈشاہی عمارات کی مختصر فہرست

زینہ لنک، زینہ کدل، زینہ تراگ، زینہ بازار، زینہ سنتھو (در پرگنہ اڈون) زینہ ڈب، زینہ گیر، زینہ مرگ (در علاقہ پائین) زینہ کوٹ متصل اندرکوٹ، زینہ نگر یا نوشہرہ دارالحکومت، زینہ پٹن برلب وُلر، زینہ کنڈل، کامراج، زینہ تھک یا زینہ تلک (بہ جانب مانسبل) زینہ پورہ پرگنہ آدون، باغ بڈشاہی اونتی پورہ، سونا لنک، درتالاب ڈل، پل سوپور بر دریائے وتستہ، سلطان پور (کامراج)، جامع مسجد شوپیان، جامع مسجد بارہ مولا، مسجد گاڈایار (زینہ کدل)، مزار السلاطین، مسجد جامع نوشہرہ (در محلّہ نوشہرہ)، خانقاہ سید مدنی، خانقاہ چرار شریف، خانقاہ سید ہلال موضع اشم، خانقاہ سید برخوردار (سرینگر) مندر زشٹی شور یعنی مندر شنکر اچاریہ یا تخت سلیمان، ہلال پور متصل زینہ تلک، بڈکوٹ، بڈسر، بڈمقام وغیرہ وغیرہ۔

اب متذکرہ صدر عمارتوں میں سے جن کا کچھ حال تاریخوں نے بتایا ہے یا راقم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جھیل ولر میں زینہ لنک کی تعمیر

زونراج نے زینہ راج ترنگنی میں تفصیل کے ساتھ زینہ لنک کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس جھیل کا قدیم نام مہا پدم (۳) بتاتا ہے اور لکھتا ہے وہ اٹھائیس کوس (۴) کے دور میں پھیلی ہوئی ہے۔ کشمیر کے قدیم ہندو راجے اور مسلمان بادشاہ اس ہیبت ناک جھیل میں خوف کی وجہ سے بہت کم آیا کرتے تھے۔ کیونکہ ہوا کی وجہ سے اس میں بڑی بڑی لہریں اٹھا کرتی تھیں۔ جن سے ہر وقت کشتی کے ڈوب جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔

زینہ لنک کے متعلق زونراج بڈشاہی مورخ کا بیان

زونراج یہاں بادشاہ کی اولوالعزمی کو اس کی زبردست روحانی طاقت سے منسوب کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ اپنی اسی طاقت کے بل پر کشتی لئے ہوئے اس جھیل میں اس طرح ڈورتا پھرتا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک یہ سطح آب ایک خشک زمین تھی۔

چونکہ جھیل بہت بڑی تھی۔ بادشاہ نے اس کے کسی حصہ کو خشک کر کے اس

میں آرام گاہ بنانے کیلئے ایک مکان بنانے کی تجویز پر غور کیا اور شہر کے پرانے اور بوڑھے آدمیوں سے اس امر کے متعلق ذکر کیا۔ واقف کار لوگوں نے جھیل مہاپدم کی مفصل داستان بیان کی۔ اس کے بعد بادشاہ کو خواب میں کسی غیبی طاقت نے اشارہ کیا کہ اس جھیل میں کوئی عمارت تعمیر کرنے کا جو عزم تم نے کیا ہے۔ وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ اس اشارے سے بادشاہ کی ہمت بندھ گئی اور آخر اس نے بہت غور و فکر کے بعد یہ تجویز سوچی کہ جھیل کے کسی بلند مقام پر دیودار لکڑی کی کشتیاں پتھروں سے بھر بھر کر ایک دوسرے کے اوپر ڈبو دی جائیں۔ یہاں تک کہ زمین کا کچھ حصہ خشک نکل آئے اور اس پر عمارت تعمیر کر دی جائے۔ بادشاہ اس ترکیب سے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا اور اس نے زینہ لنک کے نام سے اس پر ایک عمارت تعمیر کی۔

مسلمان مصنفوں کے بیان

بعد کے مورخوں نے اور بھی تفصیل سے زینہ لنک کی عمارت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ بادشاہ ایک دن سید جان باز ولیؒ کے ہمراہ دریا کی سیر کرتا ہوا ولر کی طرف جا نکلا۔ جب عین وسط ولر میں پہنچا تو بادشاہ نے سید صاحب سے کہا کہ یہ جگہ بڑی خوفناک ہے۔ اس کے چاروں طرف دریا حائل ہے۔ جب اس کا پانی موجزن ہوتا اور طوفان پیدا کرتا ہے تو لوگوں کو اس مصیبت سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ سب ورطۂ ہلاکت میں ڈوب جاتے ہیں اور کوئی بھی اپنی جان ساحل تک سلامت نہیں لے جا سکتا۔

اس لئے میں چاہتا ہوں کہ وُلر کے عین درمیان ایک جزیرہ آباد کروں جس پر ایک عبادت خانہ اور ایک احاطہ تعمیر کروں۔ تا کہ ولر کے مسافروں کو اس میں آرام و آسائش کی کوئی جگہ نظر آئے۔ لیکن یہ کام بہت مشکل ہے۔ اس میں ہمت مرداں کے ساتھ دعائے بزرگاں کی بھی ضرورت ہے۔ کہ ''انفاس زندہ دلاں مددگار بادشاہان است۔'' (۵)

میں آپ سے اس کام کے لئے فاتح خیر کی درخواست کرتا ہوں۔ سید جان باز نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔ بادشاہ اور سید رات کو سوپور میں ٹھہرے۔ صبح طلوع آفتاب کے ساتھ ہی سید توبارہ مولا روانہ ہو گئے اور بادشاہ سرینگر چلا گیا۔

اب یہ خبر ہر برناؤ پیر اور ہر کوچہ و بازار میں جا پہنچی کہ بادشاہ وُلر میں ایک محل تیار کرنے والا ہے۔ اس کے لئے زمستان سازگار زمانہ تھا۔ کیونکہ اس موسم میں پانی کم ہو جاتا اور ماہی گیر بعض ایسی چیزیں دستیاب کر لیتے تھے۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں کوئی عظیم الشان شہر آباد رہ چکا ہے۔

جب یہ موسم آیا۔ تو بادشاہ نے بڑے بڑے غواص بلوائے۔ جو چھ چھ سات سات گھنٹے تک پانی کے نیچے رہ سکتے تھے۔ حکم دیا کہ ولر کے وسط میں جا کر سطح آب کے نیچے سب کچھ چھان مارو۔ جو جگہ بلند اور سخت نظر آئے اس کو دیکھو اور بتاؤ۔ تا کہ وہاں بہ سہولت تمام عمارت بن سکے۔

وُلر میں ایک بُت خانے کے آثار

چنانچہ بڑی کوشش کے بعد ایک سنگی بُت خانے کے نشان ملے۔ بادشاہ کو

اطلاع ہوئی۔ فرطِ خوشی سے خود کشتی پر سوار ہو کر آیا۔ غواصوں کو حکم دیا کہ اس بُت خانے کے اندر جائیں اور دیکھیں۔ وہاں کیا کچھ ہے۔ غواصوں نے پھر غوطے لگائے۔ پانی کے اندر جا کر بُت خانے کے کونے کونے کی تلاشی لی۔ آخر غواص (٦) وہ بُت جن کو ہندو مورتیاں کہتے ہیں نکال لائے۔

زینہ لنک کی بنیاد و تعمیر

جہانگیر نے اپنی توزک میں جہاں سلسلہ جشن و ئمین نو روز (٧) کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے بڈشاہ کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ایسا ہی لکھا ہے۔ جیسا ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کے متعلق لکھنا مناسب تھا۔ اسی سلسلہ میں زینہ لنک کا ذکر اس نے ذرا تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کشمیر میں زین العابدین کی جس کو بڈشاہ یعنی شہنشاہ معظم بھی کہتے ہیں۔ بہت سی علامات وعمارات ہیں۔ منجملہ ان کے ایک آبگیر کے درمیان جس کا نام اولر ہے اور عرض وطول جس کا ۲ کوس سے زیادہ ہے۔ ایک عمارت زینہ لنک بنائی ہے۔ جس کی بنیاد رکھنے میں بڑی کوشش سے کام لیا گیا ہے۔ اس آبگیر کی تہہ عمیق ہے۔ بادشاہ نے اوّل اوّل کشتیوں میں پتھر بھر بھر کر اس میں ڈالے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ پھر کئی ہزار کشتیاں پتھروں سے بھر کر اس میں ڈبوئیں۔

اسکے بعد بقولِ صاحب اسرار لابرار سلطان نے ایک نہایت طول طویل کشتی تیار کرائی۔ جس کو دراصل چھوٹا سا جہاز کہنا چاہیے۔ اس کشتی کو بادبانوں کے

ذریعے جھیل وُلر میں اس مقام پر ڈالا گیا۔ جہاں سے وہ بت خانہ نکلا تھا۔ کشتی میں مٹی اور پتھر بکثرت ڈالا گیا۔ اس کو ہموار مسطح بنا کر اس پر زینہ لنک کی بنیاد رکھی گئی۔

جہانگیر لکھتا ہے۔ بادشاہ نے پانی کے اوپر اس طریق سے جو زمین پیدا کی۔ وہ سو گز مربع تھی۔ اس کے چاروں طرف اس نے عمارات بنوائیں۔ ایک عبادت خانہ بھی تعمیر کرایا۔ اکثر اوقات وہ کشتی میں بیٹھ کر آتا اور بہت سے چلے کھینچتا۔

خواجہ محمد اعظم نے بھی ''واقعات کشمیر'' میں زینہ لنک کی بنا کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ جس جگہ بادشاہ نے یہ لنک تعمیر کیا۔ وہاں ایام زمستاں میں کمی آب کی وجہ سے زمین خشک نکل آتی تھی اور ایسی عمارت کے آثار بھی وہاں ظاہر ہوتے تھے۔ جس کو ہم بُت خانہ یا ہندوؤں کا مندر کہہ سکتے ہیں۔ بادشاہ کو جب یہاں مکان بنانے کا خیال آیا۔ تو اس نے ایک بہت بڑی کشتی گجرات کی کشتیوں کے نمونے پر تیار کرا کے وہاں غرق کرائی اور پھر اس پر پتھر اور مٹی ڈال کر وہاں زمین پیدا کی اور اس پر عمارت اور مسجد کی بنیاد رکھی اور نام اس مقام کا اپنے نام پر زینہ لنک رکھا اور پیشتر اس کے کہ وہ یہاں عمارت کی بنیاد رکھتا اس نے اس خیال سے کہ مندروں میں سونے چاندی کی مورتیاں بھی ہوتی ہیں۔ غواصوں کو حکم دیا کہ وہ غوطہ زنی کر کے دیکھیں کہ اس کے اندر کیا کچھ ہے۔ چنانچہ غواص اپنی مسلسل غوطہ زنیوں کے بعد دو طلائی بت اندر سے نکال لائیے۔

زینہ لنک کی بنا کے تاریخی قطعات

یہ عالی منظر کاشانہ جو زینہ لنک کے نام سے مشہور تھا۔ تین طبقوں پر تھا۔ پہلا

طبقہ پتھروں سے اور دوسرا اینٹوں سے اور تیسرا لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس محل اور عبادت کدہ کی تیاری میں سید جان باز ولیؒ جیسے خدا رسیدہ بزرگ سے دعائے خیرو کامیابی کرائی۔ خود محنت و جانکاہی سے اس کو اختتام تک پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ عمارت پایہ تکمیل تک پہنچی ہوگی تو اسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کو علاوہ عمارات کے اس نے باغ دلکشا اور مختلف اشجار سے سجایا۔ اُمراء وزراء نے مبارکبادیں دیں۔ بادشاہ نے ایک جشن کے ذریعہ اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ چنانچہ صاحب واقعات کشمیر لکھتے ہیں۔ ''وبعد اتمام عمارت لنک جشن عظیم کردو داود دہش بسیار کرد۔ شعراء قصائد وتواریخ گفتہ اند''۔ لیکن تمام تاریخوں میں صرف ایک قطعہ تاریخ ہی درج ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

اس بقعہ چو بنیاد فلک محکم باد مشہور بہ زین ڈب در عالم باد
شاہ زین عبادتا دُرو جشن کند پیوستہ چو تاریخ خودش خورم باد

سرخوش جو کشمیر کا ایک مشہور خوش گو اور خوش نویس شاعر تھا۔ زینہ لنک کے متعلق کسی شاعر کے دو قطعات اپنی بیاض میں درج کرتا ہے۔

یہ مصرع پڑھا نہیں گیا حروف خرابی سے در صدف ہمچو دُرے ماوا کرد
لنک از دولت دریا دستے خاک بر حاتمئے دریا کرد

دردل ڈل شاہ امشب بزم عشرت ساز کرد بر رُخ عالم .... پڑھا نہیں گیا
شعلہ شمع وچراغ بزم گاہ۔۔۔ آگے پڑھا نہیں گیا از ہوائے معتدل در آب ڈل ہم ناز کرد

سرخوش نے یہ نہیں لکھا کہ یہ شاعر کون تھا اور کس زمانہ میں تھا۔ لیکن شاعر

کے اس مصرع ع دردل ڈل شاہ امشب بزم عشرت ساز کرد۔ میں لفظ امشب ظاہر کرتا ہے کہ شاعر خود اس بزم عشرت میں شامل تھا اور اس نے اس جشن میں یہ قطعہ بادشاہ کے روبرو پڑھا تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ دریا دل بادشاہ نے یہ قطعہ سن کر قدردانی کے موتی نہ برسائے ہوں گے۔

زینہ لنک کا طول وعرض

جہانگیر جس کی حکومت کشمیر کا زمانہ بڈشاہ سے قریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہوا ہے۔ اس جزیرے کی وسعت سو مربع گز لکھتا ہے۔ مرزا حیدر جو بڈشاہ سے قریباً ستر سال بعد کشمیر میں سلطان نازک شاہ کے نام پر حکومت کرتا رہا ہے۔ اس کی وسعت دو سو مربع گز اور اس کی گہرائی ۳۰ فٹ یا دس گز لکھتا ہے اور یہ بھی لکھتا ہے۔ اس جزیرے میں بادشاہ نے ایک دلکش محل کے علاوہ بہت سے درخت بھی نصب کرائے۔ یہاں تک کہ اس خوش نما نظارے کا اور ایسی موزون جگہ کا کوئی اور مقام مقابلہ نہ کر سکتا تھا (۸)۔

اس کے بعد پیرزادہ حسن شاہ اپنی تاریخ حسن میں اس جزیرے کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''جزیرہ وسیع کہ طول از شمال تا جنوب یک صد درعہ وعرض ۷۵ درعہ مے باشد بلند افراشتہ''۔ جزیرے کی وسعت کے متعلق تینوں مورخوں کے بیان مختلف ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تینوں صحیح ہیں۔ مرزا حیدر کے زمانہ میں جو بڈشاہ کا قریب تر زمانہ ہے۔ جزیرہ لنک اپنی پوری شان وشوکت پر ہوگا۔ اس لئے

اس کی وسعت اور اس کی خوش حالی میں بھی چنداں فرق نہ آیا ہوگا۔ جہانگیر کے زمانے میں اس کو بڈشاہ کے بعد ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پہلے باہمی خانہ جنگیوں پھر انقلاب سلطنت کے بعد زینہ لنک کس مپرسی کی حالت میں رہا ہوگا۔ اس لئے اس کی خرابی و بربادی کی وجہ سے عمارت جوں جوں گرتی جاتی ہوگی۔ پانی نزدیک آتا ہوگا اور اس طرح اس جزیرے کی وسعت کم ہوگئی ہوگی۔ تاریخ حسن کا مصنف بھی جو وسعت اس کی لکھتا ہے۔ صحیح سمجھنی چاہیے۔ اس لئے کہ عمارت اور چہار دیواری اور اشجار وغیرہ کے انہدام سے تمام کھنڈ تہ آب ہو گئے ہوں گے۔

زینہ لنک کی موجودہ حالت

تاریخ حسن میں جس کی تصنیف کو آج قریباً ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ لکھا ہے ''مسجد رنگین تا حال موجود است تعمیر ساخت''۔ یہ وہی مسجد رنگین ہے جس کو جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے ''عبادت کدہ بہ جہت پرستش خود دادہ''۔

اسی طرح خواجہ محمد اعظم اپنی تاریخ اعظمی میں جس کی تصنیف کو آج دو سو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ زینہ لنک کے قطعہ تاریخ خودش خورم باذ کے چاروں مصرعوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ یہ تاریخ تا حال ایک پتھر پر منقش ہے۔ لیکن جب راقم السطور ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں زینہ لنک کے کھنڈر دیکھنے گیا تو نہ وہاں قطعہ تاریخ کسی پتھر پر منقش تھا اور نہ مسجد اپنی رنگینیوں کے ساتھ موجود تھی۔

زینہ لنک جس کے تین آشیانے تھے۔ یعنی ایک پتھروں کا، ایک اینٹوں کا

ایک لکڑی کا۔ ان میں سے کوئی بھی سلامت نہ تھا۔ بالائی آشیانوں کا تو وجود ہی نہ تھا۔ جو طبقہ سب سے نیچے تھا۔ اس کے کچھ برے بھلے آثار قدیم تھے۔ چوہے ہر طرف دوڑ رہے تھے۔ پتھروں کے ڈھیر چاروں طرف لگے ہوئے تھے اور توت (۹) کے چند درخت اپنے خشک پتوں اور بوسیدہ وجود سے اپنی کہنگی کا ثبوت دے رہے تھے اور اس عالیشان عمارت پر جس کے متعلق جہانگیر نے لکھا ہے کہ کشمیر کے اور بادشاہوں نے بھی زینہ لنک کے تین ضلعوں میں عمارتیں بنائیں۔ لیکن کوئی عمارت زین العابدین کی عمارت کے پائے کو نہ پہنچتی۔ حسرت وافسوس کے بادل چھا رہے تھے۔ (۱۰)

زینہ لنک یا خرم آباد

قطعہ تاریخ خرم آباد کی وجہ سے اس عمارت کا نام خرم آباد بھی مشہور ہو گیا۔ بادشاہ اس کو زینہ لنک بھی کہتا تھا اور خرم آباد بھی۔ لیکن عوام میں زینہ لنک کے نام نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

سوپور سے صفاپور تک طویل ستھو

سوپور سے صفاپور تک نو یا دس میل کا فاصلہ ہے۔ بادشاہ نے زینہ لنک یا خرم آباد کی حفاظت کے لئے ایک طویل ستھو بنایا اور ایک گاؤں راودگام اس ستھو کی

مرمت وغیرہ کے لئے وقف کر دیا۔ بقول صاحب وجیز التواریخ ایک گاؤں نہیں بلکہ دو تھے اور سال ہا سال تک ان کا مالیہ اس ستھو کی مرمت وحفاظت پر صرف ہوتا رہا۔ آج بھی شاہ گنڈ، جہانگیر گنڈ، حاجن اور خاص سوپور میں اس ستھو یعنی دیوار بندی کے آثار موجود ہیں۔ اس ستھو پر جو پتھر صرف ہوا ہے۔ وہ موضع تاپر (۱۱) کے شکستہ حال مندر نرندری شور سے حاصل کیا گیا تھا۔ جیسا کہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا۔ از صفاپور (۱۲) تا سوپور (۱۳) سد محکمے بنا کردہ سنگ ہائے بُت خانہ تاپر کہ پیش از عمل اوخراب شدہ بود آوردہ استحکام نمودؔ"۔

زینہ لنک میں جشن عظیم

جب یہ شاہی عمارت تکمیل کو پہنچ گئی تو بادشاہ نے ایک جشن عام کی تیاریاں کیں۔ اسباب نشاط وسرور اور آلات عیش وطرب حکم شاہی کے ساتھ ہی مہیا ہو گئے۔ ارکان دولت حاضر ہوئے۔ نذر و نیاز اور پیشکش کا دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ نے داد دہش کے منہ کھول دیئے۔ غریب امیر سب نہال ہو گئے۔ شعرا نے قصائد لکھے اور انعامات حاصل کئے۔ بلکہ اکثر مستحقین کو توقع سے زیادہ ملا۔ بقول شاعر ۔

وہ لوگ تری دادو دہش دیکھ لیں آکر
جو کہتے ہیں ملتا نہیں قسمت سے زیادہ

بادشاہ کو میر سید اویسیؒ سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ باوجود بادشاہ کا منہ بولا فرزند کہلانے کے بادشاہوں کی صحبت سے کنارہ کش رہتے تھے اور ذوق تنہائی پر دونوں جہان کی مسرتیں قربان کردیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے اس جشن عظیم کی شرکت کے لئے ان کو بہ اصرار بلوا بھیجا۔ بعض امراء نے پیغام دعوت کے ساتھ ہی یہ فقرہ بھی جڑ دیا کہ بادشاہ کا مزاج آپ سے رنجیدہ ہے۔ اس دعوت کو نہ ٹالئے۔ نیز یہ دعوت ایک عجیب وغریب عمارت کی تکمیل پر شکرانہ الٰہی کے سلسلہ میں ہے۔ اس کی ابتداء بھی ایک بزرگ (سید جان بازولیؒ) کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس کی افتتاحی رسم میں آپ جیسے صوفی منش شہزادے کی شرکت باعث برکت ہے۔ غرض امراء وزراء کسی نہ کسی طرح میر اویسیؒ کو اس بزم میں لے آئے۔ وہ بظاہر شریک تھے مگر بباطن سب سے الگ تھے

ہر کسے جام تنعم بہ کف وساغر عیش
فارغ از عیش وتنعم دل غمگین من است

رنگ میں بھنگ

تقسیم انعامات اور پیشکش کی رسومات کے بعد جب ہنگامہ شادی وطرب شروع ہوا اور مجلس نشاط وسرور گرم ہوئی اور بعض امور نامشروعہ کا اظہار ہوا (۱۴)۔ تو بقول صاحب اسرار الابرار میر اویسیؒ کی غیرت یہ حرکت برداشت نہ کرسکی۔ مچھلی کی طرح تڑپے اور تڑپ کر ولر میں ایسے غائب ہوئے کہ غواصان شناور کیش اور ملاحان

سیاحت اندیش کی تمام کوششوں کے باوجود وہ دُریگانہ اس بحر بیکران سے نہ نکل سکا۔ سلطان کا سارا عیش منغص ہوگیا۔ مجلس طرب درہم برہم ہوگئی۔ نہایت اندوہگیں ہوکر واپس شہر کو روانہ ہوا۔ جب اشم پرگنہ محمد آباد میں شنکر ریشوہار کے پُراز انہار واشجار باغ کے برابر پہنچا۔ جولب دریا واقع تھا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ میر قدس سرہٗ دریا کے کنارے کنارے جلد جلد قدم اٹھائے چلے جارہے ہیں۔ بادشاہ کشتی میں سوار تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے قالب مردہ میں جان آئی۔ کشتی سے اتر کر باغ میں آیا۔ بہت ندامت وافسوس اور عذر کا اظہار کیا۔ کشتی پر سوار کرا کے اپنے ہمراہ لایا۔ ارکان دولت نے مبارکبادیں دیں۔ بادشاہ نے اس خوشی میں شہر کے تمام غرباء کے لئے بادشاہی دعوت کے احکام جاری کئے (۱۵)۔

علاقہ زنگیر کی آبادی ورونق

زینہ لنک یا خرم آباد کی تعمیر (۸۴۷ھ) کے بعد جب بادشاہ لولاب کی سیر کو نکلا اور رستہ میں اس نے وٹلب سے لیکر نالہ پہرو کے بائیں ہاتھ میلوں تک کف دست میدان دیکھا اور پانی کا نام ونشان نہ پایا۔ خصوصاً اس وسیع علاقے میں جو چند ایک مواضعات تھے۔ ان کے باشندوں کی تباہ حالی اور ان کی فصلوں کی بربادی نے اس پر بُرا اثر کیا۔ تو اسی وقت اس نے اس خشک وپژمردہ علاقہ کی سرسبزی وشادابی کا ارادہ کر لیا۔

اس علاقہ کو آباد کرنے سے پیشتر اُس نے پُہرو کے مقام سے ایک نہر نکالی جس کا ذکر نہروں کے بیان میں آئے گا۔ ساتھ ہی پہاڑوں کے دامن اور میدان میں

کئی جدید گاؤں آباد کرائے۔ جن کو اس نہر نے مالا مال کر دیا۔

زینہ گیر کی رونق و آبادی میں بادشاہ نے حد سے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ اس علاقہ میں جو باغ اس نے تعمیر کرایا۔ وہ دو میل مربع میں تھا۔ درختوں، پھلوں اور نہروں سے آراستہ باغ کے چاروں کونوں پر بلند عمارات تھیں۔ اردگرد امیروں اور سرداروں کی عمارات گلزاروں کی ترتیب سے آراستہ تھیں (۱۶)۔

جونراج اور شریور نے بھی اپنی راج ترنگینیوں میں زینہ گیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ بادشاہ نے لولاب کے اس جنوبی علاقہ کو آباد کر کے اپنے نام پر موسوم کیا تھا اور یہاں بکثرت نہریں جاری کرائی تھیں (۱۷)۔

مکمل تاریخ کشمیر (۱۸) میں تو اور بھی وضاحت سے زینہ گیر کی آبادی کا ذکر ہے لکھا ہے۔ بادشاہ نے نو آبادی زینہ گیر میں موضع تریہگام (۱۹) کے متصل ایک وسیع اور فراخ باغ بنوایا جو پورے دو میل مربع میں واقع تھا۔ اس کے چاروں گوشوں پر عالیشان اور سر بفلک قصر جن میں سے ہر ایک عجوبہ روزگار تھا، بنوائے۔ ان کے ارد گرد وارا کین دولت اور اعیان مملکت نے بھی اپنی اپنی بے نظیر عمارتیں بنوائیں۔ جنہوں نے اس باغ کو باغ رضواں بنا دیا۔

علاوہ ازیں دیگر ممالک قریب و بعید سے قسم قسم کے میوے دار بوٹے اور رنگ برنگ کے خوشبودار پھول منگا کر لگائے۔ جس سے یہ باغ وادی کشمیر میں بے مثال ہو گیا۔

مرزا حیدر نے بھی باغات و عمارات زینہ گیر کی بہت تعریف لکھی ہے (۲۰)۔

لارنس صاحب نے بھی اپنی کتاب دیلی آف کشمیر میں زینہ گیر کے باغات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ زین العابدین جہاں کہیں گیا، باغات وعمارات بناتا گیا۔ باغات میں اس کے چار باغ اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے۔ (۲۱) باغ زینہ گیر (۲۲) باغ نوشہرہ راجدھانی (۲۳) باغ زینہ پور (۲۴) باغ زینہ کوٹ۔ لیکن آج ان باغات کا کھوج ملنا بھی ناممکن ہے۔

زنگیر میں نیشکر کی کاشت

نیشکر یعنی گنا سرد ملکوں میں نہیں ہوتا۔ آج بھی اس کی کاشت کشمیر میں صرف مظفر آباد تک ہے جو پہاڑی ملک ہے اور گرمیوں کے موسم میں جس کی گرمی پنجاب سے کم نہیں ہوتی۔ مگر وادی کشمیر میں جو بارہ مولا سے اسلام آباد اور پہلگام اور ویری ناگ اور ادھر سوپور سے زینہ گیر اور لولاب اور ادھر مچھی پورہ کے وسیع علاقہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی کبھی پیداوار نہیں ہوئی۔ زین العابدین سب سے پہلا بادشاہ ہے جس نے زینہ گیر کے وسیع باغ میں اس کی کاشت کا تجربہ کیا۔ نیشکر کی فصل ہوئی تو سہی مگر کچھ اچھی نہ ہوئی۔ اس لئے بادشاہ نے اس پر کچھ توجہ نہ کی۔

زونراج نے بھی کشمیر میں نیشکر کے بوئے جانے کا ذکر کیا۔ وہ زینہ گیر کی بجائے مارتنڈ کے اردگرد نیشکر کے پودوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتاتا کہ بادشاہ کو اس میں کامیابی ہوئی کہ نہیں۔ بہر حال ملک سرد ہونے کی وجہ سے نیشکر کی فصل نہیں ہوئی ہوگی۔ مارتنڈ کا مندر کریوہ اسلام آباد میں بہت مشہور ہے۔ مگر کامراج میں بھی بادشاہ نے

مارتنڈ کے نام سے ایک مندر تعمیر کرایا تھا۔ شائد زونراج کا اسی مارتنڈ سے مطلب ہو۔

نہر زینہ گیر کا اجراء

زینہ گیر کی آبادی کیلیئے بادشاہ نے نالہ پہرو سے جو نہر نکالی۔ اس کی بڑی شاخ تو دامن کوہ کے مواضعات کو سرسبز و شاداب کرتی ہوئی سیدھی ولر میں داخل ہوئی اور ان شاخوں نے تمام دیگر ملحقہ دیہات کو جن میں زیادہ تر بادشاہ کے اپنے آباد کردہ تھے اور جو اس وسیع میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ نہال و آباد کر دیا۔ اس زمانے کے کئی گاؤں انقلاب زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو گئے۔ کئی مٹ گئے۔ لیکن آج بھی زینہ گیر میں چالیس سے زیادہ گاؤں آباد ہیں۔

زینہ گیر میں بادشاہی ''زینت محل''

سوپور اور ہندواڑہ کی سڑک پر دائیں ہاتھ جہاں دسواں میل آتا ہے وہیں سے وزیر سوبھا رام کا باغ اور ان کی مزروعہ اراضی شروع ہو جاتی ہے۔ دسویں میل سے چند قدم آگے ہندواڑہ کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ قدیم نہر بڈشاہی کے آثار کے علاوہ سڑک کے کنارے ایک گلا سڑا چنار نظر آتا ہے۔ جس کے نیچے ایک سیاہ پتھر پڑا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ جب ادھر آتا تھا تو اسی چنار کے نیچے جو آج بے برگ و بار ہے اور اسی پتھر پر جو آج تمازت آفتاب سے پھٹا پھٹا دکھائی دیتا ہے۔ نماز پڑھا کرتا

تھا۔اس چناراوراس ''سنگین جائے نماز'' کے پاس ہی ایک قدیم قبرستان کے آثارنظر آتے ہیں۔آج سے پندرہ بیس سال قبل یہاں صرف وزیرسوبھا رام ہی کا باغ تھا اور اس میں بھی اب تک کئی قبروں کے نشان ملتے ہیں۔لیکن اب وہاں دوااور وسیع باغ بن گئے ہیں اور قبرستان کی بہت سی زمین زیر کاشت آگئی ہے۔اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ یہ قبرستان کس قدر وسیع وعریض تھا۔

بہت عرصہ ہوا۔ایک پیرمرد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بزمانہ بڈشاہ دامن کوہ میں ایک بہت بڑاشہر آباد تھا۔اسی برباد شہر کے لوگوں کو فرشتہ اجل نے اس قبرستان میں تھپک تھپک کرسلا رکھا ہے۔تجسس اور کوشش کے باوجود اس سے زیادہ کچھ اور معلوم نہ ہوسکا۔

لیکن ۱۹۴۰ء میں سرینگر میں پھر ایک قدیم بیاض دیکھنے کا موقعہ ملا۔جو بہت بوسیدہ تھی اور جس میں سے اکثر الفاظ پڑھے نہیں جاتے تھے۔اس بیاض میں مولانا ذہنی (۲۵) کے اشعار زنگیر کے زینت محل کے متعلق ملے۔آج بھی اس علاقہ میں جو مزروعہ زمین ہے۔اس کے اکثر حصہ کو زنتہ کھاہی (زینت کھاہ) یعنی آبی مزروعہ زمین کہتے ہیں۔تریہہ گام کے چکوں نے بادشاہ کے اس محل کو آگ لگا کر تباہ کر دیا تھا۔ مغلوں کے زمانہ میں اس کے از سر نو تعمیر ہوئی۔

ذہنی نے تعمیر مکرر پر جو اشعار لکھے۔ان میں سے جو بآسانی پڑھے جا سکے ہیں۔وہ ذیل سے درج کیے جاتے ہیں ؎

نو بہار است وباد محض عبیر نو نگار است وخاک عطر خمیر
لالہ با جام یادہ مست آمد کرو فرموش داغ راتدبیر
نرگس از خواب جُست آشفتہ شدہ سوسن معتبر تعبیر

شاہ زین العبا وصاحب تاج — کہ جہاں را از وبود توقیر
باز از فضل ایز ومطلق — کرد زینت محل دگر تعمیر
زینہ گیراست باغ فرحت بخش — کہ ندارد بزیر چرخ نظیر
داشت ویراں بسیط ہامونے — کرداز آبیاری اش تعمیر
آنکہ دریا بکوزہ مے آرو — بہر لب تشنگاں روئے ضریر
سال تاریخ ایں نبائے متیں — کاخ .... کشمیر
یافت ذہنی زبار گاہ شہی — خلعتِ خاص دولت کشمیر

اس علاقہ کی زیر کاشت زمین میں کہیں کہیں اینٹوں، چونہ اور پتھروں کے نشان ملتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اس زمانہ میں کوئی طویل پختہ فرش نہر کے کنارے تھا اور یہیں کہیں غالباً زینت محل بھی آباد تھا۔

زینہ گیر کی آمدنی وقف تھی

بادشاہ خود عالم تھا۔ وہ علم کا عاشق اور عالموں کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے عالم زانو بہ زانو اور دوش بدوش بیٹھتے تھے اور بادشاہ کو اپنے علم کے کمالات سے خوش کرتے تھے۔ بادشاہ نے جب زینہ گیر کو آباد کیا تو اس نے اس کی تمام آمدنی، تمام محصولات اور تمام فصلیں علماء وفضلاء کیلئے وقف کر دیں۔

زنگیر کے متعلق بادشاہ کا فرمان اپنے جانشینوں کے لئے

شریور نے جہاں کہیں علاقہ زنگیر کا ذکر کیا ہے۔ اس کو جینا (Jaina giri) لکھا ہے۔ بادشاہ کو اس علاقہ کی مستقل فلاح و بہبود اور زمینداروں کی خوش حالی کا یہاں تک خیال تھا کہ اس نے اپنے جانشینوں کے لئے تانبے کی تختی پر فرمان کندہ کرایا۔ یہ فرمان شریور نے سنسکرت زبان میں لکھا ہے۔ ہم اس کا مفہوم انگریزی ترجمہ سے یہاں اردو میں لکھتے ہیں۔

شری زین العابدین اپنے جانشین بادشاہوں سے استدعا کرتا ہے کہ وہ زنگیر کے زمینداروں سے پیداوار کا صرف ۱/۷ حصہ وصول کیا کریں۔ میں نے اس وسیع ٹکڑے کو اپنی ذاتی لاگت سے قابل کاشت بنایا ہے۔ میں نے اس علاقے میں ایک عالیشان محل بھی تعمیر کرایا ہے۔ آنے والے بادشاہوں کو چاہئے کہ وہ اس علاقہ کے علاوہ میرے اس محل کی بھی نگہداشت کریں۔

شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کا یہ فرمان شری وکاشیش نے تانبے کی ایک پلیٹ پر کندہ کرایا۔ یہ فرمان سوپور کے شاہی محل میں موجود رہتا تھا (۲۶)۔

باغ زینہ گیر و عمارات بڈشاہی کی تباہی

وٹلب سے درگہ مولا اور پہروتک جو میدان بالکل خشک اور کشمیر کا گرم ترین حصہ تھا۔ بادشاہ نے نہروں کے اجر، اباغات کے احداث، جدید دیہات کی بستیوں

اور اپنے قیام سے خطہ جنت بنا دیا تھا۔ مگر افسوس چشم فلک اس کو سرسبز و شاداب نہ دیکھ سکی اور بادشاہ کی زندگی ہی میں دو تین مرتبہ اس کے محبوب ترین باغ زینہ گیر اور شاہی محلات کو تباہی و بربادی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جس کی کچھ تفصیل اس طرح ہے۔ کہ موضع تریہگام میں جو زینہ گیر سے تیئس چوبیس میل کے فاصلے پر ہے۔ قوم چک کا رئیس پانڈو چک جو بڑا ذی اقتدار تھا۔ رہتا تھا۔ زینہ گیر میں شاہی عمارات کی تعمیر اور بادشاہ کی بکثرت آمد و رفت سے اس کو اپنی رہزنی اور لوٹ مار میں تکلیف محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب بادشاہ دارالحکومت میں تھا۔ پانڈو چک اپنے اٹھائی گیروں کے ساتھ رات کو آ کر تمام عمارتوں کو جلا کر خاکستر کر گیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ اس نے فوج بھیج کر تریہگام کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن پانڈو چک ہاتھ نہ آیا۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر اپنے اصل وطن دردستان کی طرف بھاگ گیا اور پُر خطر اور ہیبت ناک پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے لگا۔ بادشاہ نے عمارات منہدم کی۔ از سر نو تعمیر کرا دی۔ پانڈو چک کو بھی خبر ہوئی۔ وہ پہاڑوں سے نکلا۔ دن کو چھپ رہتا اور رات کو سفر کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اسی طرح زینہ گیر کی شاہی عمارات تک جا پہنچا۔ اس نے نظر بچا کر پھر آگ لگائی اور دردستان میں بھاگ گیا۔

بادشاہ نے ان عمارات کی پھر مرمت کرائی اور پانڈو چک کی گرفتاری کے احکام سختی سے جاری کر کے حاکم دردستان کے نام ایک تاکیدی حکم بھیجا کہ پانڈو چک جو سلطنت کا بدخواہ اور باغی ہے۔ لوٹ مار پر گزارہ کرتا ہے۔ تمہارے کوہستان میں چھپا ہوا ہے۔ بہتر ہے اس کو جلد تر گرفتار کر کے دارالخلافہ میں بھیج دو۔ ورنہ دردستان تباہ کر دیا جائے گا۔ حاکم دردستان کی بادشاہ کے آگے کیا ہستی تھی۔ اس نے انعام کا لالچ دیکر پانڈو چک کی گرفتاری کا ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ چنانچہ وہ بدکردار اپنی جماعت کے ہمراہ گرفتار ہوا اور پابجولاں بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔

بادشاہ پانڈو چک کی شرارتوں اور بدکرداریوں سے برافروختہ بلکہ آگ بگولا ہورہا تھا۔ حکم دیا کہ اس بدنہاد کو تازیانے لگاؤ اور جب تک اس کے ناپاک جسم سے روح علیحدہ نہ ہوجائے۔ ضرب تازیانے میں کوئی کمی نہ ہو۔

چنانچہ جب اس ناپاک وجود سے دنیا پاک ہوگئی۔ تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی جماعت اور اس کے ساتھیوں کو ایک ایک کرکے لاؤ اور تلوار کے گھاٹ اتارتے جاؤ۔ صرف ان کی عورتیں اور بچے زندہ چھوڑے گئے۔ بادشاہ نے ان کو موضع ہرل پرگنہ وتر میں رہنے کی اجازت دی اور ان کے گزارے کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کردیا۔

بادشاہ کی زندگی میں شاہی عمارات زینہ گیر کے جو صدمات پہنچتے تھے بادشاہ ازسرنو تعمیر و مرمت کراکے ان کی تلافی کردیتا تھا۔ لیکن جب چک بادشاہوں کا زمانہ آیا اور وہ کشمیر کے بادشاہ ہوکر خانہ جنگیوں میں مصروف اور ملک کی آبادی وفلاح سے غافل رہنے لگے۔ تو ان عمارات کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا۔ خصوصاً غازی چک ۱۵۵۲ء لغایت ۱۵۶۳ء کے زمانے میں باہمی حسد وعداوت کی وجہ سے یہ عمارتیں ایسی نذر آتش ہوئیں کہ پھر ان کا وجود قائم نہ رہ سکا اور نہ کسی نے ان کی طرف توجہ کی۔

چک بھی آئے اور اپنی نوبت بجاکر چلے گئے۔ ان کے بعد مغل بادشاہ آئے۔ جو شوق تعمیرات میں بادشاہ بڈشاہ کی طرح دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر ان کو جنوبی کشمیر اور خاص دارالخلافہ کی رونق وآبادی ودلبستگی نے زینہ گیر جیسے خشک علاقے کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ دی۔ ان کا دور بھی ختم ہوا۔ تو درّانی خاندان نے یہاں اپنے قدم جمائیے۔ ان کے عہد میں صرف اتنا ہو کہ حضرت سید حسین صاحب قمی رضوی کی زیارت مبارک کی جو باغ زینہ گیر کے اندر تھی مرمت ہوگئی۔

افغانوں کے بعد کشمیر میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور سکھ یہاں کے بادشاہ بنتے ہیں۔ جن کو قدرتاً اسلامی عمارت سے کوئی دلچسپی نہ ہوسکتی تھی۔ غرض شاہی عمارات وباغات کے جو تھوڑے بہت نشان باقی تھے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ مٹ

گئے۔ یہاں تک کہ اور تو اور زینہ گیر ہی کے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس چھوٹے سے موضع سید پورہ میں کبھی بادشاہی باغات و محلات بھی تھے۔

بڈشاہی عمارات کے موجودہ کھنڈر سید پورہ زنگیر میں

سید پورہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جہاں اڑھائی تین سو نفوس کی آبادی ہے۔ ایک محلّہ سنئیوں کا ہے اور ایک شیعوں کا۔ اور دونوں کی آبادی قریباً قریباً مساوی ہے۔ شیعہ محلّہ کے متصل بہت سے قدیم آثار ملتے ہیں۔ ایک نہر جو آج مسدود ہے وہ بڈشاہ کے زمانے میں باغ کے تمام رقبہ کو سیراب کرتی تھی۔ اس کے شمال کی طرف ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے۔ جو قدیم پتھروں سے اٹا پڑا ہے۔ اس پر توت کے دو درخت ہیں۔ یہ جگہ جو شاہی مسجد تھی۔ آج صرف مٹی کا ایک ٹیلہ ہے۔

اس تیلے سے ذرا آگے حضرت سید حسین قمی کا مزار ہے۔ جس کی بیرونی دروازے کے ساتھ بعض ایسے پتھر ہیں جو تراشیدہ ہیں۔ ایک پتھر تین گز سے بھی طویل دیکھا گیا۔ زیارت کے باہر چنار کا ایک درخت ہے۔ جو بہت پرانا ہے۔ یہاں مشہور ہے کہ یہ درخت بڈشاہی کے زمانہ کا ہے اور حضرت سید حسین اس کے نیچے کبھی کبھی قیام فرمایا کرتے تھے۔

زیارت کے عقب میں مسدود نہر کے اندر ایک کنواں ہے۔ جس کا پانی نہایت سرد اور شیریں ہے۔ اس کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ بھی بہت قدیم ہے۔ کنوئیں کی منڈیروں پر لکڑیوں کی بجائے لمبے لمبے قدیم وضع کے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔

کنوئیں کے بالمقابل نہر کے پاس مگر نہر کے عین کنارے زیارت سے مغرب کی طرف مسجد کے ٹیلے کی طرح ایک بلند ٹیلہ ہے۔ جس کو بادشاہی ٹینگ یعنی

بادشاہی ٹیلہ کہتے ہیں۔ یہی بڈشاہ کے محلات تھے۔ اس ٹیلے کے ساتھ ہی ایک قبرستان ہے جس کی زمین سے عوام پتھر وغیرہ نکالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف نے بھی چند پتھر جو بہت پرانے تھے۔ یہاں منتشر حالت میں دیکھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں کی ایک طویل دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ غرض جہاں شاہی محلات تھے۔ اب وہاں قبرستان ہے۔

بادشاہی ٹیلے سے کچھ فاصلہ پر جنوب کی طرف کچھ فاصلہ پر نشیبی زمین ہے۔ جس کو وزیر ڈب کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ اردو میں وزیر منزل ہی ہوسکتا ہے۔ غالباً یہاں وزیراعظم یا دیگر وزراء کے مکانات ہوں گے۔

حضرت سید حسین قمی کے روضہ پر سنی مسلمان بھی آتے ہیں۔ لیکن اہل تشیع میں روضہ کی بڑی وقعت ہے۔ کشمیر کے علاوہ سکردد بلتستان تک کے شیعہ یہاں آتے ہیں۔ لارنس صاحب نے اسی زیارت کی وجہ سے دو بندوبستوں تک اس گاؤں کو مالیہ میں رعایت دی تھی۔

موضع براٹ (متصل سید پورہ) سے لیکر نالہ پُہر و یعنی شمالی حدود سوپور تک جو دواڑھائی میل کا فاصلہ ہے۔ وہاں پرانے زمانے کے کچھ آثار کبھی کبھی ملتے رہتے ہیں۔ مثلاً زمین کھودنے پر مٹی کے بڑے بڑے برتن اور تراشیدہ پتھر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باغ اور عمارت کی حدود موضع براٹ تک تھیں۔ جہاں اب بھی قدیم زمانہ کے کئی پتھر پڑے ہوئے ہیں۔

گاؤں کے اکثر مکانات کی پہلی منزلیں پتھر کی ہیں اور گاؤں کے نزدیک جس قدر کھیت ہیں۔ ان سب کی چار دیواری بھی بالعموم پتھروں ہی سے بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ سید پورہ کوہستانی نہیں۔ میدانی علاقہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ زینہ گیر کی چہار دیواری یا سرکاری عمارات کے جو پتھر تھے۔ وہ انہدام کے بعد

گاؤں والوں نے آپس میں تقسیم کر لئے ہیں۔ آہ! سچ کہا ہے مرزا داغ نے ؎

فلک نے لوٹ کے کٹوا دیا حسینوں سے
سمجھ لیا کسی مردہ کا اس نے مال مجھے

کشمیر میں پُلوں کی تاریخ

کشمیر کے ایسے مقامات میں جہاں دریاؤں اور نالوں نے خشکی کا سفر تکلیف دہ بنا رکھا ہے۔ زمانہ قدیم میں کشتیاں جو مسافروں کو دریاؤں اور ندی نالوں سے آر پار لے جایا کرتی تھیں بعض مخیرّ لوگوں کی طرف سے اور ان کی کثیر تعداد والئے ملک کی طرف سے عوام کی آسائش کیلئے ہوتی تھی۔ آج بھی یہ کیفیت نالہ پُہر و اور بعض دوسرے نالوں پر جہاں پُل کم ہیں یا نہیں ہیں۔ دیکھی جا سکتی ہے۔

ہندو عہد قدیم کے پُل

ہندو عہد قدیم میں دریا پر کوئی پختہ پل نہ ہوتا تھا۔ بلکہ کشتیوں کے پل ہوتے تھے اور ان کشتیوں کو زنجیروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے باندھ دیا جاتا تھا۔ کلہن اور شریور کی راج ترنگنیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دشمن کی طرف سے خطرہ ہوتا یا آگ کے پھیل جانے اور پل کے جل جانے کا اندیشہ ہوتا۔ تو ان پلوں کو فوراً توڑ دیا

جاتا تھا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پل مستقل نہیں عارضی ہوا کرتے تھے۔

البتہ راجہ پرورسین ثانی (۲۷) کے زمانے میں کشتیوں کے ایک بہت بڑے پل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔جس کا نام راجہ نے بھرت ستھو رکھا۔ برت یا بھرت کون تھا اور پل کا نام اس نام پر کیوں رکھا گیا۔اس کے متعلق اوروں کا تو کیا ذکر کشمیر کا قدیم اور نامور مورخ پنڈت کلہن تک بھی خاموش ہے (۲۸)۔ یہ پل دریا کے کس حصہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔اس کا کچھ پتہ نہیں۔تاہم اندازہ لگایا جاتا ہے کہ مائسمہ (۲۹) میدان سے جس کا نام اس زمانہ میں جزیرہ ''کشک سوامن تھا'' دور فاصلہ پر تھا۔

سیٹن صاحب کا خیال ہے کہ پرورسین کا پل موجود چوتھے اور پانچویں پل کے قریب کہیں واقع ہوا۔ یہ جگہ شہر کے عین مرکز میں ہے۔

۱۱۲۳ء میں راجہ سسل کا عہد تھا۔ کہ سرینگر میں عظیم آتشزدگی کا وقوعہ ہوا۔شہر کے مٹھ مندر، مکانات، منڈیاں اور دوسری عمارات سب جل کر راکھ ہو گئیں۔ آگ کے خوف سے بہت سے دریائی غسل خانے نے اور کشتیوں کے پل بچالئے گئے۔لیکن یہ بھرت ستھو جو کشتیوں کا عظیم الشان پل تھا۔اس تباہ کن آتشزدگی سے نہ بچ سکا اور تباہ ہو گیا۔

اسلامی عہد کا سب سے پہلا پُل

اسلامی عہد میں سب سے پہلے سلطان سکندر نے پلوں کو عام کیا اور فقط ڈل میں کئی پل بنوائے۔ایک پل نالہ مار پر بھی بنوایا۔ جسے چودھری مہیش نے ۱۰۸۵ھ میں

بعہد عالمگیر مرمت کرایا۔

علی شاہ کی سلطنت چھ سات سال سے زیادہ نہ رہی۔ تاہم ۸۲۶ھ یعنی مرنے سے پیشتر جو چند کام اس نے اچھے کئے۔ان میں ہنرتارابل کے چار پل (۳۰) دریائے بہت کا ایک پل بھی تھا۔ جو اس نے کشتیوں کی بجائے لکڑیوں سے تعمیر کرایا اور اس کا نام اس نے اپنے نام پر عالی کدل رکھا۔

معلوم ہوتا ہے۔اس زمانے میں ہندو عہد قدیم کے پل یا تو آتشزدگی کی نذر ہو چکے تھے یا طوفان آب کے باعث دریا میں بہہ گئے تھے۔ کیونکہ کوئی مورخ اس وقت کسی قدیم پل کی موجودگی کا پتہ نہیں بتاتا۔ بلکہ ایک مورخہ جس کی تصنیف کو آج دو سو سال گزر چکے ہیں۔لکھتا ہے۔ جب زین العابدین تخت نشین ہوا۔تو شہر میں صرف ایک ہی پل تھا جس کا نام عالی کدل تھا اور جس کو بڈشاہ کے بھائی علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔لوگ بالعموم دریا کو سفینہ اور کشتیوں کے ذریعہ عبور کیا کرتے تھے۔

بڈشاہ کا زینہ کدل

زین العابدین نے بادشاہ ہو کر دریا کو کشتیوں کے ذریعہ عبور کرنے کی جو مشکلات تھیں۔ان پر غور کیا اور اس مقام پر جہاں مہاراج گنج آباد اور مزار السلاطین واقع ہے۔ایک مستقل پل دریا پر تعمیر کرایا۔اور نام اس کا اپنے نام پر زینہ کدل رکھا اور اس کو اس شوق اور محنت اور لاگت سے بنوایا کہ یہ پل بھی اس کے ہفت زینوں میں شمار ہونے لگا۔

سرینگر میں دریائے جہلم پر سات پل ہیں۔ سب سے پہلا پل ۸۲۶ھ سے پیشتر تعمیر ہوا۔ اس کے بعد مختلف بادشاہوں نے پلوں میں اضافہ کیا۔ چنانچہ ۵۰۰ سال سے یہی سات پل سرینگر میں بغیر کمی بیشی کے موجود ہیں۔ زینہ کدل (۳۱) آج دریا کا چوتھا پل ہے۔ یہ پل سب پلوں سے زیادہ بارونق اور آباد ہے۔

شریور نے بھی اپنی راج ترنگنی میں اس پُل کا ذکر کیا ہے۔ سیٹن صاحب ترجمہ راج ترنگنی کے نوٹوں میں لکھتے ہیں۔ اس کی ساخت ایسی ہی ہے۔ جیسی آج کل کشمیر کے پلوں کی ہوتی ہے۔ ہندو انجینئر پتھر کا کام کرنے اور سنگتراشی کے کام میں صاحب کمال تھے۔ اس زمانہ میں دریا پر اتنا لمبا چوڑا پل پتھروں کا بننا چونکہ دشوار تھا۔ اس لئے وہ کشتیوں کے پل بنوا کر کام لیتے رہے۔ لیکن جب مسلمان آئے تو وہ لکڑی کا کام زیادہ اچھی طرح کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ بآسانی اس مشکل پر غالب آ گئے۔

بڈشاہی ہفت پل

اس پل کے علاوہ بڈشاہ نے جس شوق سے اس پل کو تعمیر کرایا تھا۔ اور پھر اپنے فرزند کے حملوں سے شہر کو بچانے کیلئے جن مجبوریوں کے ساتھ اس کو توڑا۔ اس کا ذکر باب ہشتم میں ہو چکا ہے۔ اس بادشاہ نے نالہ مار پر سات حجری پل تعمیر کرائے۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

نائد کدل، بوری کدل، صراف کدل، کاویری کدل، راجویر کدل (۳۲)، کاوہ ڈار کدل۔ ان کے علاوہ بادشاہ نے شادی پورہ، سوپور، نائد کھائی، ہارتار، جوگی لنکر (سرینگر) اور کئی مقامات پر بہت سے پل تعمیر کرائے۔ انقلاب گیتی نے آج ان کو بھی معدوم کر دیا ہے۔

اندرکوٹ میں دودھ اور شربت کے حوض

زین العابدین عجیب قسم کی طبیعت لے کر آیا تھا۔ شریور لکھتا ہے جیاپیڈ پور میں بادشاہ نے دو حوض تعمیر کرائے۔ ایک حوض میں دودھ بھرا رہتا تھا اور ایک میں کوئی نہ کوئی شربت موجود رہتا تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں ہر شخص ہندو ہو یا مسلمان۔ یہاں سے مفت حاصل کر سکتا تھا۔

جامع مسجد بارہ مولا

یہ معلوم نہیں کس سال بادشاہ نے بارہ مولا کی جامع مسجد تعمیر کرائی۔ لیکن اس قدر سب مورخ لکھتے ہیں کہ "بنائے اوّلش از بڈشاہ بود"۔ بڈشاہی خاندان تک اس کی حالت اچھی تھی۔ چکوں کے عہد میں یہ مسجد مسمار ہونے لگی۔ جب مغل حکومت کا یہاں دور دورہ ہوا تو اس کی از سرنو مرمت ہوئی۔ سکھوں کے زمانہ میں شیخ غلام محی الدین ناظم کشمیر نے اس کی چھت کو درست کیا۔ ۱۳۰۲ھ میں کثرت بارش وژالہ باری نے اس کو سربسجود کر دیا۔ ۱۳۱۲ھ تک یہی حالت رہی۔ ۱۳۱۳ھ میں خواجہ عبدالصمد ککڑو مرحوم رئیس بارہ مولا نے اس کو پھر زندہ کر دیا۔ مرمت مسجد کا قطعہ تاریخ حسب ذیل ہے۔

سجدہ شکر سرکن اے سامع کا ختر رانجا شدہ لامع
کرد اندر بنائے مسجد جد خواجہ عبدالصمد زہے ہامع ۱۳۱۳ھ
زوندا ملہم از سر تعمیر گشتہ معمور مسجد جامع

تصنیف کتاب کے دوران میں جامع بارہ مولا کی حالت پھر خستہ وخراب دیکھی گئی۔

جامع مسجد سرینگر

اس مسجد کی بنا جو آج روئے زمین کی بہترین اور قابل دید عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ کے ایماء سے سلطان سکندر بُت شکن نے رکھی تھی۔ حضرت خواجہ صدر الدین کہ خراسانی النسل تھے اور کشمیر میں اقامت گزین تھے۔ اس کے میر عمارت تھے۔ ابھی مسجد نا تمام تھی کہ سلطان بُت شکن کا انتقال ہو گیا۔ آخر ''بادشاہ روئے زمین حضرت سلطان زین العابدین'' کے عہد میں یہ مسجد خواجہ صدر الدین (۳۳) کی زیر نگرانی کہ ''در صنعت معماری نظیرش نہ بود'' تکمیل کو پہنچی۔ سچ ہے

اگر پدر نتو اند پسر تمام کند

بڈشاہ نے تکمیل جامع کی طرف تخت نشین ہوتے ہی توجہ کی۔ جیسا کہ صاحب التواریخ خلیل لکھتے ہیں۔ ''دے در ۸۳۸ھ مسجد جامع را مرمت کرد ترمیم المسجد تاریخ اوست''۔ بادشاہ نے مسجد سے شمال کی طرف ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ جس کی نگرانی اور اعلیٰ مدرسی قاضی محمد علی بخاری کے سپرد ہوئی اور جنوب کی طرف دارالافتا قائم کیا۔ جہاں چار عالم اور مفتی احکام شریعت کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔

تاریخ حسن میں ہے۔ '' از تعمیرات سلطان زین العابدین بارہا ترمیم (۳۴) یافت''۔ صاحب تواریخ خوارق السالکین لکھتے ہیں۔ حضرت سید محمد

نورستانی بھی جو مسجد کے کارکنوں میں تھے۔ اپنے مرشد خواجہ صدرالدین کے ہمراہ۔ بہ عہد بڈشاہ کشمیر میں اقامت گزین تھے۔ جامع شوپیاں کی مرمت کے زمانے میں مزدوری کرتے تھے۔ جو کچھ کماتے تھے فقراء کو تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کی فیاضیوں بلکہ ان کی کرامتوں کے متعلق مشہور ہے۔

گدائیے در مے خانہ طرفہ اکسیر است
گر ایں عمل بہ کنی خاک زر توانی کرد

خانقاہ شیخ نورالدین ولی شیخ العالمؒ

بادشاہ حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کا جو عوام میں شیخ العالمین کے لقب سے مشہور ہیں۔ بہت عقیدت مند تھا۔ ان کا عالیشان مقبرہ سب سے پہلے اسی نے تعمیر کرایا۔ جس محبت وخلوص سے بادشاہ نے اس مزار مبارک کی تعمیر میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور جو نقش ونگار اس نے مزار کی عمارت میں پیدا کئے اور نجاروں نے لکڑی کے کام میں اپنا کمال جس خوبی سے ظاہر کیا۔ اگر بڈشاہی عہد کی یہ تعمیر آج بجنسہ موجود ہوتی۔ تو اس زمانے کی صنعت کاری آج ہمارے لئے سبق آموز واقعہ ہوتی۔ لیکن افسوس بقول تاریخ حسن ''ایں خانقاہی درعہد چکاں بحادثہ آتش افروختہ شد''۔ یعقوب شاہ چک بادشاہ کشمیر نے اپنے غیر مطمئن عہد حکومت میں اس تعمیر کی پھر تجدید کی۔ ۱۱۳۹ھ میں کہ مغلوں کی حکومت تھی اور محمد شاہ بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہند تھا پھر اس کو حادثہ آتش سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک وسیع اور دو منزلہ چوبی مسجد بھی اس کے

ساتھ ملحق تھی۔ اس کا بھی کچھ حصہ جل گیا۔ آخر خدا کے دو بندوں خواجہ غلام وخواجہ محمود نے کہ اہل دل رئیسوں میں سے تھے۔ اس خانقاہ کی تجدید کی۔ ۱۸۲۶ء میں اس عالیشان روضہ کی مرمت پھر پبلک چندے سے ہوئی اور باوجود حکومت یا کسی بہت بڑے رئیس کے حصہ نہ لینے کے بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔

خانقاہ فیض پناہ

میر محمد امین اویسیؒ اپنے پیر طریقت سید ہلال کے پاس کہ صاحب علو حال اور آسمان کمال تھے۔ موضع اشم میں (جو پرگنہ محمد آباد کے نام سے بھی موسوم تھا) اکثر رہا کرتے تھے۔ اور چونکہ بادشاہ کو میر اویسیؒ کی خاطر حد سے زیادہ منظور تھی۔ اس لئے بادشاہ نے موضع مذکور میں ایک عالیشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ جو نقش ونگار سے آراستہ اور فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ (۳۵) تھی۔ اس خانقاہ میں مسجد مدرسہ اور طلباء کیلئے حجرے اور درویشوں اور خادموں کے لئے مکانات تھے۔ نام اس خانقاہ کا تاریخوں میں خانقاہ فیض پناہ درج ہے۔ یہ خانقاہ دریائے بہت کے مشرقی کنارے (۳۶) پر تھی۔ حضرت میر اویسیؒ کے انتقال کے بعد اس کی رونق کم ہوگئی۔ جہانگیر کے زمانے میں حضرت خواجہ خاوند محمود اس کے چوب وچگل اٹھا کر شہر میں لے آئے اور خانقاہ نقشبندیہ کی بنا ڈال گئے۔

خانقاہ سید برخوردارؒ

اس عمارت کی ۸۶۹ھ میں بادشاہ نے تکمیل کی۔ سید برخوردارؒ اس زمانے

میں بہت بڑے صاحب یمین و برکت بزرگ تھے۔ بادشاہ نے ان کے خادموں اور ان کے لنگر وغیرہ کے لئے محلہ دانا میں یہ عالیشان خانقاہی تعمیر کرائی۔

خانقاہ سیّد مدنیؒ

حضرت سید مدنیؒ بہت بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ سلطان نے ۸۴۸ھ میں جو ۱۴۴۴ء کے مطابق ہے۔ یہ خانقاہ بصورت مسجد نبوی اس لئے کہ حضرت سید محمدؒ مدینہ شریف کے رہنے والے تھے۔ آپ کے خدام کے لئے تعمیر کرائی۔

اسرار الابرار میں آپ کے حالات بالتفصیل درج ہیں۔ آپ سلطان سکندر بُت شکن کے زمانہ میں امیر تیمور صاحب قرآن کی طرف سے بطور سفارت بادشاہ کشمیر کے پاس آئے تھے۔ یہ مقام بہت پسند آیا۔ اس لئے وطن واپس جا کر اہل وعیال کو ہمراہ لے آئے اور مدینہ واری میں قیام فرمایا۔ سکندر نے جب اپنے امراء وزرا اور جاسوسوں کے ذریعہ معلوم کیا کہ آپ انیس الورع اور عارف حق اور موحد مطلق ہیں۔ تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے قرب و جوار میں ان کے لئے عالیشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ چنانچہ آپ رینہ واری سے نوشہرہ میں تشریف لے آئے۔ آپ کا مزار بڈشاہ کے زمانے میں تعمیر ہوا۔

حضرت سید مدنیؒ کا مقبرہ ایک چھوٹی سے عمارت میں ہے جو شاید اپنی شکستگی اور تباہ عالی کی وجہ سے فراموش کر دیا گیا ہے۔ بقول مسٹر نکولس (۳۷) اس کی رنگین ٹائیلوں کا کام ایک قدامت پسند کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا سرمایہ ہے۔ اس رنگین

کام کے بعض حصے اب بھی مقبرہ کی دیواروں پر اپنے مختلف شوخ رنگ مٹے ہوئے نقش ونگار کی صورت میں دکھا رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹائیلوں کا کام مغلیہ عہد سے قبل بھی کشمیر میں رائج تھا۔ اس قسم کی قدیم صنعت اب کشمیر میں اس درجہ معدوم ہے کہ مزار السلاطین کے دومٹ اور اس عمارت کے سوا اس قسم کی کسی اور عمارت کا نشان ملنا قریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ (۳۸)

نج بہاڑہ میں بڈشاہی عمارت

نج بہاڑہ میں بادشاہ نے کسی بزرگ کے لئے خانقاہ تعمیر کرائی یا اپنے لئے کوئی محل تعمیر کرایا یا سیر و سیاحت کے لئے رستہ میں کوئی آرام گاہ بنائی۔ اس کے متعلق صحیح حالات نہیں ملے۔ البتہ مولانا داؤد مشکوٰتی جو بڈشاہ سے قریباً پونے دوسو سال کے بعد شاہجہاں کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ نج بہاڑہ میں بڈشاہی عمارت کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ سیر تبت سے واپس آکر جب میں حضرت شیخ نصر الدین ابوالفقراءؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو شنگر ریشی قدس سرہٗ کہ وہ بھی حضرت کے مریدوں میں تھے۔ حضرت کی ملازمت میں موجود تھے۔ شنکر ریشی نے مجھ سے کہا۔ تمہارے آنے سے پہلے میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ حضرت شیخ نے نج بہاڑہ میں ایک شاندار عمارت بنائی ہے اور اس جگہ جہاں سلطان زین العابدین نے اپنے زمانے میں ایک عمارت کہ منظر ہائے گوناگون رکھتی تھی۔ تعمیر کرائی۔ آپ نے بھی برج ہائے بلند اور مینار ہائے فلک نما قائم کئے ہیں۔ مولانا داؤد مشکوٰتی فرماتے ہیں کہ میں

نے عرض کیا کہ یہ جگہ خوب ہے۔ یہیں قیام کرنا چاہئے۔ یہ سن کر حضرت شیخ ابوالفقراءؒ نے میرے جواب کو قبول کیا۔ لیکن فرمایا کہ اس خواب کی تعبیر اگر تم بتا سکتے ہو۔ تو بتاؤ۔ میں نے عرض کیا۔ قصر سلطان رتبۂ عالی کی علامت ہے۔ شنگر ریشی نے کہا۔ یہ بھی خوب ہے لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ حضرت شیخ اب ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔ اس لئے ان کا آخری قیام اسی بج بہاڑہ میں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا (۳۹)۔

سوپور میں بادشاہی محل

راجہ اونتی ورما کے انجینئر سویہ نے سوپور کو آباد کیا۔ پہلے اس کا نام سویہ پور تھا۔ رفتہ رفتہ سوپور ہو گیا۔ اسی مقام پر قدیم زمانہ ہنود کا دریائے وتستہ مسلمان عہد حکومت کا دریائے بہت اور زمانہ حال کا دریائے جہلم جھیل ولر کے بحر بے پایاں سے باہر نکل کر پنجاب کو روانہ ہوتا ہے۔ سوپور کسی زمانے میں بہت نامور شہر رہا ہے۔ اب بھی اس کی آبادی دس گیارہ ہزار سے کم نہیں ہے۔ اس کی آتش زدگیاں زمانہ قدیم ہی سے مشہور چلی آتی ہیں۔

زین العابدین نے سوپور کو بہت رونق بخشی تھی۔ بقول مورخ شریور کرم راجیہ یعنی کمراز کا سرکاری ہیڈ کوارٹر ان دنوں سوپور ہی تھا۔ تمام دفاتر اور تمام سرکاری محکمے اسی جگہ تھے۔ بادشاہ نے خود بھی دریا کے کنارے ایک قصر شاہی تعمیر کر رکھا تھا اور جب کبھی اس طرف آتا تھا۔ اسی جگہ قیام کرتا تھا۔

سوپور میں آتشزدگی سے قصبہ کی تباہی

شریور لکھتا ہے بڈشاہ کے زمانے میں یہاں ایک عظیم آتشزدگی ہوئی۔ سارا شہر جو بلند ورفیع تر مکانات سے آراستہ تھا۔ چشم زدن میں خاک اور خاک سے راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔ سرکاری دفاتر اور محکمہ جات کی عمارتوں کے ساتھ ہی تمام سرکاری کاغذات بھی جل گئے۔ صرف محل شاہی جو عام مکانات سے بہت دور دریا کے کنارے ایک طرف واقع تھا۔ بچ رہا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ بہت افسوس کیا اور شہر کو از سرنو بڑی شان وشوکت سے تعمیر کرایا۔

شریور سوپور کی آتشزدگی کے متعلق لکھتا ہے۔ سرکاری دفاتر کے تمام کاغذات اور بھوج پتروں پر جو تحریریں اور احکامات تھے۔ وہ الماریوں سمیت جل گئے۔ بادشاہ نے ان قیمتی تحریروں کے ضائع ہونے پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کسی توقف کے بغیر اس کو از سرنو تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ کی توجہ اور شاہی اعانت نے اس کو پھر ایک خوبصورت شہر بنا دیا۔

چونکہ سیلاب اور زلزلوں کی تباہ کاریوں کے باعث کشمیر کی عمارتوں میں لکڑی کثرت سے لگائی جاتی ہے اور لوگ برفانی سردی سے بچنے کی خاطر کانگڑی کے استعمال کے لئے بھی مجبور ہیں۔ اس لئے آتشزدگی کے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم شاہی عمارات اور محلات کے بھی کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ راقم کے دیکھتے ہی دیکھتے سوپور کئی دفعہ آتشزدگی کے حادثات سے دوچار ہوا اور کئی دفعہ از سرنو تعمیر ہوا۔

سوپور میں جھولے کے بڈشاہی پُل

سوپور کی آتشزدگی نے دریا کے پل پر بھی اثر کیا۔ بلکہ پل کا کثیر حصہ جل گیا جس سے دریا ناقابل عبور ہو گیا۔ بادشاہ نے جلے ہوئے پل کی جگہ لوہے کے تاروں سے جھولے کا پل تعمیر کرایا۔ اور حکم دیا کہ پل کے عین درمیان ایک محل تعمیر کرایا جائے۔ شریور ایک جگہ دو پُلوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے بادشاہ نے دریا پر دو جُھولے دار پل تعمیر کرائے۔ جن کے درمیان ایک شاہی (۴۰) مکان بھی تھا۔

معلوم ہوتا ہے کشمیر میں اور شاید ہندوستان میں بھی یہ پل سب سے پہلا جھولے دار پل تھا۔

بارہ مولا میں بڈشاہی محل

بادشاہ نے ایک محل بارہ مولا (۴۱) میں تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ اس کو گرا کر اس کے مصالحہ سے سوپور میں ایک اور محل تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ اسی محل کے کمروں پر سرکاری کاغذات رکھے گئے اور دفاتر قائم کئے گئے۔

اندرکوٹ یا جیاپیڈ پور میں بڈشاہی محل

کلہن نے راج ترنگنی میں اس شہر کے متعلق لکھا ہے کہ راجہ جیاپیڈ نے اس کو

جھیل کے وسطہ میں راکششوں کی مدد سے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں بہت سے مندر بھی تھے۔راجہ کے علاوہ وزراء کی عمارتیں بھی تھیں۔ جیا پیڈ کے نام کی رعایت سے اس کا نام جیاپور پیڈ رکھا گیا۔مگر وہ زیادہ مشہور نہ ہوا۔ بلکہ جھیل کے وسط میں ہونے کی وجہ سے عوام اس کو ابھنیتر کوٹ یا اندرونی قلعہ کہنے لگے۔اور یہی نام اس شہر کا مشہور و مقبول ہوگیا۔ابھنیتر کا لفظ رفتہ رفتہ اندر کے لفظ سے بدل گیا اور ابھینتر کوٹ کی جگہ اندرکوٹ کے نام نے شہرت حاصل کرلی۔ یہ شہر راجہ جیا پیڈ نے دریائے وتستہ کے بائیں کنارے شادی پور سے نیچے پانچ میل کے فاصلہ پر آباد کیا تھا۔اس کے چاروں طرف پانی تھا۔اس راجہ کے بعد کئی اور راجاؤں کی بھی یہاں سکونت رہی ہے۔

کشمیر کی آخری ہندورانی کوتا اسی اندرکوٹ میں رہتی تھی اور یہیں ۱۳۳۹ء میں وہ اس جہان سے رخصت ہوگئی۔اس زمانہ تک یہ مقام کچھ نہ کچھ آباد تھا۔لیکن جب سلطنت کا انقلاب ہوگیا۔تو اس شہر میں تغیر عظیم واقع ہوا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ اپنے انتہائی زوال کو پہنچ گیا۔

بڈشاہ کا زمانہ آیا۔تو جہاں رعایا کو امن چین سے سانس لینا نصیب ہوا وہاں قدیم عمارات کی بھی خدا نے سنی۔ اندرکوٹ کے متعلق شریور اپنی راج ترنگنی میں ترنگ (۴۲) میں لکھتا ہے کہ سلطان زین العابدین نے اس شہر کو جو زوال پذیر ہو چکا تھا۔ازسرنو بحال کیا۔ یا بہ الفاظ دیگر جو مندر منہدم ہو گئے تھے۔ان کی مرمت کرائی۔ شاہی مکانات کی جن کے کھنڈران کی فلک نمائی کا پتہ دیتے تھے۔سابقہ شان پیدا کر دی۔لوگ جو شکستہ دل تھے۔ان کی ہر طرح تسلی کی اور ان کو وہاں آباد کیا۔

اس کے بعد شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اس کے بعد جھیل کے کنارے اپنے لئے ایک نیا شاندار محل تعمیر کرایا۔بادشاہ کو فن تعمیرات سے جو ذوق ہے اس کا ذکر

پہلے ہو چکا ہے۔ وہ لکڑی سے منقش کام لینا خوب جانتا تھا۔ جس کو شریور شان دار محل لکھتا ہے۔ اس میں خدا جانے بادشاہ نے اپنی خوش سلیقگی اور خوش مذاقی اور تعمیری دلچسپیوں کے کیا کچھ ثبوت نہ دیئے ہونگے۔

شیریور اس مقام یعنی اندرکوٹ کا نام اپنی تاریخ میں ہر جگہ جیاپیڈ پور لکھتا ہے۔ یہاں بادشاہ نے پتھروں کا ایک بلند چبوترہ اپنی نشست کے لئے بنوایا۔ جھیل سے سیلابی پانی نکال کر اس کو خشک کیا اور اس کے گرد سرکاری دفاتر کیلئے مکانات تعمیر کرائے۔ بادشاہ یہاں ہر سال ناگ یاترا اور گھن چکر کے تہواروں پر ہندو عابدوں اور تپسؤں کو پانچ دن تک متواتر اپنی طرف سے شاہی دعوت دیا کرتا تھا۔

اندرکوٹ (۴۳) آج بھی موجود ہے اور نالہ شادی پور (۴۴) کے کنارے آباد ہے۔ یہاں شیعہ مسلمانوں کی بھی بستی ہے۔ قدیم زمانہ کے آثار بھی دیدۂ عبرت کیلئے بڑے بڑے گراں ڈیل پتھروں کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ مقام سنبل سے جنوبی وغربی گوشہ کی طرف واقع ہے۔ بڈشاہ کا شاندار محل راجہ جیاپیڈ کے فلک مرتبہ ایوانات امراء وزرا کی عالیشان عمارتیں سب اپنے بانیوں کے ساتھ پیوند خاک ہو چکی ہیں۔ اگر کچھ پتہ ملتا ہے۔ تو انہی بکھرے ہوئے پتھروں کی زبانی سے۔ جو بقول شاعر؎ مرمٹوں کا نشان ہیں گویا۔

اونتی پورہ میں باغ بڈشاہی

یہ مشہور و آباد قریہ سرینگر سے جانب جنوب بفاصلہ بیس میل دریائے جہلم کے

مشرقی کناروں پر اسلام آباد کو جاتے ہوئے برسر راہ آتا ہے۔ راجگان ماسبق کے عہد حکومت میں ورما خاندان کے نامور راجہ اونتی ورما کا دارالحکومت بھی رہا ہے۔ امتداد زمانہ اور انقلاب حکومت کے ہاتھوں یہ بھی بے رونق وغیرہ آباد ہو گیا۔

بڈشاہ نے جہاں اور پرانے استخوانوں میں جان ڈالی۔ اس قریہ کی طرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ یہاں ایک اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر باغ تعمیر کرایا۔ اس باغ کے عین وسط میں تعمیرات شاہی نے قریہ کی رونق دوبالا کر دی۔ میر سید حسن منطقی بیہقیؒ کیلئے بھی باغ میں ایک مکان بنوایا۔ آپ بالعموم یہیں رہا کرتے تھے۔ اسی مکان میں آپ نے وفات پائی اور بالآخر اسی باغ میں دفن (۴۵) ہوئے۔

ڈل میں بادشاہی عمارت یعنی سونا لنک

ڈل بظاہر ثقیل سُست اور بھدا سا نام ہے۔ لیکن اپنے پانی کی صفائی اور لطافت اور اپنی بیش بہا پیداوار اور اپنی زمین چرائے جانے کی وجہ سے تمام کشمیر میں بلکہ دور دور مشہور ہے۔ ڈل کا طول مشرقی سمت گگری بل سے لے کر نشاط باغ کے دروازہ تک ۲ میل اور اس کے دور (محیط) کا اندازہ محققین نے دس میل تک لگایا ہے۔

زمانہ سلف میں جب کشمیر کا پانی کم ہو کر یہاں خشک زمین نکلی۔ تو ڈل کا موجودہ طول وعرض بھی ایک وسیع میدان بلکہ صحرا تھا۔ پرانی کتابوں میں نام اس صحرا کا "تالتی مرگ (۴۶) درج ہے۔ جب راجہ پرورسین (۴۷) نے دریائے وتستہ کا پانی کوہ ماران کے نیچے لانے کی تجویز کی۔ تو ناوہ پور کے مقام پر ایک طویل ومضبوط بند

بنایا۔ جس نے دریا کے پانی کو پہاڑ کے قدموں میں لاکر بچھا دیا۔

راجہ درلب (۴۸) درون کے زمانے میں جب باوجود بہت سی احتیاطوں کے نہ تھمنے اور نہ رُکنے والی طغیانی آ گئی۔ تو یہی میدان جہاں پرورسین کے زمانے سے سرف تھوڑا سا پانی وہ بھی کوہ ماراں کے دامن میں جمع رہتا تھا۔ ایک وسیع اور طویل وعریض جھیل بن گیا۔

جھیل ڈل میں بادشاہ کی سیر

شریور لکھتا ہے۔ اس ملک میں ایک بڑی گہری جھیل ہے۔ جس کا نام ڈل ہے اور جو ازمنہ قدیم میں سریش وری کے نام سے مشہور تھی۔ ڈل کے کنارے شریش وری کا جو تیرتھ ہے۔ بادشاہ نے وہاں وہار قائم کیے۔ اس تیرتھ ہی کی وجہ سے ڈل کا نام بھی سریش وری تھا۔ بادشاہ شاہی کشتی پر سوار ہو کر ڈل کی سیر کیا کرتا۔ اس زمانے میں ڈال دارالحکومت یعنی نوشہرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ بادشاہ کی کشتی شاہی جھنڈے کی وجہ سے دُور ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔

ڈل میں سونہ لنک وروپہ لنک (۴۹)

ڈل تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک ڈل کلاں جس کے کنارے حضرت بل

اور نسیم باغ واقع ہیں۔اس کا نام سونہ لنک بھی ہے۔دوسری ڈل خورد جس کا احاطہ کوہ سلیمان یا ہری پربت سے نشاط باغ تک پھیلا ہوا ہے اور جس کے ایک کنارے گپکار واقع ہے۔اس کا نام روپہ لنک ہے۔تیسرے سدرہ کھون جو ہری پربت یا کوہ ماراں کے نیچے ہے اور نہایت عمیق ہے۔

فارسی مورخوں نے لکھا ہے کہ ڈل کلاں میں سلطان زین العابدین نے بہت سی بھرتی ڈال کر ایک مصنوعی جزیرہ سونہ لنک کے نام سے احداث کیا اور اس پر ایک محل تعمیر کرایا۔جس کی تین منزلیں تھیں۔چنانچہ صاحب تاریخ حسن لکھتے ہیں۔ "قصرے سہ آشیانہ دار برآں عمرت کردہ بود"۔لیکن شریور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈل میں یہ جزیرے (قدرتی تھے یا مصنوعی) بہرحال وہ بڈشاہ سے پہلے ہی موجود تھے۔البتہ اس نے یہاں ایک محل ضرور تعمیر کرایا۔جس کا نام اس نے سداپوری محل رکھا تھا۔

بادشاہ جب ڈال کی سیر کو آتا یہاں دیر تک قیام کرتا۔امراء وزراء ساتھ ہوتے۔کبھی ملکی مشورے ہوتے،کبھی سیاسی گتھیاں سلجھائی جاتیں،کبھی معرفت وتصوف کے پھول جھڑتے،کبھی روحانیت کی برکھا ہوتی،کبھی اس ظرافت ودل لگی سے بھی کام لیا جاتا جس کو استہزا نہیں بلکہ کالملح فی الطعام کہتے ہیں۔بادشاہ کے بعد اس شاہی محل کا کیا حال ہوا۔تاریخ کہتی ہے۔"بہ حادثہ زلزلہ بہ شکست"۔

ڈل کے تیرنے والے کھیتوں میں میوہ دار درخت

محل کی تیاری کے بعد بادشاہ کی مشہور بیگم شری نے بہت سی خیرات کی اور

لوگوں کو کھانا کھلایا۔ جن میں ہندو مسلمان صوفی اور بزرگ بھی تھے۔ خصوصاً برہمنوں کی ایک معقول تعداد تھی۔ سب نے بادشاہ کے حق میں دعائیں کیں۔

بادشاہ نے عجیب حکمت عملی سے دل کے اندر تیرنے والے کھیتوں میں میوہ دار درخت لگوائے اور اس مقام کو ایسی رونق دی کہ لوگ اس کو دور دور سے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔

شریور کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈل میں تیرنے والے کھیتوں اور ان میں سبزی ترکاری اور پھل پھول پیدا کرنے کا رواج بڈ شاہی زمانے ہی سے چلا آتا ہے۔

جزیرہ سونہ لنک عہد مغلیہ وافاغنہ میں

زوال خاندان شہمیری اور تباہی چکاں کے بعد جب کشمیر میں مغل اعظم یعنی شہنشاہ اکبر نے کہ وہ بھی بڈ شاہ کی طرح اپنی طبیعت کی بوقلمونیوں سے عجائبات روزگار سے تھا۔ قدم رکھا۔ تو اس کے جانشینوں نے جو بڈ شاہ کی بزرگی ورعایا پروری اور اس کی شان وشوکت کے قائل تھے۔ مرمت وترمیم کے بعد سونہ لنک کے کھنڈروں کو پھر قصر شاہی بنا دیا۔

افغانوں کے عہد میں جواں شیر امیر خان (۵۱) کشمیر کا ایک نامور گورنر گزرا ہے۔ وہ بڑا امیر طبع اور عیش دوست تھا۔ اس نے سونہ لنک کے چھوٹے سے جزیرے کو مغل بادشاہوں اور گورنروں سے بھی زیادہ رونق دی۔

صاحب تاریخ حسن لکھتے ہیں۔ امیر خان آں ترمیم کردہ بہ سبیل دولاب

ہالائے چنار آب کشیدہ در صحن عمارت فوارہ روح افزاء برداشتہ بہ تماشائے آں صرف اوقات مے کرد۔'' اس زمانہ میں سونہ لنک کا کیا حال تھا۔ مصنف تاریخ حسن لکھتا ہے ''درایں زماں عمارتش ویراں''۔ لیکن آج ۱۳۵۸ھ میں اس جزیرے کی جو حالت ہے۔ وہ چونہ اور پتھروں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ایک دو توت کے درخت ہیں اور ایک چنار کا درخت لب آب اپنی کہنگی و قدامت کا اشتہار دے رہا ہے۔

زینہ کوٹ

اس کا ذکر سب سے پہلے زونراج نے اپنی راج ترنگی کے شلوک ۱۲۴۸ میں جین کوت کے نام سے کیا ہے۔ زونراج لکھتا ہے۔ یہ گاؤں زین العابدین نے ملہان پور (۵۲) کامراج کے جنوب مشرقی کونہ میں جہاں زمین ہمیشہ دلدلی رہتی تھی۔ آباد کیا تھا۔ یہاں بادشاہ نے کئی مکانات تعمیر کرائے۔ ہر مکان پر ریشمی جھنڈیاں لہرایا کرتی تھیں۔ جو ان کے سرکاری مکان ہونے کی علامت تھیں۔

ایک پرانی بیاض (۵۳) میں زینہ کوٹ کے متعلق چند سطریں نظر سے گزری ہیں۔ صاحب بیاض ملا احمد کاشمیری ملک الشعرائے دربار بڈشاہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ موضع زینہ کوٹ میں جب سلطان نے عمارات شاہی کی تکمیل کر لی تو ترکم چینی (۵۴) نام ایک صنعت کار (سنگتراش) نے بادشاہ کے لئے سنگ سیاہ کا ایک حوض بنایا۔ جس کے فرش میں سنگ سفید لگایا گیا تھا۔ ملا احمد نے اس حوض کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی۔ افسوس ہے وہ نظم مکمل نہیں مل سکی۔ بیاض بہت پرانی اور بوسیدہ

ہے اور اکثر مقامات سے کاغذ کرم خوردہ اور پھٹا ہوا ہے۔ اس نظم کا صرف ایک شعر سلامت ہے۔ ایک شعر کا پہلا مصرعہ سالم اور دوسرا نصف موجود ہے۔ باقی نظم کیڑوں کی خوراک ہوگئی ہے۔ چنانچہ یہ اشعار حسب ذیل ہیں۔

حوضے کہ دست ترکم چینی ز بہر شاہ   باصد صفائے دست ز سنگ سیاہ بست
فرش سفید در تہِ آب زلال حوض   ۔۔۔از دل ماہی بہ ماہ بست (۵۵)

زینہ کوٹ میں جو سنبل کے نزدیک ہے بادشاہی عمارات کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ حمام اور حمام کے صحن کے پتھر اور حوض کے نشانات اب بھی ایک دردمند کے سینہ میں زخم بے نشان پیدا کرنے کے لئے تیر بے کمان کا کام دے رہے ہیں۔

زینہ بازار

یہ بازار زینہ کدل سے نائد کدل تک چلا گیا ہے۔ اس زمانہ کی رونق اور آبادی پر غور کرو اور یہ بھی دیکھو کہ بادشاہ کو اپنے آباد کردہ مقامات سے کس قسم کی دلبستگی ودلچسپی ہوتی تھی۔ پھر اندازہ لگاؤ کہ اس بازار میں کیا کچھ رونق نہ ہوتی ہوگی۔

زین پور یا زینہ پور

اس کا نام سنسکرت کی تاریخوں میں جین پور یا جین نگر درج ہے۔ یہ گاؤں

زین العابدین نے مدوراجیہ (مراج) میں آباد کیا اور بعد میں اپنی رونق وشادابی کی وجہ سے ایک پرگنہ مشہور ہو گیا۔ یہ موضع ایک کریوہ پر آباد ہے۔ سرینگر سے اس کا فاصلہ بجانب گوشہ جنوب قریباً ۱۵ میل ہے۔ اس کی بنا کے متعلق مشہور ہے کہ شیخ شمس الدین بغدادی (۵۶) ایک بزرگ تھے۔ جو بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر آئے۔ جب اس کریوہ پر پہنچے۔ تو اس کی غیر آبادی کے باوجود جب یہاں ہوائے دلکشا اور فضائے روح افزاء دیکھی۔ تو اسی ویرانے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ فقراء کی ایک جماعت بھی ساتھ تھی۔ مطبخ ہر وقت گرم رہتا تھا۔ اور جو آتا تھا۔ وہ خالی نہ جاتا تھا۔ بادشاہ نے بھی شیخ بغدادی کی شہرت سنی۔ اس کو بلوانے کی بجائے خود وہاں جانا مناسب سمجھا۔ چنانچہ گیا اور ارادت مندی کا تحفہ لیکر گیا۔ بادشاہ نے شیخ کی خاطر یہاں زینہ پور کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ ایک نہر جاری کی جس کی سد بندی آج تک زینہ ستھو کے نام سے مشہور ہے۔ اس نہر کی آبپاشی سے کئی شہر آباد و سرسبز ہو گئے۔ شیخ بغداد کا مزار بھی زینہ پور ہی میں مرجع خلائق ہے۔

شیخ کے ساتھ بادشاہ کو عقیدت تھی۔ اس لئے وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب شیخ نے اپنی عبادت میں ہرج آتے دیکھا۔ تو بادشاہ سے فرمایا۔ ''فقیراں ہمسر بادشاہاں ہستند دو بادشاہ در یکجا کجا مے گنجند''۔ بادشاہ تو عجائبات کا مجموعہ تھا۔ اس نے وہاں جانا ترک کر دیا۔ اسی واقعہ کے بعد بادشاہ نوشہرہ کی راجدھانی کو آباد کرتا ہے۔

جونراج نے بھی زینہ ترنگنی میں اس کا ذکر جین پوری کے نام سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ نے پرگنہ کدال (۵۷) میں جین پوری (زین پور) نام ایک قصبہ

اپنے نام پر آباد کیا۔اس قصبہ میں بھی برہمنوں کو خاص مراعات شاہی سے ممتاز کیا اور زین پور کی سرسبزی وشادابی کیلیئے بادشاہ نے ایک نہر بھی جاری کرائی۔تاریخ اعظمی میں بھی زینہ پور کا ذکر کشمیر کے چک بادشاہ حسین شاہ کے سلسلہ میں آتا ہے۔اس زمانہ میں بھی زینہ پور خاص شہرت رکھتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے زین العابدین کی وفات کے قریباً ایک سو سال بعد تک زینہ پورہ کو خاصی اہمیت رہی ہے۔چنانچہ خاندان چک کے بادشاہ حسین شاہ والئے کشمیر نے اپنے آخری عہد میں جب اپنے چھوٹے بھائی علی خان کو مملکت وحکومت سپرد کر کے تخت پر بٹھایا۔تو آپ موضع زینہ پورہ میں جو زین العابدین کا آباد کردہ تھا اور طراوت ونظارت اور باغ و بہار کی وجہ سے دارالسرور تھا۔چلا آیا اور وہیں ۹۷۷ھ میں جان بحق ہو گیا (۵۸)۔

علی خان نے بادشاہ ہو کر اپنا نام علی شاہ رکھا۔۹۷۸ھ میں تخت پر بیٹھا۔اس کا بھائی حسن خان ہنگامہ برپا کر کے تخت وسلطنت کے دعوے کے لئے ایک جماعت کو اپنا طرفدار بنا رہا تھا۔علی شاہ نے قلعہ زینہ پورہ میں اس کو محبوس کیا۔تین ماہ کی صعوبتوں کے بعد حسن خان نے اسی قلعہ میں وفات پائی۔

آج زینہ پور میں نہ وہ قلعہ ہے نہ شاہی عمارات ہیں۔نہ ایسی اور علامتیں باقی ہیں جن سے یہ شبہ تک بھی ہو سکے کہ یہ مقام کبھی دارالخلافہ کی ہمسری کیا کرتا تھا۔

کیا عجب مرقد بڈشاہ سے آئے جوندا   زین پور پیارے کا کیا حال ہوا میرے بعد

تاریخ حسن سے معلوم ہوتا ہے کہ زینہ پور کے باغہائے دلکشا اور عمارات عالیہ عجوبہ روزگار تھیں۔یہ سب فراز کریوہ پر تھیں۔مغلیہ دور حکومت تک ان کے

آثاروں میں کچھ نہ کچھ جان موجود تھی۔

زینہ ڈوب یا راجدھانی نوشہر

یہ مقام جو آج سرینگر کا ایک دور اُفتادہ محلّہ ہے۔ دارالحکومت شیر گڑھی (سرینگر) سے ملہ شاہی باغ کو جاتے ہوئے قریباً پانچ میل کے فاصلہ پر راستہ میں آتا ہے۔ نوشہرہ نئے شہر کو کہتے ہیں۔ بڈشاہ نے بھی عالیشان عمارتوں کا ایک رفیع وسیع سلسلہ قائم کر کے سرینگر کے شمالی گوشے میں ایک نیا شہر آباد کیا۔ چونکہ بادشاہ خود یہاں رہتا تھا اور یہیں دفاتر وغیرہ تھے۔ اس لئے نوشہرہ کو کشمیری زبان میں راجدھانی بھی کہتے تھے۔ دب یا دیب کے معنی محل یا منزل ہے۔ اس لئے سرکاری کاغذات میں یہ محلات زینہ دب کے نام سے موسوم تھے۔

موجودہ زمانے میں بھی اس مقام کے کھنڈروں کو راجدھانی ہی کہتے ہیں اور لفظ راجدھانی کے مزید ثبوت میں بڈشاہی زمانے کے ایک شاعر کی یہ رباعی بیاض (سرخوش) قلمی میں نظر آئی ہے۔ رباعی

سلطاں بہ سریر کامرانی بہ نشست   برمسند عیش جاودانی بہ نشست
ہر شوکت وشان کہ داشت کیوں بہ افراز   تا سنگ اساس راجدہانی بہ نشست

بادشاہ نے اس مقام کو جی کھول کر رونق دی۔ نالہ منڈی بل کے پاس ایک وسیع وخوش نما باغ بنوایا۔ اسی باغ کے کھنڈروں پر شاہجہان کے زمانے میں نواب علی مردان خان گورنر کشمیر نے ''حویلی ہائے سنگین فوارہ وآبشار دلنشین برائے بودوباش خود احداث'' کرائے۔ نواب علی مردان خان نے اس کا نام باغ حیدر آباد رکھا۔

بادشاہ نے نوشہر میں بارہ منزلہ عمارت کا جو دربار عام تعمیر کرایا۔ صنعت و حرفت، نقش ونگار اور وسعت و سربلندی میں رشک زمانہ اور عجوبہ روزگار تھا۔ ہر منزل میں پچاس حجرے تھے اور ہر حجرے میں پانچ سو آدمی سما سکتے تھے۔ گویا اس مکان میں پچیس ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی۔ پھر لطف یہ کہ اس عمارت میں اینٹ پتھر چونہ کہیں نام کو نہ تھا۔ تمام عمارت لکڑی کی تھی اور کشمیری صنعت کا بہترین نمونہ تھی۔ مرزا حیدر کاشغری تاریخ رشیدی میں اس عمارت کے متعلق لکھتے ہیں۔ ''ہماں سلطان زین العابدین عمارتے درشہر برائے خود ساختہ کہ بہ کشمیراں آں راراجدہانی مے گونید کہ دوازدہ آشیانہ است۔ بعضے آشیانہ مشتمل بر پنجاہ خانہ وحجرہ وایوان وغرفہ باشد وعمارتے بہ ایں رفعت ووسعت در عالم مثل کوشک ہشت بہشت سلطان یعقوب درتبریز وکوشک باغ زاغاں وباغ سفید وباغ شہر کہ در ہرات اندرکوک سرائے وعاق سرائے وباغ دلکشا وباغ بولائی کہ درسمرقند است دیدہ شد۔ اما طرح سیاق ولطافت کہ آں ہادارندایں ندارد وغرابت ایں عمارت بیشتر ازاں است''۔

مرزا حیدر یہ تسلیم کرتا ہے کہ بلحاظ خوبصورتی ووضع کشمیر کا زینہ دب گو سمرقند وہرات اور تبریز کی تعمیرات کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تاہم وہ دنیا کی عجیب تر عمارتوں میں سے ہے۔

راجدھانی کا نام سب سے پہلے زونراج نے شری جینا نگری یعنی زینہ نگر لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ نے اس علاقہ کا نام زینہ نگر رکھا اور چونکہ دارالحکومت بھی بعد میں یہیں مقرر ہوا۔ اس لئے اس کو راجدھانی بھی کہتے تھے۔ بعد میں اسی نام نے نوشہرہ کی شکل اختیار کرلی۔ اب محلّہ نوشہرہ تو موجود ہے مگر راجدھانی جہاں شاہی محلات تھے کھنڈروں کا ایک عبرتناک ڈھیر ہے۔

زونراج لکھتا ہے۔ بادوشاہ نے اس نئی بستی میں بازار تعمیر کرائے۔ اور

اجناس کی خرید وفروخت کیلئے تجارتی منڈیاں قائم کیں۔ اس بستی کی وسعت پردی من پہاڑی سے لیکر امریش پور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں جو مکانات بڑے بڑے اور اونچے اونچے پتھروں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے عکس زین گنگا ندی میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی لہروں کے ذریعہ ہلتے اور لرزتے ہوئے ایک کیفیت پیدا کیا کرتے تھے۔ بڈشاہ نے یہاں کئی مٹھ تعمیر کرائے۔ اور برہمنوں کو جن پر وہ خاص طور پرمہربان تھا۔ نہ صرف اراضیات مفت دیں۔ بلکہ ان کو مکانات بھی شاہی مصارف سے تعمیر کرا دیئے۔

زونراج کے بعد اس کے شاگرد شریور نے راجدھانی کا ذکر کرتے ہوئے زینہ ڈوب یعنی شاہی محلات کی کچھ کیفیت بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

۱۵ لوکک کے بلند ترین شاہی محل دیوگاہ (DEWAGAHA) کے علاوہ ۴۰ لوکک (۵۹) میں بادشاہ نے اس محل کے نزدیک ایک اور لاجواب محل شری جینانگری تعمیر کرایا۔ جو اینٹوں اور لکڑیوں سے بنایا گیا تھا۔ محل کی چوٹی کے گول گنبد کا سنہری کلس سورج کی روشنی میں اپنی آب وتاب سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔

زونراج لکھتا ہے۔ عمارت کے مہتمموں کو بادشاہ خود ہدایات دیا کرتا تھا۔ جو اس کے فن تعمیر سے آگاہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔

بادشاہ نے قدیم دارالحکومت کو ترک کر کے زینہ نگر ہی میں سکونت اختیار کر لی اور مرتے دم تک وہ اسی جگہ رہا۔

بادشاہ نے اس عالیشان سنہری کلس والے محل کے وسیع صحن میں ایک تالاب تعمیر کرایا۔ اور اس میں پالتو راج ہنس چھوڑے۔ جن سے تالاب کی خوبصورتی دوبالا

ہوئی۔ اس محل میں دربار کے لئے ایک بہت بڑا ہال تعمیر کیا گیا۔ جس میں بادشاہ کیلئے ایک مثلث نما تخت رکھا گیا۔ اور ہال کی دیواروں میں آئینہ بندی کی گئی۔ لیکن اب وہاں کیا ہے ؟

دل برباد میں اڑتی ہے خاک   یہ بستی غیرت جنت کبھی تھی

پانپور میں مصنوعی جھیل زینہ تراگ

بادشاہ کو کوثر ناگ کی جھیل بہت پسند تھی۔ اس زمانے میں دشوار گزار سفر ہونے کے باوجود وہ وہاں جاتا اور گھنٹوں وہاں سیر کرتا۔ بادشاہ نے اس لمبے سفر اور لمبی چڑھائی سے بچنے کے لئے ایک ایسی ہی جھیل دارالحکومت کے نزدیک بنائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ یہ مصنوعی جھیل کوثر ناگ کے ہی نمونہ پر پدم پور (پان پور) میں بنائی گئی اور اس کا نام زینہ تراگ رکھا گیا۔

شریور لکھتا ہے۔ اس جھیل کی بنیاد ان ایام میں رکھی گئی۔ جب زعفران کے پھول اپنی پوری بہار پر تھے۔

بقول شریور بادشاہ نے اس جھیل کے کنارے ایک خوبصورت محل تعمیر کرایا۔ جس کا نام اس نے کلودہرن ناگ رکھا۔ لیکن اب نہ وہ جھیل ہے نہ وہ خوبصورت محل۔ البتہ ایک نشیبی مقام اب تک زینہ تراگ کے نام سے پانپور میں مشہور چلا آتا ہے(٦٠)۔

آسماں سے بھی تھا پایہ جن کی رفعت کا بلند
ہائے کیونکر کھا گئی ان آسمانوں کو زمین

ہلال پور

شریور لکھتا ہے۔ شہر جینا تلک میں ایک ہاتھی بدمست ہو کر خون خرابہ کرنے لگا۔ ہلال نامی ایک شاہی ملازم اسے مارنے کو نکلا اور آخر اس نے کسی نہ کسی ترکیب سے اس بدمست ہاتھی کو جس کے خوف سے لوگوں کو باہر نکلنا بھی دشوار تھا مار ڈالا۔ بادشاہ اس کی جوانمردی سے بہت خوش ہوا اور جس مقام پر وہ ہاتھی مارا گیا۔ اس مقام پر بادشاہ نے ہلال کی یادگار میں ایک گاؤں ہلال پور کے نام سے آباد کیا۔ جس بادشاہ نے اپنے ایک ملازم کے نام پر گاؤں آباد کیا۔ اس نے یقیناً اسے انعامات کثیرہ سے بھی مالا مال کیا ہوگا۔

زینہ تلک

۳۸ لوکک کے سیلاب عظیم کے بعد بادشاہ نے کامراج کو سیلاب کے نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لئے جیا پیڈ پور (موجودہ نام اندرکوٹ) کے نزدیک وتستہ کے کنارے زینہ تلک کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ چونکہ تمام مکانات پر بادشاہ

نے سفیدی کرانے کا حکم دیا تھا۔ اس لئے یہ شہر دودھ کا ایک شہر یا کوہ سفید معلوم ہوتا تھا۔ اس شہر میں ایک نالہ کے ذریعہ پانی لایا گیا۔ وہ پانی شہر کے بڑے دروازے سے گزر کر باہر نکلا کرتا تھا۔ شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اپنے لئے بھی یہاں شاہی محل تعمیر کرایا اور عمارت سے فارغ ہونے کے بعد یہاں رقص وسرود کے جلسے منعقد کئے۔ جہاں کشمیر اور کاشی (بنارس) کے ماہرین علم موسیقی نے اپنے اپنے کمالات دکھائے۔ بادشاہ نے نقد انعامات سے ان کے دامن مراد کو مالا مال کیا۔

سمدّرکوٹ

بادشاہ نے جھیل وُلر اور مانسبل کے کناروں پر کئی گاؤں آباد کیئے۔ جن میں سایہ دار درخت نصب کیئے گئے۔ سمدّرکوٹ (٦١) سے شری دوارکا (٦٢) تک بادشاہ نے وُلر کے کنارے جتنے گاؤں آباد کیئے۔ ان سب کا ابتدائی لفظ جینا آتا تھا۔ یعنی تمام گاؤں بادشاہ کے نام پر ہی آباد کیئے گئے تھے۔ یہ نئے گاؤں (٦٣) بابا شکورالدینؒ کی زیارت کے نیچے سے لے کر بنڈپورہ یعنی کھوئی ہامہ کے تمام علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔

زونراج نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے جھیل مانسبل کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا۔ نالہ سندھ سے اس نے ایک نہر نکالی۔ جو ہر پھر کر مانسبل ہی میں داخل ہو جاتی تھی۔

بڈکوٹ، بڈسر، بڈمقام

یہ تینوں مقام شمالی کشمیر میں واقع ہیں۔ بڈکوٹ ایک گاؤں ہے جو بادشاہ کے نام پر آباد ہے۔ ہندواڑہ سے علاقہ راجوار کی طرف جائیں تو بائیں طرف سڑک کے کنارے یہ گاؤں نظر آتا ہے۔ یہاں کے لوگ بادشاہ کو ولی تصور کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اس کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔ بڈسر اور بڈمقام یہ دونوں مقام ہردوشیوہ کے اوپر رام پور، راجپور کا جو جنگل ہے۔ وہاں چیڑ ہار گاؤں کے متصل واقع ہیں۔ بڈسر ایک وسیع خام تالاب ہے۔ جو جنگل کے عین درمیان ہے۔ بڈمقام بھی اسی علاقہ کا نام ہے۔ راقم مؤلف یہاں ۱۹۱۱ء کی گرمیوں میں تین ہفتہ قیام کر چکا ہے۔ یہاں ریچھ اور بندر بکثرت ہیں۔ جن کا گزارہ جنگلی پھلوں پر ہے۔ بڈمقام کافی بلندی پر ہے اور یہاں خاصی سردی رہتی ہے۔ یہاں سے شہر، وادی، اور ولر کا نظارہ صاف نظر آتا ہے۔ ؎

میدان بھی بستیاں بھی دریا بھی اور ولر بھی
یہ بڈمقام منظر کیا کیا دکھا رہا ہے

یہاں کسی قدیم عمارت کے نشان نظر نہیں آئے۔ شاید کبھی بادشاہ یہاں آیا ہوا اور چند روز مقیم رہا ہو اور یہ جگہ اس کے قیام چند روزہ کی وجہ سے بڈمقام کے نام سے مشہور ہوگئی ہو۔ بڈسر کے خام تالاب کا پانی جنگل کے جانوروں کے پینے کا کام آتا ہے۔

چند اور گاؤں اور دو مندر

سویہ پور (سوپور) کے دوسرے طرف بادشاہ نے ایک قصبہ سناں گیری کے نام سے آباد کیا۔ اس میں اچھے اچھے مکانات تعمیر کرائے۔ ایک اور شہر تعمیر کیا۔ جس کا نام سدی پوری (سدی پور) رکھا۔ یہ شہر اس نے شریشوری میں سدا کھشیتر کے مقام پر آباد کیا۔ یہیں اس نے شاہی محل سے ذرا زیادہ بلندی پر دو مندر بھی تعمیر کرائے۔ ایک کا نام مارتنڈر رکھا اور ایک کو امرناتھ کے نام سے مشہور کیا۔

کرم راجیہ یعنی علاقہ کامراج (۶۴) میں اس نے ایک قصبہ سلطانپور کے نام سے بسایا۔ زونراج نے اس کو سورتران پور لکھا ہے۔ یہاں بادشاہ نے عالیشان مکانات تعمیر کرائے۔

بادشاہ نے جس کا لقب جینا (زین العابدین) تھا۔ جھیل ولر کے کنارے دو اور قصبے آباد کئے۔ ان میں ایک نام جینا کنڈل اور دوسرے کا جینا پٹن تھا۔ ان دونوں قصبوں میں کریپر (Creeper) نام کے درخت بادشاہ کے حکم سے لگائے گئے۔ جن کے پتوں اور جن کی شاخوں کی خوبصورتی نے ان قصبوں کی رونق کو دوبالا کر دیا تھا۔

حواشی:

۱) توزک جہانگیری مرتبہ سرسید احمد خان مطبوعہ ۱۸۶۵ء صفحہ ۴۶۔

۲) ترجمہ انگریزی جے سی دتہ صفحہ ۸۲۔

۳) وُلریا اولر کشمیری زبان کا لفظ ہے۔اس کے معنی سوراخ کے ہیں اور چونکہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ زمین میں سوراخ ہونے کی وجہ سے ایک عظیم چشمہ بہ نکلا تھا۔اس لئے مہا پدم کی جگہ کشمیری زبان کا لفظ ولر مشہو ہو گیا۔

۴) زمانہ حال میں یہ جھیل گرمیوں میں تیرہ میل لمبی اور دس میل چوڑی ہوتی ہے اور سردیوں میں اس سے آدھی رہ جاتی ہے۔

۵) اسرار الابرار تصنیف بابا داوٗد مشکوٰتیؒ بہ عہد شاہجہاں غیر مطبوعہ۔

۶) تاریخ ملا بہاء الدین میں چار مورتیوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ ملا بہاء الدین لکھتا ہے'' غواصاں بہ کوشش تمام دُر بتخانہ رفتہ چہار بُت یافتند و برآوردند بُت ردئیں بودند'' وبت طلائی ''۔لیکن صاحب اسرار الابرار، تاریخ حسن اور مؤلف مکمل تاریخ کشمیر اور دوسرے مورخ صرف دو مورتیوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

۷) صفحہ ۴۵ مرتبہ سرسید احمد خان مرحوم مطبوعہ ۱۸۶۵ء۔

۸) بحوالہ اسلامک کلچر ان کشمیر صفحہ ۲۱۳۔

۹) تاریخ ملا بہاء الدین میں لکھا ہے۔'' سلطان مذکور برآں جزیرہ درخت ہائے توت وغیرہ اشجار میوہ دار وگل ہائے رنگ رنگ نہال کرد۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں توتوں کی بنیاد اسی زمانہ سے ہے۔

۱۰) یہ تو ۱۹۱۸ء کی کیفیت تھی۔۱۱/۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو میرے معزز دوست ڈاکٹر غلام محی الدین

صوفی ایم اے ڈی لٹ مصنف ''کشیر'' وکتب متعددہ زینہ لنک دیکھنے کے لئے ولر کی طرف گئے۔ انہوں نے وہاں زینہ لنک کی خستہ حالی کی جو کیفیت لکھی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

''وہ محل جو سلطان زین العابدین بڈشاہ نے یہاں تعمیر کیا تھا اور جس کی شان وشوکت کا پتہ یہ قطعہ دیتا ہے۔

این بقعہ چو بنیاد فلک محکم باد　　مشہور بہ ترین وزیب درعالم باد
تازین عباد اندرآں جشن کنند　　پیوستہ چو تاریخ خودش خورم باد

اب بالکل کھنڈر پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زینہ لنک کے چار یار بل یا گھاٹ تھے۔ اب دو ایک افتادہ سنگین خوبصورت ستونوں کے سوائے کچھ نہیں۔ البتہ مسجد کے گنبد کا ایک چوتھائی شکستہ حصہ اور بوسیدہ چوبی دروازہ باقی ہیں۔ دو معمر بتلاتے ہیں کہ قریب تیس سال قبل مسجد کا گنبد سالم تھا۔ چنانچہ پیر حسن شاہ نے بھی تاریخ حسن اس کی تصدیق کی ہے لیکن آثار قدیمہ کے تغافل نے اسے بھی گرنے سے نہ روکا۔ شائد بر محل مرمت بڈشاہ کی اس ''موتی مسجد'' کو برقرار رکھتی۔ مسجد کی اینٹیں کافی وزنی ہیں اور ان کی سرخی سے ان کی طاقت اور توانائی ٹپکتی ہے۔ زینہ لنک کا ٹیلہ میلوں دور سے نظر آتا ہے۔ مگر راستہ اب ولر کے پانی سے نہیں۔ بلکہ نیم خشک زمین سے ہے۔ منظر واقعی دلفریب ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ہندوستان بھر کی تازہ پانی کی سب سے بڑی جھیل اور دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ ہمالیہ کا سلسلہ اور اس دلکش مقام پر محل اور اس محل میں سامان عیش وآرام واقعی بڈشاہ کی دماغی کلفت کو دور کرتا ہوگا اور مسجد مولیٰ کی یاد دلا کر سلطان کو اسی مولیٰ کی مخلوق کی خدمت کی جانب راغب کرتی ہوگی۔ ایک شولنگ اندازاً ۶۴ انچ لمبا اوندھا پڑا ہے۔ نہ معلوم یہ کب اور کیسے یہاں اس خرابے میں آیا اور کیوں اس افتادگی کی صورت میں اپنی بے محلی کا رونا رو رہا ہے۔

(۱۱) کشمیر کے محکمہ آثار قدیمہ نے تاپر کے اس مندر کا کھوج نکالا ہے۔ یہ مندر سرینگر سے ۲۳ میل اور پٹن سے آگے چار میل پر واقع ہے۔ یہاں کریوہ ہے اور سڑک کے کنارہ پر ہے۔ بلندی کی وجہ سے خشک ہے۔ اس کے اردگرد خشک فصلوں کے کھیت میں ہوا سہانی اور خوشگوار ہے

اور منظر بھی لطف اندوز ہے۔ راقم نے ۱۹۴۲ء میں اس مندر کو کھدائی کے دوران میں دیکھا۔ نومبر ۱۹۴۳ء کے ہفتہ اول میں ڈاکٹر صوفی بھی وہاں گئے۔ انہوں نے کشمیر کے سر برآوردہ روزانہ اخبار ہمدرد مورخہ ۱۱ر نومبر میں اس کی مندرجہ ذیل کیفیت لکھی۔

"محکمہ آثار قدیمہ کی کوشش سے تاپر کا مندر اب قابل ملاحظہ ہے۔ پنڈت مدھوسُدن کول صاحب ایم۔اے، ایم۔او۔ایل شاستری سپرنٹنڈنٹ محکمہ اور ان کے عملے نے محنت اور کاوش سے کھدائی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ چودہ سو روپیہ ۱۹۴۲ء کی کھدائی پر صرف اور سولہ سو روپیہ سال رواں میں۔ گویا تین ہزار اب تک خرچ ہو چکا ہے اور ابھی کام باقی ہے۔ مکمل کھدائی پر اس مندر کی اصلی ہیئت کا پتہ چلے گا۔ ڈاکٹر صوفی کا خیال ہے کہ آب وتاب کے لحاظ سے تاپر کے کھنڈر بڑے ہی دلچسپ ہیں۔ بنیادی حصہ جو نمودار ہے۔ اپنی عظمت اور وسعت کا پتہ دیتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر کو کشمیر کے اور کھنڈروں پر خاص فوقیت ہے اور وہ تفوق زیادہ تر اس کے رقبہ اور اس کی وسعت کی شان کو نمایاں کرتا ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ حال ہی میں بنا ہے اور چونکہ بارہ مولا جانے والی سڑک سے قریب ہے۔ سیاح اس کو بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

بنیادی حصہ سے یہ مندر ۲۰ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ دیواروں کی موٹائی ۴ فٹ ہے۔ درمیانی حصہ اندازاً ۷ فٹ اونچا ہے۔ باقی گر چکا ہے۔ بعض پتھر ۱۳ سے ۱۴ فٹ لمبے اور ۲ فٹ چوڑے نظر آتے ہیں۔ اس قدر بھاری پتھر اس زمانے میں کہاں سے اور کیسے اٹھا کر لائے گئے۔ حیرت کا موجب ہے اور یہی بہ پریہاساپور اور پٹن وغیرہ کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے۔

پنڈت کلمن اپنی راج ترنگنی میں اس مندر کا ذکر نہیں کرتا اور مندر کی مرمت کے دو کتبے جو دستیاب ہوئے ہیں۔ وہ ۱۱۵۷ء کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شائد یہ مندر راجہ پرتاپ آدتیہ کا بنایا ہوا نہیں بعد کا ہے اور کلہن نے ۱۱۴۹ء میں راج ترنگنی مکمل کی جس میں اس خوبصورت مندر کا ذکر مفقود ہے۔ ممکن ہے کہ مزید کھدائی پر کچھ انکشافات ہوں اور شاید قدیم تاریخ کشمیر پر کچھ نئی روشنی پڑے۔

۱۲) از مختصر التواریخ کشمیر مصنفہ پنڈت بیربل کاچرو (غیر مطبوعہ) بہ عہد مہاراجہ گلاب سنگھ

۱۳) اس ستھو یا سد محکم کے آثار سوپور میں بھی دریا کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ بلکہ سنگرامہ سے آتے ہوئے ڈاکخانہ کے پاس سے جو رستہ نرسری کی طرف جاتا ہے اور اس رستہ کے بائیں جانب جو مکانات ہیں وہ اسی قدیم ستھو پر آباد ہیں۔

۱۴) صاحب اسرار الابرار، تاریخ اعظمی، تاریخ حسن وغیرہ نے لکھا ہے کہ میر نے امور نامشروعہ دیکھ کر غیرت شریعت کے ثبوت میں اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ البتہ صاحب فتحیات کبرویہ لکھتے ہیں کہ اسی دوران میں میر پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی کہ وہ تڑپ کر دریا میں جا پڑے۔

۱۵) میر سید امین اویسیؒ کے باقی حالات باب مشائخ وعلماء میں پڑھے۔

۱۶) از تاریخ کشمیر اردو قلمی مصنفہ خواجہ حسن ملک (پبلک لائبریری سرینگر کشمیر)۔

۱۷) راج ترنگنی ترجمہ سٹائن صاحب کا اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۵۔

۱۸) حصہ دوم ورذکر سلطنت زین العابدین (مصنفہ راقم الحروف)۔

۱۹) راقم الحروف اپنی اس تصنیف یعنی تاریخ کشمیر کے حوالہ سے ۱۹۲۸ء میں تریہگام گیا۔ جو موضع ہر دو شیوہ نزیل سوپور سے قریباً ۲۶ یا ۲۷ میل دور لولاب کے متصلہ پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ تریہگام سے دو میل کپوارہ کی جانب اور تین میل تریہگام سے آگے موضع سالورہ کی طرف بعض قدیم عمارتوں کے آثار سُنے۔ جو آثار قدیمہ تریہگام اور کپوارہ کے درمیان سڑک کے کنارے دوسرے اور تیسرے میل کے درمیان تھے۔ تو میں نے تریہگام آتے ہوئے رستہ ہی میں دیکھ لئے تھے۔ موضع سالورہ کے کھنڈر دیکھنے کے لئے میں ۹/ اگست کو گیا۔ وہاں بہت سے لوگ بلوائے۔ جن میں ایک ضعیف پنڈت بہت واقفکار تھا۔ وہاں ایک قلعہ کے آثار اور کچھ کھنڈر نظر آئے۔ جس کی چہار دیواری کے اندر مکی کی پیداوار قلعہ کی ویرانی کی خبر دے رہی تھی۔ قلعہ مہاراجہ گلاب سنگھ بانی حکومت ڈوگرہ نے راجہ شیر احمد خان والیٔ کرناہ کی دست برد سے اپنے ملک کو بچانے کیلئے بنایا تھا۔ اس موضع میں بہت سے چشمے ہیں۔ لیکن دو چشمے بہت پرانے ہیں۔ جو ایک قدیم مسجد کے پاس ہیں۔ جن کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہاں حضرت مخدومؒ صاحب آتے تھے اور ان کو ان کے مرید

بابا عبداللہ نے آباد کیا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پچیس تیس سال ہوئے یہ مسجد جل گئی تھی اور جب خواجہ عزیز جوکگڑو رئیس بارہ مولا نے اس کی مرمت کرائی۔ تو اس کی دیواروں کو کھودنے سے قدیم زمانہ کے دو بڑے مٹ (گھڑے) نکلے تھے۔ بہر حال میں جس غرض کے لئے گیا تھا وہ پوری نہ ہو سکی۔ جس زمانہ (۱۹۱۰ء) میں راقم الحروف نے مکمل تاریخ کشمیر کی جلد دوم لکھی تھی میرا خود جانا تریہگام نہیں ہو سکا تھا۔ اب تحقیق و تفتیش اور خود موقعپ پر جانے سے معلوم ہوا ہے کہ ترہگام کے متصل بڈشاہ کا کوئی عظیم الشان باغ نہ تھا۔ تاریخوں میں جن باغات و عمارات متصلہ تریہگام کا ذکر ہے۔ وہ علاقہ زنگیر کے عین مرکز میں تھا۔ یعنی وہاں جہاں اب موضع سید پورہ آباد ہے اور جہاں سید حسین قمی رضوی کا مزار ہے۔ جیسا کہ اسلامک کلچران کشمیر کے فاضل مولف نے بھی لکھا ہے از تاریخ خواجہ محمد اعظم عہد محمد شاہی سال تصنیف ۱۱۴۸ھ۔

(۲۰) ملا ذہنی دور شاہجہانی میں کشمیر کا ایک نامور شاعر اور بابا نصیب الدین غازیؒ المتوفی ۱۰۴۶ھ کا مرید تھا۔

(۲۱) از مکمل تاریخ کشمیر اردو حصہ دوم مطبوعہ و تاریخ کشمیر اردو غیر مطبوعہ مصنفہ خواجہ حسن ملک (پبلک لائبریری سرینگر)۔

(۲۲) افسوس ہے آج تانبے کی اس پلیٹ کا کہیں کھوج نہیں ملتا۔

(۲۳) عہد حکومت ۱۰۳ء لغایت ۱۶۳ء

(۲۴) چونکہ دریا کا نام وتستہ یا تبستہ تھا۔ جو بگڑتے بگڑتے دت یا بہت بن گیا۔ اس لئے ممکن ہے کہ برت ستھو یا بھرت ستھو کا اصل لفظ دت ستھو یا بہت ستھو ہی ہو۔

(۲۵) مائسیمہ جو ۱۲۳ء میں ایک جزیرہ تھا اور اسلامی عہد کشمیر میں جو ایک وسیع میدان جنگ بھی بنا رہا۔ آج ایک آباد اور بارونق بازار اور ایک گنجان محلہ ہے۔ وسیع سڑکیں اور عالیشان عمارتیں یہاں موجود ہیں۔ گاؤ کدل سے چند قدم آگے دائیں طرف کچھ تھوڑا سا حصہ نمبل کا موجود ہے۔ وہاں بھی بھرتی ڈال کر خشک زمین پیدا کی جارہی ہے اور سڑک کے کنارے چوبی دکانیں بن گئی ہیں۔

(۲۶) پل اشرف، کدل تارہ بل، کدل مرجان پورہ، کدل نزورہ۔

۲۷و۲۸) فتحیات کبرویہ مصنفہ شیخ عبدالوہاب گنائی سال تصنیف ۱۱۵۳ء کتاب غیر مطبوعہ۔

۲۹) صاحب اسلامک کلچران کشمیر صفحہ ۲۴۴ پر لکھتے ہیں۔ کسی مورخ نے اس پل کی تعمیر کے سنہ کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن تاریخ حسن حصہ اوّل میں زینہ کدل کی تعمیر ۸۲۲ھ بتائی گئی ہے۔ جو راقم الحروف کے خیال میں اس لئے غلط ہے کہ بڈ شاہ کی تخت نشینی ہی ۸۲۳ھ میں ہوئی تھی۔ ۸۲۲ھ میں وہ اپنے نام پر پل کس طرح تعمیر کرا سکتا تھا۔ صاحب احسن التواریخ مولوی عزیز الدین صاحب قاضی کشمیر مرحوم اس کا سال تعمیر ۸۰۷ھ بتاتے ہیں اور بڈ شاہ کی تخت نشینی ۸۲۳ھ کے مطابق وہ بھی غلط ہے۔ پنڈت انند کول بامزئی نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ زینہ کدل کی تعمیر ۴۴۳۵ لوکک میں ہوئی ۳۵ لوکک کے مطابق عیسوی ۱۴۰۹ اور ہجری ۸۶۳ھ ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ پل گو کشمیر کے تمام پلوں میں بارونق ہے۔ لیکن اس کی حالت روز بروز خستہ وخراب ہو رہی تھی۔ اس لئے موجودہ فرمانروائے جموں وکشمیر مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر کے عہد میں اس کی از سر نو تعمیر شروع ہوئی۔ جو دو سال کے بعد ۱۹۳۷ء میں تکمیل تک پہنچی۔ اس پر قریباً پچاس ہزار روپیہ لاگت آئی۔ اور اب یہ پل امیرا کدل کی پائیداری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ بلکہ اس کے طفیل حبہ کدل بھی امیرا کدل کے بعد شہر کا دوسرا پل ہے۔ از سر نو بن گیا ہے اور اس پر بھی امیرا کدل اور زینہ کدل کی طرح موٹر تانگہ چل سکتا ہے۔

۳۰) راجوری کدل راجوری کے راجہ کی لڑکی نے بادشاہ کی اجازت سے تعمیر کرایا تھا۔ اور اسی کے نام پر راجوری یا راجوری یا راجور کدل کہلایا۔

۳۱) تواریخ خوارق السالکین سال تصنیف ۱۱۰۹ھ غیر مطبوعہ۔

۳۲) فتحیات کبرویہ صفحہ ۲ میں لکھا ہے۔ آپ ۲۲ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ کو انتقال فرما گئے۔ مدفن زینہ کدل محلہ قطب الدین پورہ۔ صاحب فتحیات نے خواجہ صدر الدین کا سال وفات ۸۲۱ھ غلط لکھا ہے۔ اگر وہ بڈ شاہ کے زمانہ میں موجود تھے اور مسجد شوپیاں اور مسجد جامع سرینگر ان کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی ہیں۔ تو ان کا سال وفات ۸۴۱ھ کے بعد ہونا چاہیے۔ کیونکہ مسجد شوپیان کی تعمیر کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے اور مسجد شوپیان انہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئی تھی۔

۳۳) یہ مسجد کئی دفعہ بوجہ آتش زدگی وغیرہ خراب ہوتی رہی اور گو ساتھ ہی ساتھ شاہان وقت

اس کی مرمت بھی کرتے رہے۔ لیکن اس مسجد کی مرمت کا جو انتظام مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ کے زمانے میں ان کے مشیر مال خان بہادر شیخ مقبول حسین سی آئی ای مرحوم نے کیا۔ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ شیخ صاحب نے جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۷ء تک ریاست جموں وکشمیر میں ریونیو منسٹر رہے۔ جامع مسجد کی تعمیر کیلئے سب سے پہلے گورنمنٹ ہند سے پانچ ہزار روپیہ لیا۔ پھر مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ سے نقد اور لکڑی کی معقول امداد حاصل کی۔ اس کے بعد مسجد کی تعمیر و مرمت کی مستقل امداد کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ مالیہ کے ساتھ فی روپیہ دو پیسے تا اختتام مرمت زمینداران کشمیر سے ان کی خوش بہ رضا کے مطابق وصول کئے جانے کے احکام جاری کئے۔ یہ رقم سالانہ ۶۵ ہزار کے قریب پہنچتی تھی۔ اور یہ ایسا سلسلہ تھا کہ آپ کے جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ آخر یہ مسجد کئی برس کی مرمت کے بعد قریباً گیارہ لاکھ روپیہ کی لاگت سے بہ عہد مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر فرمانروائے حال تکمیل کو پہنچی۔ یہ مسجد دنیا کی لاثانی عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

(۳۴ تاریخ خواجہ اعظمی مولفہ خواجہ محمد اعظم۔

(۳۵ تاریخ حسن صفحہ ۲۵۴ قلمی۔

(۳۶ از اسلامک کلچر ان کشمیر صفحہ ۲۰۹۔

(۳۷ مزید حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۸۔

(۳۸ اسرار الابرار مصنفہ مولانا داوٗد مشکوٰتی غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۰۶۳ھ۔

(۳۹ غالباً اسی شاہی محل کے کھنڈروں پر افغانوں نے اپنے زمانے میں قلعہ تعمیر کیا اور جب سکھوں کا دور آیا تو وہ اس قلعہ کی مرمت کر کے اس کو اپنے استعمال میں لانے لگے۔ ڈوگروں کے عہد میں اس قلعہ نے پھر کھنڈروں کی صورت اختیار کر لی۔ جس کو راقم الحروف نے بھی بارہا دیکھا ہے۔ اب چند سال سے بڈ شاہی محل کی بنیادوں پر مسلمانان سوپور نے ایک عالیشان اور وسیع جامع مسجد تیار کر لی ہے۔

(۴۰ شریور ہر مقام پر بارہ مولا کو ورہ مولا لکھتا ہے اور آج بھی یہ قصبہ اکثر زبانوں پر ورہ مولا کے نام سے ہی مشہور ہے۔

(۴۱) اندر کوٹ (سنبل) کے متعلق ڈاکٹر صوفی نے اپنی سیاحت تازہ (۲۰-۲۲-اکتوبر ۱۹۴۳ء) کہ جو مختصر کیفیت بیان فرمائی ہے۔ وہ ۲۷-اکتوبر ۱۹۴۳ء کے روزانہ اخبار ہمدرد سرینگر سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ ''اندرکوٹ جو کسی زمانہ میں کشمیر کا پایہ تخت تھا۔ آج ایک چھوٹے سے گاؤں کا حقیر حصہ ہے۔ سُنبل جو ضلع بارہ مولا کا ایک گاؤں پر لب جہلم اور کشمیر کی مشہور جھیل مانسبل سے ایک میل دور ہے۔ ۲۲۸۱ کی آبادی پر مشتمل ہے اور خاص اندرکوٹ کی کل کائنات ۱۱۷ نفوس ہے۔ کشمیر کا یہ سابقہ دارالسلطنت اب صرف ۱۴۳ گھنوں تک محدود ہے۔ آبادی مسلمان ہے۔ اندازاً نصف شیعہ اور نصف سُنی۔ یوں اندرکوٹ کا رقبہ جو قدیم ایام میں میلوں تک پھیلا ہوگا۔ اب چارسو کنال ہے اور خاص اندرکوٹ کا گاؤں ۳۷ کنال اور ۱۰ مرلے ہے۔ اندرکوٹ کے کھنڈر اپنی تباہی اور بربادی کے نوحہ خواں ہیں۔ ایک جگہ صرف پتھروں کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک آدھ پتھر جو موجود ہے۔ اپنی سنگ تراشی کے کمال کا پتہ دیتا ہے۔ بتلایا جاتا ہے کہ اکثر پتھر غائب ہو کر لوگوں کی عمارتوں کے کام آئے ہیں۔ ذرا دور سید صالح (شاہ ہمدان کے ہمعصر صوفی) کا مزار ہے لیکن وہ بوسیدہ مقبرہ جو اس سے پرے واقع ہے۔ کشمیر کے اولوالعزم اور نامور ربانی خاندانِ شہ میری سلطان شمس الدین کا ہے۔ کسی زمانہ میں جہلم اندرکوٹ کے قریب تر تھا۔ دریا کا کنارہ اب دور ہو گیا ہے۔

(۴۲) بہت قدیم نالہ تھا بڈشاہ نے اس پر ایک پل بھی بنوایا تھا۔ ۹،۱۹۰۸ء تک یہ نالہ چلتا رہا۔ بلکہ سرینگر سے سوپور تک چھوٹی کشتیاں اسی نالہ کے راستہ آیا جایا کرتی تھیں۔ مگر اب یہ نالہ بند کر دیا گیا ہے اور اس کا پل یہاں سے اکھاڑ کر ہندوارہ کے مقام کلن گام میں نالہ پہرو پر لگا دیا گیا ہے۔ راقم الحروف اس نالہ کے ذریعہ بارہا سوپور سے سرینگر اور سرینگر سے سوپور آیا ہے۔ کلن گام کا پل بھی نالہ پہرو پر نیا تعمیر ہوا ہے۔

(۴۳) سرینگر سے اسلام آباد کو جاتے ہوئے سڑک کے بائیں طرف مرتفع زمین پر یہ مزار چند درختوں کے اب تک موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ باغ کی تباہی و ویرانی کے بعد لوگوں نے اس کو قبرستان بنا لیا۔ کیونکہ سڑک کے ساتھ ساتھ باغ کی حدود تک قبریں ہی قبریں نظر آتی ہیں۔

(۴۴ تاریخ حسن صفحہ ۷۶۔

(۴۵ عہد حکومت ۱۰۲ء لغایت ۱۶۲ء۔

(۴۶ عہد حکومت ۶۱۷ء لغایت ۶۵۳ء

(۴۷ لنک یا لنگا جزیرے کو کہتے ہیں۔

(۴۸ سرینگر کا مشہور پل امیرا کدل اسی کے نام پر ہے۔ عہد حکومت ۱۷۷۱ء لغایت ۱۷۷۳ء بزمانہ احمد شاہ ابدالی۔

(۴۹ لہنان پور راجہ جیاپیڈ کا آباد کردہ ہے اور اس کا موجودہ نام مالر ہے۔

(۵۰ یہ بیاض خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب نامی مرحوم تبت بقالی سرینگر کے پاس دیکھی گئی۔

(۵۱ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چینی صنعت کار کا نام تھا۔ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ بادشاہ نے فن تعمیرات کے سلسلہ میں چین تک سے بھی اہل صنعت طلب کئے تھے۔

(۵۲ پیر شمس الدین حیرت پاندانی سرینگر نے ایک پیوند لگا کر مصرعہ کو اس طرح روشن کیا۔ ع

پیوند نور از دل ماہی بہ ماہ بست

(۵۳ تاریخ خواجہ اعظم مؤلف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری۔

(۵۴ علاقہ کدال یا پرگنہ کدال کا موجودہ نام موضع اڈون کے نام پر اب پرگنہ اڈون ہے۔ یہ موضع وج برور کے جنوب مغرب میں تین میل کے فاصلے پر دریائے وشو کا کے بائیں کنارے پر ہے۔ اس دریا کا قدیم سنسکرت نام وشوکا ہی ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہ دریا وشو کے نام سے مشہور ہے۔

(۵۵ تاریخ خواجہ اعظمی۔

(۵۶ سال تعمیر ۴۵۱۵ لوکک مطابق ۱۴۳۹ء۔

(۵۷ مفصل حالات کے لئے دیکھو کتاب ہذا کا ضمیمہ ۷۔

(۵۸ از تاریخ رشیدی ورق ۳۲۶ غیر مطبوعہ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کشمیر۔

(۵۹ مطابق ۱۴۶۴ء موافق ۸۶۸ھ

۶۰) تحصیل اونتی پورہ میں ایک موضع زینہ تراگ بھی بادشاہ کے نام پر ہے۔ جس میں قریباً ایک سو نفوس کی آبادی ہے۔ ملاحظہ ہو فہرست دیہہ وار کشمیر بابت ۱۹۲۱ء۔

۶۱) سمدرکوٹ کا موجودہ نام صدرکوٹ ہے۔ جو حاجن کے متصل واقع ہے۔

۶۲) موجودہ زولرکھ متصل زیر منز کھوئی ہامہ کے علاقہ میں اب بھی قریباً چالیس گاؤں ولر کے کنارے آباد ہیں۔ لیکن کسی گاؤں کے ساتھ زینہ یا جینا کا لفظ نہیں ہے۔ ممکن ہے انقلاب زمانہ سے یہ نام لوگوں نے فراموش کردیا ہو۔ اور گاؤں کے ناموں میں بھی تبدیلی ہوگئی ہو۔

۶۳) کامراج کا نام اب وزارت شمالی کشمیر (بارہ مولا) ہے۔

ستارھواں باب

آبپاشی، اجرائے انہار اور سڑکیں

بڈشاہ کی زرعی دلچسپیاں

سلطان کو تعمیر عمارات، فلاح زراعت اور احداث انہار کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ چند اہلکاروں کے سوا میرے ملک کی آبادی اور خوشحالی کا حقیقی باعث وہی فرقہ ہے۔ جو امیر غریب سے لے کر بادشاہ تک کو اناج پیدا کر کے دیتا ہے۔ زمینداروں کی بہبود کا اس کو اس قدر خیال تھا کہ ایک قانون کے ذریعہ اس نے مالیہ وصول کرنے والے افسروں کو زمینداروں سے کسی قسم کا نذرانہ قبول کرنے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی۔ اور چونکہ بادشاہ خود ہر بات کی نگرانی کرتا۔ زمینداروں سے بھی بے محابا ملتا رہتا اور ان سے ان کی شکایات سُنا کرتا تھا۔ اس لئے دیہاتی اور کسان لوگ حکام مال کی تعدیوں سے نہایت محفوظ رہتے تھے۔

غرض رعایا بالخصوص زمینداروں کی فارغ البالی کو ترقی دینے میں جو دلچسپی اس نے لی۔ کشمیر کے کسی بادشاہ کو اس کی توفیق نہ ہوسکی۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری بھی اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''دور تعمیر ولایت وتکسیر زراعت کندنِ جو

یہا توفیق کہ او یافت ہیچ کس از حکام کشمیر را دست نداده بود"

زہر کس نآید ایں کز ابر رحمت نہال عہد را سر سبز دارد

بڈ شاہ سے پہلے کشمیر کے مشہور انجینئر سویہ بانی سوپور نے آبپاشی کے اہم کام میں دلچسپی لی ہے۔ لیکن بڈ شاہ کا انتظام اس کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے بہت اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ سٹین بھی زین العابدین کے طویل و پرامن عہد میں آبپاشی کے جو اہم کام سرانجام ہوئے ہیں۔ ان کی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے جونراج اور شریور کی تاریخوں میں اس سلطان کے عہد کی تعمیر شدہ نہروں کی طول طویل فہرست مل سکتی ہے ۔ لیکن ان میں چند ایک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ہم سب کا تھوڑا تھوڑا ذکر جو تاریخوں کی ورق گردانی سے معلوم ہو سکا ہے۔ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

لال کوہل

نالہ پُہرو (۱) ولولاب (۲) کے خوشگوار اور سرسبز و شاداب پہاڑوں سے نکلتا ہے اور قریباً چالیس میل کی مسافت طے کرکے دوآب گاہ (متصل سوپور) کے پاس دریائے جہلم میں جا ملتا ہے۔ بڈ شاہ نے زینہ گیر کی آبادی کے لئے بنہ گام پُہرو کے پاس اس نالہ پر پتھروں کا ایک مضبوط بند بندھوایا۔ اور ایک نہر نکالی۔ جس کی بڑی شاخ تو دامن کوہ کے تمام مواضعات زولرہ، ہرون، لیٹ، شارٹ، نوپورہ، تجر، زینہ پورہ، بمے، گوری پورہ اور سیلو کو سیراب کرتی تھی۔ اور اس کی چھوٹی شاخ ڈورا اور درپورہ وغیرہ کی طرف نکل جاتی تھی اور جس کی دیگر شاخوں کا تمام زینہ گیر میں جو زین

العابدین کا اپنا آباد کردہ علاقہ تھا۔ جال پھیلا ہوا تھا۔

علاوہ دیگر مورخین کے کشمیر کے آخری نامور مؤرخ پیرزادہ حسن شاہ بھی اپنی تاریخ میں پہرو اور نالہ پہرو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''نالہ پُہرو کہ درمیان درہ کامراج میگزرد، منبع آں کوہستان وچشمہ سار لولاب است۔ بڈشاہی در عہد خود نالۂ پہرو را من مقام پہرو (۳) از مجرائ خود مسدود کردہ آب آں فیض بخش پرگنہ زینہ گیر ساختہ۔''

یہ نہر اپنی شاخوں کے علاوہ چودہ پندرہ میل لمبی تھی۔ اس نے زینہ گیر کو جو رونق دی اس کا ذکر زینہ گیر کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے۔

نہر کی تعمیر ہونے پر کئی شعرا نے بادشاہ کی خوشنودی مزاج کے لئے نظمیں لکھیں، قصائد لکھے، قطعات تاریخ قلمبند کئے۔ بادشاہ علم وفضل کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں کئی شاعر موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ اس نے کئی شعراء پر علی قدر مراتب نوازش شاہانہ کی برکھا کی ہوگی۔ لیکن تاریخوں میں جس قطعہ تاریخ کا ذکر آیا ہے۔ وہ صرف ایک ہی شعر ہے اور تعجب بلکہ افسوس ہے کہ تاریخ گو شاعر کا نام تک بھی کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گزرا۔ شعر حسب ذیل ہے ۔

چوں شد تعمیر آں جوئے گرامی خرد تاریخ گفتہ جوئے خورم (۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہر ۸۵۹ھ میں تیار کی گئی تھی۔ قریباً پانچ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی اس قدیم نہر کے آثار تجر، زین پورہ، بمے، سوپور اور ڈور کے متصل نظر آتے ہیں۔ جو سڑک سوپور سے ہندوارہ کو جاتی ہے وہ دسویں میل پر اسی قدیم چشمہ فیض یا جوئے خورم کے سینہ بے کینہ کو روندتی اور پامال کرتی ہوئی گزر جاتی

ہے۔

راقم الحروف نے بارہا 'جوئے خورم'' کے بانی کی روح پرفتوح پر دعائے خیر کے پھول نچھاور کئے۔ لیکن بند (ستھو) کے آثار سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں دیکھے۔ جو سوپور سے ہندواڑہ کو جاتے ہوئے دسویں میل پر سڑک سے نیچے بائیں ہاتھ کی طرف اور باغ وزیر سوبھارام کے عقب میں ہیں۔ ستھو کے بہت سے پتھر زمینداروں نے اپنے کھیتوں کے گرد باڑ کے طور پر لگا رکھے ہیں۔ تاہم ستھو کا بہت سا حصہ اپنی گزشتہ شاندار تاریخ کے دریدہ و بوسیدہ اوراق کے ذریعہ دیدۂ عبرت کو اب بھی اپنی اصلی جگہ پر پہاڑ کی مضبوط چٹان کی طرح نظر آرہا ہے۔ زیر کاشت زمین میں بھی کہیں کہیں اینٹ چونہ اور پتھروں کے نشان ملتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اس زمانے میں کوئی طویل پختہ فرش نہر کے کنارے پر تھا۔ یا بادشاہ یا اس کے نمایندوں کیلئے یہاں کوئی عمارت تھی۔ ایک پیرمرد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہ زمانہ بڈ شاہ دامن کوہ میں ایک بہت بڑا شہر آباد تھا۔ اس برباد شہر کے لوگوں کو فرشتہ اجل نے اسی جگہ تھپک کر سلا رکھا ہے۔ اس نہر کو بڈ شاہ کوہل اور نہر زند بھی کہتے ہیں۔

شاہ کوہل

مشہور ہے کہ کریوہ مارتنڈ کی بنجر اور غیر آباد سطح مرتفع کو سب سے پہلے بادشاہ نے شاہ کوہل کے اجراء سے آباد کیا۔ لیکن جب ہم تاریخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڈ شاہ سے بہت عرصہ پیشتر کشمیر کے مشہور اور نامور راجہ للتادتیہ

(۷۱۵ء لغات ۷۵۲ء) نے اس کریوہ پر اپنا شاندار مندر مارتنڈ تعمیر کرایا تھا اور اس مندر کی آبادی اور رونق کے لئے اس نے دریائے لدر کے اس مقام سے جہاں موضع گنیش پور (۵) آباد ہے اور جو کریوہ مارتنڈ سے سولہ میل کے فاصلہ پر پہلگام کو جاتے ہوئے سرراہ واقعہ ہے۔ ایک نہر جاری کی تھی۔

اس نہر سے کئی گاؤں سیراب ہوتے تھے۔ پنڈت کلہن، پرجا بھٹ اور شک جو ہندو عہد قدیم کے نامور مورخ تھے۔ مارتنڈ کے میدان پر انگوروں کے باغ کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ راجہ مذکور کے جانشینوں کے زمانے میں ان کی عدم توجہ اور لاپرواہی کی وجہ سے ایک وقت ایسا آیا کہ نہر بند ہوگئی۔ پانی کی بجائے اس میں مٹی اور پتھر نظر آنے لگے۔ مندر بھی ویران اور اجاڑ ہو گیا۔ کریوہ پر جو مکان آباد تھے۔ وہ خاک کا پیوند ہو گئے۔ مکین ادھر ادھر جا کر کسی اور جگہ کاشت کرنے لگے۔

راجہ للتادتیہ کے قریباً سات سو سال بعد جب بڈشاہ کا زمانہ آیا تو ملک کے سوئے ہوئے نصیب پھر جاگ اُٹھے۔ خشک اور اجاڑا ارضیارات، پہاڑوں اور جنگلوں کو چیر کر آباد کی گئیں۔ زینہ گیر کے لئے اگر اس کا وجود بارش کرم بن کر آیا تو اس کریوہ کے لئے وہ ابر رحمت ثابت ہوا۔

ہزارہا مزدور نہر کی کھدائی کیلئے لگا دیئے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے مزدوری بھی دی جاتی تھی۔ جو اس زمانہ میں شائد دو چار پیسے روزانہ سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم سرکاری اہلکار جو نہر کی کھدائی پر مامور تھے۔ کبھی کبھی لوگوں کو بیگار میں بھی پکڑ لیا کرتے تھے۔

بابا زین الدینؒ حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کے مرید تھے اور اپنے خلوص خدمت کی وجہ سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے کسی خادم کو کسی کام کیلئے کہیں بھیجا۔ جب وہ اس مقام پر پہنچا۔ جہاں بڈشاہ کے اہلکار ''شاہ جو'' یعنی شاہی نہر کی کھدائی کرر ہے تھے۔ تو انہوں نے خادم مذکور کو بزور و جبر بیگار میں پکڑ لیا۔ جب چند دنوں کے بعد اسے جبری خدمت سے نجات ملی۔ تو وہ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں آیا اور تمام ماجرا بیان کیا۔ حضرت یہ واقعہ سن کر ملول خاطر ہوئے۔ غضب ناک ہوکر اپنے عصا کو دریائے لدر میں جس کا پانی نہر شاہی میں جانیوالا تھا۔ زور سے گاڑ دیا۔ اور کلاہِ مبارک کو سر پر ٹیڑھا کر دیا۔ ادھر یہ ہوا اور اُدھر دریا کا پانی کم ہو کر خشک ہونا شروع ہوا۔ آخر یہ خبر بادشاہ کو بھی پہنچی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سرکاری آدمیوں نے حضرت بابا صاحب کے ایک خادم کو بیگار میں پکڑ کر اس سے زبردستی کام لیا تھا۔ بادشاہ ایک جمعیت بندگان کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عذر تقصیر کیا اور اپنے آدمیوں کو منع کر دیا کہ وہ نہ صرف حضرت کے خدام کو بلکہ کسی آدمی کو بھی بیگار میں نہ پکڑیں۔ حضرت نے بادشاہ کی معذرت قبول فرمائی۔ عصا دریا سے باہر نکالا۔ اور کلاہ کو سر پر سیدھا کیا۔ چنانچہ دریا کا پانی پھر اسی طرح جاری ہو گیا۔ جس طرح پہلے تھا (٦)۔

بادشاہ ایک عجیب طبیعت لیکر آیا تھا۔ وہ جس طرح جوگیوں اور سادھوؤں کا عقیدتمند تھا۔ اسی طرح مسلمان درویشوں اور صوفی منش بزرگوں کی خاک پاء کو بھی طوطیائے چشم تصور کرتا تھا۔ حضرت بابا صاحب ضرور خفا ہوئے ہوں گے اور سلطان نے فرط عقیدتمندی سے ضرور معذرت کی ہوگی۔ بلکہ بیگار کے اس جبری واقعہ کے بعد

ہی بیگار کی ممانعت کے احکام جاری کئے ہوں گے۔ جس سے سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو اس جبری اور بے مزو خدمت سے نجات مل گئی ہوگی۔ باقی رہا قصہ عصا کے دریا میں گاڑے جانے اور دریا کا پانی خشک ہو جانے کا، اس کو عقیدتمندوں کے حسن ارادت پر محمول کر دیا بزرگان دین کی روحانی طاقتوں سے اپنی لاعلمی تصور کرو۔ اس کے ماننے یا نہ ماننے سے بابا صاحب کی عظمت اور بزرگی میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔

شریور (۷) نے اپنی راج ترنگنی میں بڈشاہ کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نہر کے اجراء اور اس کی خوش نظمی کی وجہ سے انگوروں کے باغات اس کریوہ پر بکثرت تھے اور وہ اپنی شیرینی اور موٹائی کی وجہ سے دُور دور تک مشہور تھے۔ (۸)

شاہ کوہل اور حکومت ڈوگرہ

کریوہ مارتنڈ پر یہ نہر رنبیر پورہ، رام پور، گوپال پورہ کلاں وخورد، امر گڑھ، سنگھ پورہ اور دیوی پوری کے دیہات کو سیراب کرتی ہے سنہ ۱۹۱۹ب میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس کریوہ کو از سر نو آباد کیا۔ یہاں پٹھان، پنجابی اور ڈوگرے آباد ہیں۔ جن کا اکثر حصہ فوجوں سے آیا ہوا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان سب کو ۳/۱ مالیہ معاف کر دیا تھا۔

سنہ ۱۹۳۸ب لغایت سنہ ۱۹۴۰ب میں وزیر پنوں گورنر کشمیر کے معرفت مہاراجہ موصوف نے بڈشاہی نہر کی تعمیر شروع کی۔ لیکن پانی موضع سالیہ سے نیچے نہ اتر

سکا۔ بعہد مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۹۵۵ء ب میں پھر اس کریوہ کی سرسبزی کے لئے کوشش کی گئی۔ اور ۱۹۶۰ء ب میں بہت سی لاگت اور بے حد جانفشانیوں کے بعد آخر پانی رنبیر پورہ تک آگیا۔ پہلے اور دوسرے سال لوگوں کو آبیانہ معاف کر دیا گیا۔ ۶۳-۱۹۶۲ء ب میں ۳/۲ حصہ اور ۱۹۶۴ء ب میں آبیانہ سالم لیا جانے لگا۔ تقسیم آب کے لئے اس نہر پر ڈویژنل انجینئر کے علاوہ ایک ضلعدار، ایک امین، تین پٹواری اور ایک چپراسی مقرر ہے۔

چند اور پادشاہی نہریں

شریور لکھتا ہے۔ زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا نہ تھا جہاں نہروں کی ضرورت ہو۔ اور بادشاہ نے نہریں نہ کھدوائی ہوں۔ بلکہ جہاں نشیبی زمین تھی اور وہ جگہ نا قابل زراعت تھی۔ وہاں پانی کا ذخیرہ رکھنے کے لئے خام تالاب کھدوائے تھے۔

بادشاہ کو فرزندوں کی ناہنجاریوں کی وجہ سے جو سب سے بڑی تکلیف تھی وہ یہ تھی کہ رعایا مصیبت میں گرفتار ہو جاتی تھی۔ ان کی باہمی خانہ جنگیوں اور باپ سے فتنہ وفساد کھڑا کرنے بلکہ جنگ آزما ہونے کی وجہ سے نہ صرف جانوں کا نقصان ہوتا تھا۔ بلکہ فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں۔ مکانات جلا دیئے جاتے تھے اور فسادی لوگ عوام سے نقد و جنس زبردستی چھین لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس قسم کے روح فرسا واقعات بادشاہ کو سنائے جاتے تھے۔ تو ان کے تدارک کیلئے اس کو اپنی توجہ رفاہ عامہ کی طرف سے مجبوراً ہٹانی پڑتی تھی۔ چنانچہ بقول شریور ادہم خان کی جلاوطنی اور حاجی خان کی دارالحکومت میں مراجعت کے بعد جب ملک میں امن وامان کی صورت پیدا ہوئی۔ تو

بادشاہ پھر ملک کی سرسبزی اور شادابی کی طرف متوجہ ہوا اور سب سے پہلے اس نے نہروں کے احداث کی طرف توجہ کی۔

زونراج نے بھی جو شاعری و تاریخ نویسی میں شریور کا استاد تھا۔ بادشاہ کے رفاہ عام کاموں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ایک قدیم نہر کے آثار دیکھے۔ اس کو اس نے از سر نو کھدوایا۔ یہ نہر مختلف دِیہات کی اراضیات کو سرسبز و شاداب کرتی ہوئی اب پل پور تک چلی گئی۔

بادشاہ نے ایک اور نہر نند شیسل (۹) تک بڑھائی۔ اس نہر میں پانی اس کثرت سے رہتا تھا کہ یہاں کے لوگ اپنے آپ کو سمندر کے کنارے آباد سمجھا کرتے تھے۔ اونتی پورہ میں ہمیشہ خشک سالی رہتی تھی۔ بادشاہ نے اس علاقہ کو آباد و سرسبز کرنے کے لئے ایک نئی نہر جاری کی۔ جس سے شالی کی فصل میں بہت ترقی ہوئی۔

بادشاہ نے اسی طرح ایک نہر پرگنہ کرال میں زین پور کو آباد کرنے کے لئے جاری کی۔

زونراج لکھتا ہے کہ اگلے وقتوں میں سویہ بانی سوپور سے لے کراب تک کشمیر میں بہت سے فرمانروا گزرے ہیں۔ لیکن لوگوں کی بدقسمتی یا بادشاہوں کی کم توجہی کی وجہ سے ملک نے کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ لیکن شری زین العابدین کے عہد میں ملک کی گم شدہ ترقی پھر واپس آگئی۔ اس لئے کہ گذشتہ زمانے میں پیداوار کا انحصار صرف بارش پر ہوتا تھا۔ اور اب بارش کے علاوہ نہروں پر بھی ہے۔

نالہ مار عرف مہاسرت ندی

مہاسرت ایک ندی ہے۔ جوڈل کے چشمہ سے سیراب ہوتی ہوئی سرینگر کے ساتھ آملتی ہے۔ اس کا ذکر کشمیر کی عام روائتوں کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے۔ مہاسرت کا اتصال وتستہ (جہلم) کے ساتھ جس مقام پر ہوتا ہے۔ وہ شاہی محل شیر گڑھی کے عین مقابل ہے۔ یہ جگہ زمانہ قدیم ہی سے ایک مشہور تیرتھ چلی آتی ہے۔ سکھوں کے زمانہ میں یہاں بسنت باغ تھا۔ اب بھی ایک مندر وہاں موجود ہے۔

قدیم ہندو مورخوں نے اس سنگھم (اتصال) کا نام "مہاسرور" وتشتہ سنگھمہ" اور شریور پنڈت نے اس کا خلاصہ کر کے "ماری سنگھم" لکھا ہے۔ یہی لفظ شک اور پرجابھٹ نے بھی استعمال کیا ہے۔ مہاسرت سے ماری اور ماری سے مار مشہور ہو گیا اور اب یہ نالہ اسی نام سے نامزد ہے۔

یہاں تک تو سٹین صاحب کی تحقیقات کا نتیجہ تھا۔ اب مسلمان مورخین نے جو کیفیت نالہ مار اور مار کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھی ہے۔ وہ بھی درج کی جاتی ہے۔ شیخ عبدالوہاب نوری گنائی اپنی کتاب فتحیات کبرویہ میں لکھتے ہیں۔ زمانہ سابق میں تالاب ڈل کا پانی برارہ نمبل کی راہ سے محلّہ علاؤالدین پور (۹) سے ہو کر گزرتا تھا۔ بادشاہ نے غور کرنے کے بعد اس پانی سے فائدہ اٹھانے کی دو تجویزیں سوچیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے پرگنہ اچھن (۱۰) کو آباد سرسبز کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عیدگاہ تک کسی طرح یہ پانی پہنچایا جائے۔ تا کہ لوگوں کو وضو وغیرہ کے لئے تکلیف نہ ہو۔ لیکن یہ دونوں تجویزیں بظاہر خوش اسلوبی سے عملی صورت اختیار کرتی نظر نہ آتی تھیں۔

آخر بادشاہ نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک سانپ نکلا ہے اور وہ دوڑتا جاتا ہے اور پانی کا رستہ دکھاتا جاتا ہے۔ چونکہ بادشاہ کو صفائے باطن کا درجہ بھی حاصل تھا۔ اس لئے یہی واقعہ بعد میں عام بیداری میں مشاہدہ کیا۔ دیکھا کہ ایک سانپ نکلا ہے۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور وہ بھاگا جا رہا ہے اور کسی کے قابو نہیں آتا۔ یہاں تک کہ میدان عیدگاہ تک پہنچا۔ وہاں سے ہوتا ہوا اچھن میں جا کر غائب ہوگیا۔ یہ واقعہ نالہ کی تیاری کے لئے ایک اشارہ تھا۔ چنانچہ سلطان نے اسی لکیر پر کھدائی شروع کرائی اور چونکہ سانپ کو فارسی میں مار کہتے ہیں۔ اس لئے اس آبجو کا نام نالہ مار مشہور ہوگیا۔ دیگر تمام مسلمان مؤرخین نے بھی نالہ مار کی وجہ تسمیہ میں قریباً یہی الفاظ دہرائے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو عہد قدیم کا اس نالہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ سٹین صاحب کے حوالہ سے لکھا جا چکا ہے۔ عہد قدیم میں ''مہاسرت'' نالہ موجود تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ نالہ کریوہ مارتنڈ کی نہر کی طرح مٹ گیا ہو یا بہت چھوٹا ہو۔ اور بعد میں سلطان زین العابدین نے ازسرنو جاری کیا ہو۔ جیسا کہ شریور پنڈت ڈل کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے۔ اسی طرف سے نالہ مار (۱۱) بہتا ہے۔ جس کا پانی شہر باش لوگ نہانے اور پینے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ نے اب اس نالہ کو نہر شالی کے ساتھ ہستی کرن کے مقام پر ملا دیا ہے۔ نہر شالی وتستہ اور سندھو (جہلم اور نالۂ سندھ) کے مقام اتصال تک جہاں اب شادی پور (سابق نام شہاب الدین پور) واقعہ ہے۔ پھیلی ہوئی تھی۔ اس مقام اتصال کو ماری سنگم کہتے ہیں اور یہاں ہندو اپنے مُردوں کی رسومات ادا کرتے ہیں۔

جغرافیہ قدیم کشمیر (ضمیمہ اردو راج ترنگنی) میں بھی لکھا ہے کہ مغرب کی

طرف نالۂ مار کی جو توسیع ہے وہ زمانہ مابعد کی ہے۔ سلطان زین العابدین نے اس کو کشتی رانی کے قابل بنا دیا تھا۔

یہ نالہ شہر کی اندرونی آمدورفت کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے ڈل تک پہنچنے کے لئے ایک آسان گزار شاہراہ تیار کر دی ہے۔ اس کے ذریعہ ڈل کی تمام پیداوار دوسرے مقام خصوصاً شہر سرینگر کے ہر گلی کوچہ تک بآسانی پہنچ رہی ہے۔

اس نالہ سے تین چار شاخیں بھی نکالی گئیں۔ مثلاً کاوہ ڈارہ بارہ مل دولت کل اس نالہ کا دور ۳۱/۲ میل تک بتایا جاتا ہے۔ میدان عیدگاہ میں ایک عالیشان مسجد (۱۲) نام عالی مسجد ہے۔ جو بڈشاہ کے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر نے اپنے نام پر تعمیر کرائی تھی۔ عیدگاہ کے میدان اور اس مسجد میں پانی کی بڑی ضرورت تھی۔ بڈشاہ نے پرگنہ اچھن کی آبادی کے ساتھ ہی عیدگاہ کو بھی پانی پہنچانے کا انتظام کیا۔ چنانچہ نالہ مار کا پانی میدان عیدگاہ سے ہو کر پرگنہ اچھن کو جایا کرتا تھا۔

نالہ مار کے کنارے کئی بزرگ آسودہ خاک ہیں۔ جن میں دو خاص طور پر مشہور ہیں۔ اول حضرت سید محمد بیہقی جن کے مزار پر خواجہ محمد اعظم مؤلف تاریخ اعظمی ۱۱۴۸ھ کے زمانے میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ دوسرے میر سید حبیب سرخابی جو نہایت جلالی شان کے صوفی اور اغنیاء حکام کی صحبت سے سخت متنفر تھے۔

نہر زین گنگا

جنوبی کشمیر کا نام عہد قدیم میں مدوراجیہ تھا۔ اسی کا بگڑا ہوا نام آج تک مراز

چلا آتا ہے۔ یہاں اڈون کے عظیم علاقہ کا جو کرال کے نام سے بھی مشہور ہے کچھ حصہ سطح مرتفع پر واقعہ ہے۔ جو باوجود قرب دریا کے پانی سے محروم تھا۔ بقول شاعر ؎

اے سمندر دیکھ لی ہم نے تری دریادلی ایک قطرے کیلئے ساحل ترستا رہ گیا

جب سلطان زین العابدین نے اس علاقہ میں سلسلہ انہار کو وسعت دی تو اس کا شمالی حصہ ایک جداگانہ پرگنہ بن گیا۔ اس نے اس علاقہ کو آباد کرنے کے لئے اس سطح مرتفع پر اپنے نام سے زین پور ایک قصبہ آباد کیا۔ جس کو سنسکرت زبان کے مورخین نے جین پور اور جین نگر دونوں ناموں سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ جونراج یا زونہ راج اپنی راج ترنگنی کے شلوک ۱۱۵۳ میں جین نگر یا جین پور کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ اس کو زین العابدین نے اپنے نام پر آباد کیا تھا اور کشمیندر مورخ نے اپنے پرکاش (۱۳) میں اس کی تائید کی ہے۔ (۱۴)

زین پور کو آباد و شاداب رکھنے کے لئے زین العابدین نے ایک نہر جاری کی۔ جس نے زین پور کو وہ رونق دی کہ زین پورہ جو ایک قصبہ تھا پرگنہ بن گیا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ اپنے نئے آباد کردہ مقامات پر کوئی نہ کوئی سرکاری مکان بھی تعمیر کرا دیتا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی امیر وزیر بھی چھوٹے موٹے مکان بطور ریسٹ ہاوس (آرام گاہ) بنا لیا کرتے تھے۔ یہاں بھی بادشاہ نے یہی عمل کیا۔ بلکہ کئی لوگوں نے باغات احداث کر کے اس کو نمونہ رشکِ آرام بنا دیا۔ (۱۵)

جونراج اپنی تاریخ کے شلوک ۸۷۶ میں لکھتا ہے کہ زین العابدین نے جین نگری کے لئے جو نہر تعمیر کرائی۔ اس کا نام جین (زین) گنگا رکھا اور اس کو اس قدر وسعت دی کہ "رن سوامن" کے مندر تک لے آیا جو راجہ رانا دتیا نے سرینگر میں تعمیر کرایا تھا۔

اس نہر کا منبع قصبہ شوپیان بیان کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اس کا آخری مقام ''رن سوامن'' کا مندر واقع سرینگر تھا۔ تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا نہر کی لمبائی تیس میل سے کم نہ تھی۔ اور اس سے صرف زینہ پور ہی سیراب نہ ہوتا تھا بلکہ اور کئی دیہات و مقامات کے تشنہ لب کھیت بھی اس سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔

رن سوامن کا مندر سرینگر میں کس مقام پر واقع تھا۔ اس کے متعلق سٹین صاحب جو سنسکرت راج ترنگنی مصنفہ کلہن کے انگریزی مترجم ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''کہا جاتا ہے پچھمی کوہل وہی نہر ہے جو دریائے سندھ علاقہ لار سے نوشہرہ اور سنگین دروازے تک آتی ہے اور جامع مسجد کے پاس سے گزر کر قاضی کدل کے قریب نالہ مار میں جا ملتی ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہو سکے کہ پچھمی کوہل کا موجودہ انتہائی مقام آج بھی وہی ہے جو بقول جونراج زین العابدین کے زمانہ میں تھا۔ تو میں اس قدیم شکستہ مندر ''رن سوامن'' کے کھنڈروں کو جو نالہ مار اور لچھمہ کوہل کے مقام اتصال پر ایک کونہ میں موجود ہیں۔ رن سوامن کا مندر سمجھنے کے لئے تیار ہوں۔''

بڈشاہی سڑکیں

جس بادشاہ کو ملک کی آبادی اور فارغ البالی کیلئے ہر وقت کوئی نہ کوئی مفید تجویز سوچنے سے سروکار رہتا ہو۔ جس نے تپتے ہوئے میدانوں اور خشک قطعات زمین پر پانی کے دریا بہیا دیئے ہوں۔ جس نے ویران اجاڑ اور خاموش مقامات کو جہاں ہر وقت سناٹا چھایا رہتا تھا۔ بارونق قصبہ اور شہر بنادیا ہو۔ جس نے ایسی زمینوں کو

جہاں ایک دانہ تک پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہزار ہا خروار اناج پیدا کرنے کے قابل کر دیا ہو۔ اس بادشاہ نے لوگوں کی آمدورفت اور تجارتی فوائد کیلئے کیا سڑکوں کا کچھ انتظام نہ کیا ہوگا۔ قیاس کہتا ہے کہ ضرور کیا ہوگا۔ لیکن جب اس زمانہ کی راج ترنگنیوں اور مابعد کی تاریخوں سے کوئی شہادت طلب کی جاتی ہے۔ تو کوئی شافی جواب نہیں ملتا۔

غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں نہ بگھیاں تھیں، نہ موٹریں نہ تانگہ اور لاریا! صرف گھوڑے کی سواری ہوتی تھی۔ اور یہی جانور بار برداری کے کام آتا تھا۔ اور تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پرانے کشمیر میں موجودہ زمانہ کی طرح فراغ اور چوڑی سڑکیں نہ تھیں اور نہ ان پر ایسے عظیم الشان پل تھے جیسے آج نظر آرہے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بادشاہ نے بار برداری کیلئے ضرور ایسے رستے بنا رکھے تھے۔ جن پر سے بیل، خچر اور گھوڑے اسباب سے لدے ہوئے بہ آسانی گزر سکتے تھے۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے اور ایک قصبہ دوسرے قصبہ سے انہی رستوں یا پگڈنڈیوں کے ذریعے ملتا تھا۔

زونراج نے ایک جگہ سری نگر کی دلدلی زمین کا ذکر کیا ہے۔ اس پر بادشاہ کے حکم سے جوستھوا (بند) بنایا گیا۔ وہ اتنا وسیع تھا کہ اس کو پل کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ستھو کاچ ڈامر نے جو بادشاہ کے عہد میں افسر شہر تھا۔ مٹی کی بجائے پتھروں سے بنایا۔ لمبائی میں ایک کروش (کوس) تھا۔ اس دلدل اور کیچڑ نے سڑک کو نا قابل غرض بنا رکھا تھا اور خصوصاً بارش کے دنوں میں اس طرف آمدورفت بالکل بند ہو جایا کرتی تھی۔

بڈشاہ کے زمانہ میں کشتیوں کے ذریعہ بھی کافی آمدورفت ہوتی تھی اور شائد فراخ اور پختہ سڑکوں کی عدم موجودگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ پانی کے رستے ایک جگہ سے دوسری جگہ مال واسباب لے جانا آسان تھا۔

حواشی:

۱) وادی لولاب میں جو کپوارہ سے چندی گام تک چودہ میل لمبی ہے۔ اس نالہ کا نام گنڈ ماچھر ہے۔ وادی کے اور بھی بہت سے نالے اس میں ملتے ہیں۔ آخن کا نالہ جو ورنو کی طرف سے آتا ہے۔ مقام گنگا ٹیک کے نزدیک اس میں آملتا ہے۔ دوسرا نالہ کلا روچ ہے۔ جو کھمبریال کے متصل آکر شامل ہو جاتا ہے۔ گنڈماچھر نالہ آخن اور نالہ کلا روچ کا پانی لیکر وادی کے اکثر مواضعات کو سیراب کرتا ہوا۔ جب وادی سے باہر قدم رکھتا اور کپواڑہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ تو اس کا نام پُہرو ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر اس کے ساتھ ایک اور نالہ کیمل نام جو کاغان سے آتا ہے۔ تریہہ گام کو سیراب کرتا ہوا آملتا ہے۔

۲) لولاب کشمیر کی مشہور اور زرخیز وادیوں میں سے ہے۔ اس کے اندر قدرت نے کئی اور چھوٹی چھوٹی وادیاں ''دامن دل مے کشد'' کے لئے بنا رکھی ہیں۔ میں سب سے پہلے یکم اگست ۱۹۲۸ء کو اس وادی میں داخل ہوا اور اس کے آخری مقام تک پہنچا۔ یہ وادی ایک سو پچیس میل مربع ہے۔ اس میں ۷۷ دیہات اور اٹھارہ ہزار تین سو پچیس ۱۸۳۲۵ نفوس آباد ہیں۔ ۱۷۹۸۶۸ ایکڑ اس میں جنگل کا رقبہ ہے۔ جس کی سالانہ آمدنی پانچ چھ لاکھ اور مالیہ چالیس ہزار کے قریب ہے۔ اس میں مشہور گاؤں لال پور، ورنو اور سوگام ہیں۔ لال پور میں مدرسہ، ڈاک خانہ اور پولیس چوکی ہے۔ ورنو ہندوستان کے برگزیدہ عالم شیخ الحدیث مولانا محمد انور شاہ کاشمیریؒ مرحوم سابق صدر مدرس دیوبند کا وطن ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ سوگام میں ڈسپنسری، رینج کوارٹرز ہیں۔ اس وادی میں آبادی سب مسلمانوں ہی کی ہے۔ پنڈتوں کی تعداد ان ۷۷ دیہات میں شاید سو سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنو سے اوپر ایک میل کے فاصلہ پر ہندو زمانہ قدیم کی بہت سی مورتیاں ملتی ہیں۔ لولاب کی تمام چھوٹی بڑی وادیوں میں محکمہ جنگلات والوں نے سڑکیں بنا کر جنگل میں منگل بنا رکھا ہے۔ چنانچہ لولاب میں موٹریں گھومتی پھرتی ہیں۔ یہ جگہ سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند ہے۔

یہاں کی زیادہ پیدوار شالی اور مکی ہے۔ شکاران جنگلوں میں بہت ملتا ہے۔ مدارس کی تعداد دو بھی ۱۸ ہزار سے زیادہ آدمیوں کی آبادی میں چھ سات سے زیادہ نہیں ہے۔ لولآب کا سنسکرت نام لولا اور کشمیری نام لولو ہے اور عام طور پر لولآب بولا جاتا ہے اور کاغذات میں بھی لولآب لکھا جاتا ہے۔ یہ علاقہ راجہ لول (۲۰۴۳ سنہ ق م لغایت ۱۹۸۲ سنہ ق م) کا آباد کردہ ہے۔ جیسا کہ تاریخ حسن نے صفحہ ۱۳۰ پر لکھا ہے۔ ''تپہ لولاب درہ است سرحد شمالی کشمیر کہ از چارسو کوہستان دارد راجہ لو آباد کردہ است''۔ لولآب کی دل فریبیاں شاید اس شعر سے کچھ ظاہر ہوسکیں۔ از مولف

بار ہا دیکھ چکا پھر بھی تمنا ہے یہی ۔۔۔ ایک بار اور دکھا دے کوئی لولاب مجھے

۳) پہرو اور بنہ گام بالکل پاس پاس ہیں اور سڑک ہندواڑہ پر جاتے ہوئے جہاں ستھو باندھا گیا ہے وہاں نالہ سے پار اب بھی یہ دونوں مواضعات موجود اور آباد ہیں۔

۴) از مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

۵) گنیش پور سے کریوہ مارتنڈ تک قریباً تیس چالیس دیہات کے رقبہ کو یہ نہر سراب کرتی تھی۔

۶) التواریخ خوارق السالکین غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۱۰۹ھ صفحہ ۹۳۔

۷) جغرافیہ قدیم کشمیر صفحہ ۲۷ ضمیمہ راج ترنگنی۔

۸) اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں بھی مارتنڈ کا انگور بہت مشہور رہا ہے۔ اس زمانہ میں ایک درم یا ڈیڑھ پیسے کے ۸ سیر خام یا ۴ سیر پختہ انگور آتے تھے۔ کشمیر سے دہلی تک ایک ڈالی لے جانے کی مزدوری دو روپے تھی۔ اس زمانے میں بھی اس قسم کی اور اتنی ہی بڑی ڈالیاں ہوا کرتی تھیں۔ جیسی آج نظر آرہی ہیں۔ کشمیر سے لاہور اور لاہور سے دہلی تک کی مسافت کا اندازہ کرو اور پھر یہ بھی خیال کرو کہ اس زمانے میں راستے کس قدر ناہموار تھے اور پھر دو روپے اجرت پر بھی نظر ڈالو۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں دو روپے کی قریباً ساٹھ من اکبری شالی آتی تھی۔ اس زمانہ کا من موجودہ من سے بہت کم ہوتا تھا۔ کشمیر سے دہلی تک کی مسافت پاپیادہ ۲۴۔۲۵ یوم بلکہ ایک ماہ سے کم میں طے نہ ہوتی تھی۔

(۹) مراد ازنن مرگ کریوہ جو تحصیل کولگام میں ہے۔

(۱۰) نسبل کشمیری لفظ ہے اور اس قطعہ زمین کا نام ہے جو نمناک اور زرخیز یعنی دلدل کی قسم کی ہو۔ ایسا قطعہ زمین جس میں تقریباً دو حصہ پانی اور ایک حصہ مٹی ہو کشمیر کے نمبلوں میں سے برارہ نمبل اس لحاظ سے کہ نفس شہر کے شمالی حصہ میں موجود ہے۔ نہایت آباد مزروع اور زرخیز ہے۔ یہاں سفیدہ اور بید کے درخت بکثرت ہیں۔

(۱۱) تعمیر کردہ سلطان علاؤ الدین والئے کشمیر عہد حکومت (۱۳۴۸ء لغایت ۱۳۶۰ء) یہ ایک وسیع احاطہ کا نام ہے۔ جس میں حسب ذیل محلہ جات ہیں۔ خانقاہ معلیٰ، دوکان سنگین، نر پرستان، ملک آنگن۔ شاہی تعمیرات اب نابود ہیں۔ البتہ ملک آنگن میں قبرستان کا ایک چھوٹا سا احاطہ ہے۔ مشہور ہے کہ وہاں علاؤ الدین کا مزار ہے جو محکمہ آثار قدیمہ والوں نے حال ہی میں کھود کر نکالا ہے۔ ابھی وہ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

(۱۲) سرینگر کے غربی حصہ میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقعہ ہے۔ اور عیدگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ نمبل سنگھم کی زراعت جو شالی پرگنہ اچھن ہے۔ بہ لحاظ ملائمت و لطافت بہت مشہور ہے۔

(۱۳) آج اس نالہ پر چودہ پل ہیں۔ سات قدیم ہیں اور سات زمانہ مابعد کے (۱) پل نایدیار (۲) پل جوگی لنکر (۳) پل ناوہ پورہ (۴) نایدکدل (۵) بوہری کدل (۶) صراف کدل (۷) کادی کدل (۸) راجوری کدل یا راجوری کدل (۹) پل کاوہ ڈارہ (۱۰) ڈونبہ کدل (۱۱) پل سکہ ڈافر (۱۲) پل رتہ پورہ (۱۳) گاؤ کدل (۱۴) پل گندر پورہ۔ سات سنگین پلوں کی تصدیق وجیز التواریخ غیر مطبوعہ مصنفہ ملا عبدالغنی ۱۲۴۷ھ سے بھی ہوتی ہے۔

(۱۴) عیدگاہ کا میدان بہت وسیع ہے اور قدرت نے جو مخملی فرش (سبز گھاس) اس پر بچھا رکھا ہے۔ اس نے اس کی سادگی کو بہت دلفریب بنا دیا ہے۔ مسجد بہت وسیع، فراخ اور بلند و بالا ہے۔ لیکن بہت شکستہ حالت میں ہے۔ فرش اکھڑا ہوا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کبھی فرش تھا ہی نہیں۔ بارش میں پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ مسجد کے پاس ہی دائیں طرف سیاہ پتھر کی سیڑھیاں وضو کے لئے بنی ہوئی ہیں۔ جو مٹی سے ڈھکی ہوئی اور پانی میں چھپی ہوئی ہیں۔ پانی میں لمبی لمبی گھاس

آ گئی ہوئی ہے۔

(۱۵ ترجمہ راج ترنگنی کا ضمیمہ کشمیر کا جغرافیہ قدیم صفحہ ۶۱۔

(۱۶ مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

اٹھارھواں باب

بڈشاہی زمانہ کے قحط اور سیلاب اور نرخ اجناس

عہد قدیم کا طریق مال گزاری

راجگان ہنود کے عہد میں مالیہ کس شکل اور کس صورت سے وصول کیا جاتا تھا اس کی تفصیلات کسی سابقہ مورخ نے نہیں بتائیں۔ لیکن خیال یہ ہے کہ چونکہ ان ایام میں سکہ کا رواج بہت کم تھا۔ اس لئے مالیہ جنس ہی کی صورت میں وصول ہوتا ہوگا اور سکہ کے رواج کے باوجود بھی چونکہ عہد قدیم میں جنس کا تبادلہ بالعموم جنس ہی سے کیا جاتا تھا۔ اس لئے مالیہ کا رواج بھی جنس ہی کی صورت میں تھا۔ (۱)

کشمیر میں جب مسلمانوں کا زمانہ آیا تو بقول فرشتہ سلطان شمس الدین نے ۱۳۴۱ء میں پیداوار کا چھٹا حصہ سرکاری مالیہ مقرر کیا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں بقول ابوالفضل مال درآمد پر چھٹا حصہ محصول مقرر ہوا۔ البتہ سلطان سکندر کے زمانے میں اس کے وزیر سیہہ بٹ نے مالیہ اور دیگر محصولات میں بہت کچھ اضافہ کردیا۔

عہد بڈ شاہی میں مالیہ کا طریق

سلطان شمس الدین سے زین العابدین بڈ شاہ کے باپ سلطان سکندر بت شکن کے زمانہ تک کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ بڈ شاہ کے بھائی علی شاہ کے زمانہ میں بھی یہی کیفیت تھی۔ لیکن جب بڈ شاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت آئی تو اس نے جہاں پیمانہ اور اوزان رعایا کے مفید مطلب ایجاد کئے۔ افسروں کو زمینداروں سے رشوت لینے اور ان کو تنگ کرنے کی ممانعت کی۔ وہاں اس نے مالیہ پیداوار کا ۱/۶ حصہ کر دیا۔ جو اس کے جدامجد سلطان شمس الدین کے زمانہ میں تھا۔ البتہ علاقہ زنگیر کیلئے یہ رعایت تھی کہ وہاں مالیہ پیداوار کا ۱/۷ حصہ لیا جاتا تھا۔

بڈ شاہ کے عہد میں چونکہ نہروں کی کثرت تھی اور رعایا امن و مسرت کے ساتھ رہتی تھی۔ اس لئے زمیندار اطمینان کے ساتھ کاشت کا کام کرتے تھے۔ مصنف تاریخ حسن صفحہ ۱۳۳ پر لکھتے ہیں۔ ’’در عہد سلطان زین العابدین یک کروڑ سیزدہ لک خروار داخل خزینہ میشود‘‘۔ غور کرو جب مالیہ ہی میں ایک کروڑ سترہ لاکھ خروار مختلف اجناس سے آتی تھی تو ملک کی پیداوار کس افراط سے ہوتی ہوگی۔ (۲)

شالی کا نرخ قدیم

شالی اس ملک کی خاص پیداوار ہے۔ بلکہ چاول (شالی) کو اگر اہل کشمیر کی

قومی خوراک کہا جائے تو بالکل مناسب ہے۔شالی کی گرانی اور ارزانی ہی باشندگان کشمیر کو فارغ البال اور تنگدست بنا سکتی ہے۔کشمیر کی تاریخوں میں سب سے پہلے شالی کی قیمتوں کا ذکر راجہ اونتی ورمن کے عہد میں آیا ہے۔جس نے آبپاشی کے طریقوں میں وسیع اصلاح کی تھی اور ملک کی ذراعتی ترقی کی وجہ سے شالی کا نرخ ارزاں ہوگیا تھا۔

سوا تین پیسے کی خروار شالی

راجہ اونتی ورمن کے زمانے میں ایک خروار شالی کی قیمت بالا وسط دوسو دینار یا سوا تین پیسے تھی۔ جو قحط کے دنوں میں زیادہ سے زیادہ ۱۰۵۰ دینار یا چار آنہ تک ہو جاتی تھی۔ جب سوپور کے بانی سویہ نے اراضی کی کاشت کو اور وسعت دی تو نرخ ۳۶ دنیار تک کم ہوگیا۔یعنی ایک خروار شالی کی قیمت دوسو دینار کی بجائے ۱۶۴ دینار رہ گئی۔

قحط میں شالی کا نرخ ۲ر خروار

راجہ ہرش کے زمانے میں شالی بہت سستی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کی کچھ قیمت ہی نہ تھی۔لیکن جب اس کے آخری عہد حکومت میں ایک دفعہ شدت کا قحط پڑا۔تو ایک خروار شالی کی قیمت پانچ سو دینار یا دو آنہ ہوگئی۔

بڈشاہی زمانہ کا نرخ

شریور لکھتا ہے۔ سلطان زین العابدین کے زمانہ میں شالی کی قیمت فی خروار ۳۰ دینار یا ساڑھے چار پیسے تھی۔ چونکہ کشمیر میں مالیہ جنس ہی کی صورت میں لیا جاتا تھا۔ اس لئے شاہی ذخیرہ میں کافی جنس رہا کرتی اور سرکاری نرخ پر فروخت ہوا کرتی تھی۔ چونکہ یہ قیمت عام مقررہ نرخ سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے لوگ سرکاری ذخیرے سے بہ امر مجبوری غلّہ خریدار کرتے تھے

انگور ڈیڑھ پیسے کا پانچ سیر

راجہ ہرش کے زمانہ قحط میں پشم (اون) کی قیمت فی خروار گیارہ ہزار دینار یا دوروپے بارہ آنے تھی۔ انگور ایک دینار کا چار تولہ آتا تھا یا بیس دینار کا ایک سیر۔ بیس دینار کا کوئی سکہ نہیں تھا بلکہ اس کی کوڑیاں گنی جاتی تھیں۔ زین العابدین کے زمانہ میں بھی قریباً یہی نرخ تھا۔ ابوالفضل کی تحریر کے مطابق ایک سو دینار کا ایک دام ہوتا تھا۔ اور دام کی قیمت ۲/۱، ۱ پیشہ تھی۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ ۲/۱، ۱ پیسے کا انگور بڈشاہ کے زمانہ میں پانچ سیر آتا تھا۔

نمک کا بڈشاہی نرخ

نمک کی قیمت کشمیر میں دیگر ممالک کی نسبت ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کشمیر میں نہیں ہوتا۔ اس کی درآمد پنجاب اور لداخ سے کشمیر میں ہوتی ہے۔ شریورا اپنی راج ترنگنی کے ۲ شلوک ۸۴ میں سیاسی فسادات کے زمانہ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ جنوبی راستے بند تھے اور دارالخلافہ سرینگر میں ۲ /۱، اپل یا ۶ تولہ نمک کی قیمت ۲۵ دینار یا ایک پوتن سو یا ایک دام کا چوتھا حصہ تھی۔ اس حساب سے ایک سیر کی قیمت اس زمانہ میں پانچ پیسے تھی یا فی من تین روپے دو آنہ۔ اکبر کے زمانہ میں بھی جو بڈشاہ سے ایک سو سال بعد گزرا ہے۔ قریباً یہی قیمت تھی۔

نرخ نویسی کی ابتدا

نرخ نوسی کا رواج بھی بڈشاہی زمانے سے ہوا۔ اس زمانے میں چھاپے کا رواج نہ تھا۔ اس نے ورق ہائے مس پر تمام اجناس کے نرخ کندہ کرائے اور دارالخلافے کے علاوہ پرگنوں اور قصبوں میں یہ ورق اطلاع عام کے لئے بھجوائے۔ ان اوراق کے اخیر میں یہ الفاظ بھی درج تھے ہر کہ بعد از ما باشد و بہ ایں دستور العمل عامل نہ باشند اور او اند خدا'' (۳) لیکن ''زمانہ ہر کہ آمد عمارت تو ساخت'' کا مصداق ہے۔ بڈشاہ کی باتیں بڈشاہ کے ساتھ ہی چلی گئیں ۔

گئیں وہ رونقیں سب داغ کے ساتھ   وہی دم تھا غنیمت وہ نہیں ہے

کشمیر کے قحط اور ان کے انسداد

لارنس صاحب (۴) اپنی کتاب ویلی آف کشمیر میں لکھتے ہیں۔ کشمیر کے مورخوں نے اپنے ملک کے انیس بڑے بڑے قحطوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی وجوہ کے متعلق ان کے مختلف بیانات ہیں۔ لیکن سب سے اہم امر جس پر سب مورخین نے اتفاق کیا ہے یہ ہے کہ عموماً بے وقت برفباری، کثرتِ آب اور اس کے بعد آتشزدگی کے واقعات سے ہمیشہ یہ ملک تباہ ہوا ہے۔ چنانچہ ایک کشمیری شاعر کا ایک شعر بھی اس کی تائید وتصدیق کرتا ہے وہ کہتا ہے ؂

ز آب و آتش است آباد کشمیر
ازیں ہر دو شود برباد کشمیر

(خادم سوپوری مرحوم)

جب کبھی اس قسم کے افسوسناک واقعات پیش آتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کا ضرور کچھ نہ کچھ انسداد وانتظام ہوتا تھا۔

اگرچہ قحط کا اثر کچھ کم ہولناک نہ تھا لیکن زین العابدین نے پوری کامیابی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اور کئی مقامات پر محصول یعنی لگان کم کر دیا۔ طبقات اکبری کے مصنف نے بھی اس قحط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ بادشاہ نے علاوہ زر بخشی کے کئی مقامات پر ان کی پیداوار کے لحاظ سے مالیہ کم کر دیا اور کئی دیہہ اور پرگنے مالیہ کی ادائیگی سے آزاد کر دیئے۔

مصنف تاریخ حسن نے بھی لکھا ہے کہ اس موقعہ پر بادشاہ نے غلے اور خزانے دونوں کے منہ رعایا کیلئے کھول دیئے۔ وہ لکھتا ہے" سلطان خزائن و وفائن فراواں وقف محتاجاں کردہ جان بخشی قحط زدگان فرمود"۔

بڈشاہ کے زمانے میں ۳۶ لوکک کا قحط

شریور زینہ راج ترنگنی کی دوسری فصل میں بڈشاہ کے زمانے کے ایک عظیم قحط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ قدرت کے اختیار میں ہے کہ فصل زیادہ کرے تو ملک خوشحال ہو جائے اور کم پیدا کرے یا نہ کرے تو ملک قحط کے مصائب میں گرفتار ہو کر ملک الموت کے منہ کا نوالہ بن جائے۔ انہی بادلوں سے ہر وقت برکھا ہوتی ہے تو گھاس اور چارہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے مال مویشی پلتے ہیں، اناج پیدا ہوتا ہے، جس سے انسان زندگی پاتے ہیں۔ اور انہی بادلوں سے بے موقع بارش ہوتی یا برف گرتی ہے۔ یا بارش بالکل ہی نہیں ہوتی تو ملک بھر میں قحط کی وبا نازل ہو جاتی ہے۔

۳۶ لوکک میں جب کہ عیسوی ۱۴۶۰ اور ہجری سال ۸۶۴ تھا۔ ملک میں فصل تو اچھی پیدا ہوئی لیکن چیت کے آتے ہی آسمان سے اچانک گرد وغبار (۵) کی ایک خوفناک بارش ہوئی۔ پتے اور پھول اس گرم گرد وغبار سے مرجھا کر جھڑ گئے۔ بادشاہ نے اپنے ایک درباری منجم سے اس گرد وغبار کے متعلق دریافت کیا۔ منجم نے عرض کیا۔ یہ گرد وغبار جو زمین وآسمان پر چھا گیا ہے۔ ایک ہولناک قحط کا پیش خیمہ ہے۔ گزشتہ لوکک صدی کے ۳۶ میں اسی طرح ایک قحط پڑا تھا۔ اور اس صدی کا

چھتیسواں سال بھی مجھے ایسا ہی نظر آتا ہے۔

ملک شالی کی فصل سے بھرپور تھا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد شدید برفباری اور بارش نے ملک کا نقشہ بدل دیا۔ برف کی کثرت سے ''زمین ہم سفید وفلک ہم سفید'' کی کیفیت نہ صرف پہاڑوں پر سے بلکہ درودیوار سے نظر آنے لگی۔ شالی کی پختہ فصل برف کے نیچے اس طرح دب گئی۔ جس طرح قصاب بکرے کو ذبح کرنے کے وقت اپنے گھٹنوں کے نیچے دبالیتا ہے۔

شریور اس قحط کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ آئندہ فصل کی کوئی توقع نہ رہی۔ اس لئے غلہ دار غلہ کو دبا کر بیٹھ گئے اور شالی اس قدر نایاب ہوگئی کہ کسی قیمت پر بھی ہاتھ نہ آتی تھی۔ شالی کا جو خروار تین سو دینار یعنی پانچ پیسے سے بھی کم میں آتا تھا۔ اب وہ پندرہ سو دینار پر بھی آسانی سے دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ شریور کا بیان ہے کہ میں نے ایک امیر شخص کو دیکھا۔ جو ایک وقت کی خوراک کیلئے ترس رہا تھا۔ آخر جب اسے بمشکل خوراک دستیاب ہوئی۔ تو اس بے صبری سے اور اس کثرت سے اس نے کھانا کھایا کہ اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا۔

غلہ داروں نے شالی کو چھپا رکھا تھا۔ اس لئے جب کسی کو یہ خبر ملتی تھی کہ فلاں مقام پر غلہ فروخت ہو رہا ہے۔ تو لوگوں کا انبوہ کثیر وہاں جمع ہو جاتا تھا۔ تمام ملک بھکاریوں کی طرح نظر آرہا تھا۔ کئی کئی دنوں کے پکے ہوئے چاول اور کئی کئی دنوں کی بوسیدہ روٹیاں (کلچہ وغیرہ) نعمت غیر مترقبہ تصور کی جاتی تھیں۔

بہت سے لوگ خوراک نہ مل سکنے کی وجہ سے مر گئے۔ کئی آدمی زیادہ کھا کر ہلاک ہوگئے اور وہ زیادہ اس لئے کھا جاتے تھے کہ ان کو دوسرے وقت کا کھانا دستیاب

ہونے کی توقع نہ ہوتی تھی۔ لوگ پتوں، درختوں کی نرم نرم شاخوں اور گلے سڑے میووں پر گزارہ کرتے تھے۔ ان ایام میں گھی، تیل اور نمک کا کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا۔ دیہاتی آبادی کا حال شہر باشوں سے بھی بدتر تھا۔ انتہا یہ ہے کہ شالی کوٹنے سے جو بھوسہ برادہ کی شکل میں نکلتا ہے جس کو کشمیری زبان میں کم (KUM) کہتے ہیں۔ لوگ اس میں نمک ملا کر کھایا کرتے تھے۔ اور یہ بھی ہر ایک کو نصیب نہ ہوتا تھا۔

اس قسم کا ہولناک قحط ہو اور بڈشاہ جیسا بادشاہ اس کے انسداد سے غافل اور رعایا کے حالات سے بے خبر رہے۔ یہ کبھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جونہی بادشاہ کو قحط کی ان تباہ کاریوں کا علم ہوا۔ بادشاہ نے سرکاری شالی (۶) کے کوٹھار غریبوں کیلئے وقف کر دئے اور جہاں کوٹھار نہیں تھے۔ وہاں سرکاری شالی جمع کر کے نئے کوٹھار بنوا دیئے۔

سرکاری کوٹھار کو وقف عام کرنے کے علاوہ بادشاہ مسلسل کئی ماہ تک ہزار ہا لوگوں کو ہر روز کھانا کھلاتا رہا۔ قحط کے ایام میں جن لوگوں نے قحط کے مصائب سے بچنے کیلئے اپنی قیمتی اشیاء سستے داموں بیچ دی تھیں۔ وہ غلہ داروں سے واپس دلائیں۔ یا مناسب قیمت پر فروخت کرنے کا حکم دیا اور آئندہ کے لئے اس قسم کی خرید و فروخت کیلئے سخت ممانعت کر دی اور غلہ داروں کے لئے سخت سے سخت احکام نافذ کئے۔

ملک میں شدت قحط کی وجہ سے لوگوں نے اخروٹ بھی ختم کر ڈالے تھے۔ اس لئے تیل کا دستیاب ہونا بھی ناممکنات میں داخل تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دیودار درختوں سے تیل نکالا جائے۔ چنانچہ جب تک قحط کا دورہ دورہ رہا یہی تیل استعمال میں آتا رہا۔ شریور لکھتا ہے۔ اس قہر خداوندی یعنی قحط کی وجہ سے سب سے بڑا یہ نقصان ہوا کہ علوم وفنون کی چونسٹھ شاخیں اور صنعت وحرفت کی ترقی اور دیگر قسم کی

دستکاریاں سب تباہ ہو گئیں۔

تاریخ فرشتہ میں بڈ شاہی عہد کے اس قحط اور انسداد قحط کا ذکر ہے۔لکھا ہے کہ کشمیر میں ایسا قحط پڑا کہ نان کے عوض جان ایک معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔سونے اور چاندی کو چھوڑ کر لوگ غلہ وآذوقہ کی چوری کو زیادہ مفید سمجھتے تھے۔میوہ ابھی خام ہی ہوتا تھا کہ لوگ اس کو کھا جاتے اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔درختوں کے پتے اور کچھی سبزیاں تک لوگ کھا گئے۔بادشاہ اس واقعہ سے ہر لحظ محزون وغمگین رہتا تھا اور سرکاری کوٹھاروں کے علاوہ ادھر ادھر سے غلہ فراہم کر کے رعایا کو تقسیم کیا کرتا تھا۔جب قحط سے کسی قدر نجات ہوئی تو بادشاہ نے بعض محالات میں ۱/۶ اور بعض میں ۱/۷ حصہ مالیہ مقرر کر دیا۔

۳۸ھ لوکک کا سیلاب

ابھی ۳۶ھ کے قحط کی ہولناک یاد لوگوں کو فراموش نہ ہوئی تھی کہ ۳۸ھ میں گرد و غبار کی پھر بارش ہوئی۔لوگ پہلے ہی سہمے ہوئے تھے وہ اور بھی خوفزدہ ہو گئے۔اس گرد و غبار کے فوراً بعد بادل کی گرج، رعد کی کڑک اور آخر میں کئی دن کی موسلا دھار بارش نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔اس لگا تار بارش سے سیلاب کا اندیشہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔

وتستہ (۷)، لدری (۸)، سندھو (۹) اور کشپ ٹکا (۱۰) میں پانی اس زور وشور سے بہتا تھا اور اس کی روانی اس قدر تیز تھی اور ان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا جوش وخروش

اس قسم کا تھا کہ چاروں دریا اوران کے معاون ندی نالے دارالحکومت یعنی سرینگر کو محاذ جنگ قرار کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ ان دریاؤں کے کناروں پر جس قدر گاؤں آباد تھے۔ وہ سب غرق بلکہ دریا بُرد ہو چکے تھے۔

دریائے وشو کا (وشو) نے مدوراجیہ (مراز یعنی جنوبی کشمیر) میں فصلوں، انسانوں، مکانوں اور مویشیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور وجبشیور کو بھی اس نے تباہ کر دیا۔

بادشاہ نے وتستہ کے کنارے ایک محل تیار کرا رکھا تھا۔ یہ محل پتھر اور لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ چار بُرج اس کے چاروں کونوں پر تھے۔ اس مکان پر شاہی جھنڈا ہمیشہ لہرایا کرتا تھا۔ اس محل کا ایک حصہ جس کا رخ شہر کی طرف تھا۔ سیلاب کے زور سے گر پڑا اور اس کے دو برج بھی مسمار ہو گئے۔ اس کے علاہ شہر کی اور بہت سی عمارتیں جو نشیب میں تھیں۔ غرق آب ہو گئیں۔

یہ تو علاقہ مراز کا حال تھا۔ کمراز میں جھیل مہاپدم یعنی وُلر نے بہت سے دیہاتوں کو نقصان پہنچایا۔ ڈُوبگ ایک گاؤں تھا۔ وہ تو پانی میں تیرتا ہوا نظر آتا تھا۔ پانی کی کثرت نے رستے ناقابل عبور کر دیئے تھے۔ کھیتوں میں کیچڑ کی تہہ نشینی نے فصلوں کو برباد کر دیا۔

بادشاہ سیلاب کے نقصانات دیکھنے کے لئے شہر سے باہر نکلا۔ اور کشتی پر سوار ہو کر مراز اور کمراز میں پھرتا رہا۔ کھیتوں کی تباہی و بربادی نے اس کے دل پر بڑا اثر کیا۔ بادشاہ ایک ایسے مقام پر بھی کشتی لے گیا جو بہت بلندی پر واقع تھا اور جہاں شیر گجروں یعنی دودھ بیچنے والوں کی آبادی تھی۔ یہ بستی مرتفع سطح پر واقع ہونے کے

باوجود غرق ہوگئی تھی۔

غرض سیلاب چند ہی دنوں میں جس تیز روی سے آیا تھا۔اسی تیز قدمی سے ملک کو تباہ کر کے آگے بڑھ گیا۔اسی سیلاب کے بعد بادشاہ نے دارالحکومت اور بعض مقامات کو سیلاب کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے جیا پیڈ پور (اندرکوٹ) کے نزدیک ایک شہر زینہ تلک کی بنیاد رکھی اور ترپیسو (TARI PASHWARA) اوردارالا کثیتر کے مقام پر بے شمار مفلوک الحال لوگوں کے لئے شاہی لنگر کھول دیا۔

زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ نے صرف ایک دن کے اندر دس کروڑ دینار غریب اور محتاج لوگوں کو تقسیم کر دیئے تھے۔ابوالفضل کے تحریر کے مطابق دس کروڑ دینار کی قیمت پچیس ہزار روپیہ تھی اور ہر چند کہ شدت بارش نے سارے ملک کو عالم آب بنا رکھا تھا۔مگر خروار شالی کی قیمت چھ آنہ سے زیادہ نہ ہوئی۔

اراضیات کی خرید وفروخت کا باقاعدہ اندراج

سلطان زین العابدین سے پہلے زمین کی خرید وفروخت اور بیع اور رہن کا دستور تو تھا۔لیکن معلوم ہوتا ہے۔اس قسم کی خرید وفروخت کے باقاعدہ اندراج کا کوئی سرکاری انتظام نہ تھا یا تھا بھی تو اس پر عملدارآمد نہ ہوتا تھا۔لوگ ایک دوسرے سے جو اراضیات خریدتے ہونگے یا رہن رکھتے ہونگے۔ان کے لئے ایک دوسرے سے پرائیویٹ طور پر تحریریں لے لیتے ہوں گے اور باہمی اعتماد سے یہ کام چلتا ہوگا۔

لیکن دنیا میں تین قسم کے سب سے بڑے جھگڑے اور فساد جو مشہور ہیں۔

ان میں سے زمین کے جھگڑوں کو خاص اہمیت ہے۔ مرلہ اور کنال تو بڑی بات ہے۔ ایک ایک انچہ اور ایک ایک فٹ کے لئے زمینداروں میں کشت وخون کی نوبت آجاتی ہے۔ اس لئے جب ان جھگڑوں کی نوبت فتنہ وفساد اور لڑائی دنگوں تک پہنچنے لگی۔ اور اس کے مقدمات کثرت سے آنے لگے۔ تو بادشاہ نے حکم دیا کہ زمینوں کی خرید و فروخت کا باقاعدہ اندراج ہوا کرے۔ اس زمانے میں بھوج پتر کے کاغذوں کا زیادہ رواج تھا۔ اس لئے زیادہ ترانہی کاغذوں پر اندراج ہوتا تھا۔ زونراج نے یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ نے اراضیات کی خرید وفروخت کے لئے باقاعدہ دفاتر جاری کئے۔ ان دفاتر اور ان کے افسر اعلیٰ کے فرائض شائد وہی ہوں۔ جو اس زمانے میں محکمہ رجسٹریشن اور سب رجسٹرار یا رجسٹرار صاحبان کو حاصل ہیں۔ جو اراضیات کی خرید وفروخت کی باقاعدہ تصدیق کرتے ہیں۔ تاکہ بعد میں مشتری اور بائع میں کسی قسم کا قانونی جھگڑا نہ ہوسکے۔

حواشی:

۱) جنسی مالیہ مسلمانوں اور سکھوں کے عہد تک بھی کشمیر میں جاری رہا۔ البتہ ڈوگرہ حکومت کے زمانے میں بہ عہد مہاراجہ پرتاپ سنگھ لارنس صاحب کمشنر بندوبست نے بندوبست کے وقت جنسی مالیہ کے جگہ نقد مالیہ مقرر کیا۔ جواب تک جاری ہے۔

۲) مورکرافٹ کے زمانہ حیات (۱۹۲۵ء) میں جب کشمیر میں سکھوں کی حکومت تھی شالی کی پیداوار ۲۰ لاکھ خروار تھی۔

۳) طبقات اکبری۔

۴) لارنس صاحب کشمیر کے کمشنر بندوبست تھے۔ سب سے پہلے آپ ہی نے جنسی مالیہ کو نقدی میں تبدیل کیا۔ کشمیر کے لوگ آج تک ان کے دعائیہ گیت گاتے اور ان کی تعریف کرتے سنے گئے ہیں۔ لنڈن جا کر ''ویلی آف کشمیر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جو چھپ چکی ہے۔ پہلے مسٹر لارنس تھے۔ پھر سر والٹر لارنس ہو گئے۔

۵) زینہ راج ترنگنی کا مترجم جے سی دت لکھتا ہے کہ میں نے اس قسم کی بارش جموں میں ۱۸۸۵ء و ۱۸۸۶ء کے سرما میں دیکھی تھی لیکن راقم مؤلف نے ٹھیک اس قسم کے گرد و غبار کی بارش خاص کشمیر (سرینگر) میں جولائی ۱۹۳۸ء کے ابتدائی ایام میں کتاب ہذا کی تالیف کے دوران میں دیکھی ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ آسمان پر بارش یا آندھی کے کوئی آثار نہ تھے۔ کہ ۵ یا ۶ بجے شام کے قریب گپکار اور چشمہ شاہی کے پہاڑوں کو عبور کرتی ہوئی سیاہ گرد و غبار کی آندھی نے تاریکی کا عالم پیدا کر دیا۔ ولر اور ڈل میں جو لوگ کشتیوں پر تھے ان میں سے کئی ایک ضائع ہو گئے۔ کئی درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ رات کو تھوڑی سی بارش بھی ہوئی۔ مگر الحمد اللہ کہ فصلوں کو نقصان نہیں پہنچا۔ اور نہ قحط کے آثار ظاہر ہوئے۔

٦) اس زمانے میں مالیہ کے ذریعہ جو شالی آتی تھی۔ وہ سرکاری کوٹھاروں میں جمع رہتی تھی اور وقت بے وقت کام آیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں مالیہ تو نقد وصول ہوتا ہے لیکن سرینگر میں جو سرکاری کوٹھار ہیں اور جن کا نام شالی سٹور ہے وہاں مجوزہ کے ذریعہ شالی جمع رہتی ہے اور سرکاری نرخ پر شہر باشوں کو فروخت کی جاتی ہے۔ بہرحال سرکاری کوٹھاروں میں شالی جمع رکھنے کا رواج کسی نہ کسی صورت میں زیادہ قدیم ہی سے چلا آتا ہے۔

٧) وتستہ دریائے جہلم کا قدیم سنسکرت نام۔

٨) دریائے لمبودری جو امرناتھ جی کی طرف سے پہلگام کے پاس سے گزرتا ہے۔

٩) سندھو نالہ سندھ گاندربل والا۔

١٠) کشپ ٹکا نالہ کٹھ کوہل جو شیرگڈی سرینگر کے پہلو سے نکل کر چھتہ بل کے پاس پھر جہلم میں شامل ہو جاتا ہے۔

انیسواں باب

کشمیر کے سکے یا اوزان

کوڑیوں کا رواج

زمانہ قدیم سے ہندوستان کے دیگر حصوں کی طرح کشمیر میں بھی کوڑیوں کا رواج سکوں کے طور پر چلا آیا ہے۔ پنڈت کلہن اپنی راج ترنگنی میں اور کیش مندر اور جونراج نے اپنی تاریخوں میں کوڑیوں کا ذکر کیا ہے۔ آج تم کسی کی حیثیت پر حرف گیری کرنا چاہتے ہو تو کہتے ہو کہ وہ دو کوڑی کا آدمی نہیں۔ لیکن غور کرو کہ جب انہی کوڑیوں میں بادشاہ وقت زمینداروں سے مالیہ اور رعایا سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے اور یہی کوڑیاں وزراء امراء اور فوج کے سپاہیوں اور دیگر اہلکاروں کو تنخواہوں میں ملا کرتی تھیں۔ یہ قدرتی سکہ جو سمندروں اور دریاؤں کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ آج انقلاب زمانہ کے ہاتھوں نہ صرف کشمیر سے بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ سے نابود ہو رہا ہے۔ (۱)

کشمیر میں سب سے پہلا سکّہ

بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ تورمان (۲) (راجہ ہرنیہ کے بھائی) نے سب سے

پہلے کشمیر میں سکہ رائج کرنے کی ضرورت محسوس کی ۔ چنانچہ ایک ٹکسال بنایا گیا جہاں سکے مسکوک کئے گئے ۔تورمان سکہ کس قیمت پر چلتا تھا۔اس کے متعلق کوئی صحیح واقفیت نہیں مل سکی۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ تورمان کے بعد بھی تورمان سکہ عرصہ دراز تک مختلف راجوں کے زمانے میں کشمیر میں رائج رہا۔ بلکہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانہ اور اس کے بعد اس کے پوتے سلطان حسن شاہ کے زمانہ (۲۷۴۱ء لغایت ۱۴۸۴ء) تک بھی اس سکہ کے کچھ نہ کچھ نشان ملتے رہے (۳)

ہندو عہد قدیم کے سکے

اگر تورمان سکہ تانبے کا تھا۔تو اس کو تانبہ کی کان کہاں سے ملی۔اس پر بھی پنڈت کلہن نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔البتہ راجہ جیا پیڈ (۴) کے حالات میں لکھتا ہے کہ جھیل مہا پدم (ولر) کے ناگ پر اس کو تانبہ کی جو کان ملی تھی ۔ وہ کرم راجیہ کے پہاڑ میں تھی ۔اس سے جیا پیڈ کو اس قدر تانبہ ملا جو ایک کروڑ دینا (۵) مسکوک کرنے کیلئے کافی تھا۔

اس تانبہ کے سکے کی موجودگی میں کوڑیوں کا سکہ بھی جاری تھا۔کیش مندر کی کتاب لوک پرکاش کی تصنیف نانویں صدی عیسوی کے وسطی زمانہ کی ہے۔اس کتاب کے دوسرے پرکاش میں تجارتی ٹھیکوں، دستاویزوں اور سرکاری احکام وغیرہ کے متعدد کاغذات سنسکرت کے ان حروف میں ملتے ہیں جو قدیم راجگان ہنود کے آخری دنوں

میں اہلکاروں کی خط وکتابت میں پائے جاتے ہیں۔جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری وغیرسرکاری حساب کتاب اورلین دین میں کوڑیاں بھی مستعمل رہیں اورتانبہ کا سکہ بھی۔

سکوں کا وزن

البتہ سوائے تورمان سکہ کے جس کا وزن ایک سودس گرین تھا باقی تمام راجگان کشمیر کے سکوں کا وزن قریباً ۹۱ گرین تھا۔ایک مرتبہ جب کشمیر کی سیاسی حالت نہایت اضطراب افزا تھی۔تو کلہن کی راج ترنگنی اور بعد کی تاریخوں سے پایا جاتا ہے کہ راجہ ہرش (۶) نے چاروں طرف سے مایوس ہوکر دیوتاؤں کی مورتیوں کو جو سب تانبہ کی تھیں اور جن کی کشمیر میں بہتات تھی۔توڑوا کر گلا ڈالا تھا۔اس زمانہ میں سکہ کا وزن مالی مجبوریوں کی وجہ سے ضرور نسبتہ کم رکھا گیا ہوگا۔

یہ تمام سکہ جات صرف دارالحکومت سرینگر میں ڈھالے جاتے تھے۔اس کے سوا کسی اور مقام پر ٹکسال نہ تھی۔ ہندوؤں کے عہد میں بھی اور مسلمانوں کے زمانے میں بھی کشمیر میں سب سے چھوٹا سکہ ۲۵ دینار کا تھا اور تانبہ (۷) کا تھا۔اس سے کم وزن کا کوئی سکہ کشمیر میں (سوائے کوڑیوں کے) استعمال نہیں ہوا۔

سکہ کا تعلق لباس سے

پانچویں چھٹی صدی عیوسی کے کچھ قدیم کشمیری سکے دستیاب ہوئے ہیں جن

سے اس زمانے کے قدیم لباس پر روشنی پڑتی ہے۔ سکوں کے ایک طرف راجہ کی تصویر ہے جس میں راجہ کھڑا ہے اور اس نے چھوٹا سا پاجامہ پہنا ہوا ہے۔ جو تبدریج ایک بہت بڑے دھگلے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سکے کے دوسری طرف ایک بیٹھی ہوئی دیوی کی مورت ہے اور دونوں طرف سنسکرت یا سنسکرت نما زبان میں کچھ حرورف بھی درج ہیں۔

کشمیر کے اسلامی سکوں کی عبارتیں

کنہنگم کی تاریخ کے حوالہ سے مصنف ''اسلامک کلچر ان کشمیر'' لکھتے ہیں۔ کشمیر کے مروجہ سکوں کی قیمت مسلمانوں کی ابتدائی دور حکومت تک قریباً یکساں اور گیر مبدل رہی ہے۔ البتہ جوں جوں مسلمان بادشاہوں کے پاؤں مضبوط ہوتے گئے اور ان کا دائرہ حکومت وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ان سکوں میں بھی بتدریج ترقی اور اصلاح ہوتی گئی۔ چنانچہ اسلامی عہد حکومت میں ان سکون کی کیفیت اس طرح تھی۔ (۱) بعض سکوں پر سنہ دو طریقوں یعنی حرف واعداد میں لکھا جاتا تھا۔ بعض پر سرف حروف ہی تھے (۲) بعض سکوں پر سنہ عربی حروف میں تھے۔ بعض پر فارسی میں (۳) سکہ جات ہر اسلامی عہد کے قریباً یکساں ہیں۔ ان میں بہت کم فرق ہے اُن کی شکل بالکل مربع ہے۔ اور ان کی پشت پر ''ضرب کشمیر'' درج ہے۔ بعض سکہ جات پر نائب خلیفہ الرحمٰن بعض پر نائب امیر المومنین بطور شاہی خطاب استعمال کیا گیا ہے۔ بعض سکوں پر منیر الدین اور نصیر الدین کے اعزازی خطابات بھی مشاہدہ میں آئے۔ بعض

سکوں پر دارالضرب یعنی سرینگر کو خطہ اور بعض پر شہر لکھا ہوا دیکھا گیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشمیر کا سب سے پہلا بادشاہ زین العابدین ہے۔ جس نے تانبہ کے علاوہ طلائی ونقری سکوں کا وزن ۹۱ سے ۹۶ گرین اور پیتل کے سکون کا وزن اوسطاً ۸۴ گرین مقرر کیا۔ کشمیر کے سرکاری عجائب خانے میں مغل شہنشاہوں، سلاطین کشمیر اور افغان فرمانرواؤں کے عہد کے کشمیری سکہ جات کا ایک ذخیرہ ہے۔ اکبر کے عہد میں طلائی ونقرئی سکوں نے خوشنما صورت اختیار کر لی تھی اور یہ سب سکے کشمیر (سرینگر) ہی میں تیار کئے جاتے تھے۔ عہد جہانگیر کے سکہ جات مغلیہ عہد کے جملہ سکوں سے زیادہ خوبصورت ہیں اور ان میں بعض تو مصوری اور صنعت گری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

بڈشاہی سکوں کی قیمت عہد اکبری میں

ذیل میں ایک جدول درج کیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ جو سکے زین العابدین سے پہلے، زین العابدین کے عہد اور اس کے بعد کے زمانے میں جاری رہے۔ ان کی قیمت ابوالفضل کی تحریر کے مطابق اکبر کے عہد میں کیا تھی۔ یہ سکے راجگان قدیم کے سکوں کے نمونہ پر ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہندو راجگان کے سکوں پر راجگان کی تصویریں یا دیوی دیوتاؤں کی تصاویر ہوتی تھیں اور حروف سنسکرت یا سنسکرت نما ہوتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں کے سکے عربی اور فارسی حروف میں ہوتے تھے اور تصویروں کی بجائے ''ضرب کشمیر'' یا بادشاہ کا نام اور سن درج ہوتا تھا۔

جدول حسب ذیل ہے۔

جدول

نام کشمیری سکہ	دیناروں کی تعداد مالی قیمت کے اعتبار سے	عہد اکبری میں ان کی قیمت
دوادوش (باہ گنی)	۱۲	۱۱/۱۱دام یا ۳۲۰/ارو پیہ
پنج وتشتک (پونتشو)	۲۵	۴/ادام یا ۱۶۰/ارو پیہ
ہتھہ	۱۰۰	ایک دام یا ۴۰/ارو پیہ
سسر (ساس)	۱۰۰۰	دس دام یا ۴/ارو پیہ
لکش (لاکھ)	۱۰۰۰۰۰	۲۵ روپیہ
کوٹی (کروڑ)	۱۰۰۰۰۰۰۰	۲۵۰۰ روپیہ

ان کے علاوہ کوڑیوں کا سکہ حسب ذیل تھا

کوڑی کی یا ک باہ گنی یا ایک دوادوش۔ ۱۶ کوڑی یا دو باہ گنی یا دو دوادوش کا ایک پونتشو یا ۲۵ دینار یا ایک پنج وتشتک۔

ابوالفضل نے بعض اور قیمتوں کا بھی ذکر کیا ہے مگر ان میں کشمیری سکوں کا نام نہیں لکھا ہے۔ دیناروں کی تعداد کے ساتھ عہد اکبری کی قیمت لکھدی ہے مثلاً۔

دیناروں کی تعداد	عہد اکبری میں اس کی قیمت
۵۰۰	۵ دام یا ۱/۸ روپیہ
۲۰۰	۲۰ دام یا ۱/۲ روپیہ
۲۵۰۰	۲۵ دام یا ۲۵/۴۰ روپیہ
۱۲۵۰۰	دام یا ۳،۱/۸ روپیہ

سلطان زین العابدین کا جدید سکہ

سلطان سکندر اور علی شاہ کے زمانے میں جو چاندی اور سونا مندروں اور مورتیوں کو غارت کر کے جمع کیا جاتا تھا۔ اسے ٹکسالوں میں مضروب کیا جاتا تھا۔(۹) چونکہ یہ سکہ کم درجہ کا ہوتا تھا۔ اس لئے رائج الوقت سکوں کی کساد بازاری ہوگئی تھی۔

مورتیوں اور مندروں کا سونا ہلکی قسم کا تھا۔ یہ ایسا ہی سونا تھا جیسا اس زمانہ میں شادی بیاہ میں صرف ہوتا تھا۔ لڑکے والا لڑکی کو ۵ تولہ سونا یا اتنے وزن کے طلائی زیورات دیتا تھا اور لڑکی والا اپنی لڑکی کو صرف ایک تولہ سونا دیا کرتا تھا۔ یہ رواج بڈشاہ سے پہلے بھی چلا آتا تھا۔ اس قسم کے سونے کو "کوری سن" کہتے تھے اور اب بھی کہیں کہیں اس کا نام سُنا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سونا ہلکی قسم کا ہے۔ جو لڑکی کے جہیز میں دیا جاتا ہے۔

سلطان ان نقائص کو دور کرنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اسے ملک کی ترقی اور معدنیات کی تلاش کا بے حد شوق تھا۔ آخر اس نے اپنی تگ ودو اور کوہ نوردی

سے مس کی ایک کان (۱۰) تلاش کی۔ پرانے سکے موقوف کر کے خالص دھات کا نیا سکہ جاری کیا اور پرانی ضرب کو موقوف کر دیا۔

بڈشاہی عہد میں سونا اور دیگر معدنیات

راجہ جیاپیڈ کو تانبہ کی جو کان علاقہ کامراج کے پہاڑ سے ملی تھی اس کا ذکر بڈشاہی عہد کے مورخ جونراج نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ راجہ جیاپیڈ کو تو فقط تانبہ کی کان ملی تھی۔ لیکن اس بادشاہ کے عہد میں زمینیں خود بخود سونا اگلنے لگیں۔ مثلاً جواہرات اور عقیق وغیرہ جو دیگر مقامات پر بمشکل ملتے ہیں۔ اس بادشاہ کو دستیاب ہوا کرتے تھے۔ ان جواہرات کا نام بھی اسی کے نام پر جینا ماتی (زین ماتی) مشہور رہے۔

اسی بادشاہ کے عہد میں دریاؤں کی ریت سے سونا نکلنا شروع ہوا اور چونکہ اکثر لوگوں نے یہی کاروبار شروع کر دیا۔ اس لئے بادشاہ نے تانبہ کی ایک سلیٹ پر اپنا یہ حکم کندہ کرایا کہ جو سونا اس طریق سے دریا سے نکالا جائے گا۔ اس کا چھاٹا حصہ سرکاری خزانے میں داخل ہوا کریگا۔

کامراج کی پہاڑی سے جو باباشکورالدینؒ کی زیارت سے لیکر نالہ پُہر واور دریائے کیمل کے کنارے کنارے لولاب تک چلی گئی ہے۔ بادشاہ کو لوہے اور تانبہ کی کانیں بھی ملیں۔ ان کے علاوہ لداخ کے دریاؤں سے بھی اس کے عہد میں سونا نکلتا رہا ہے۔

طبقات اکبری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی جس قدر کانیں اس کو

دستیاب ہوتی تھیں۔ وہ خزانہ شاہی کے لئے وقف کر دی جاتی تھیں۔ لیکن ان کے علاوہ بادشاہ اپنی پرائیویٹ جاگیر بھی رکھتا تھا۔ جس کی آمدنی اس کی ذات خاص کے لئے وقف ہوتی تھی۔ چنانچہ مس خالص کی ایک کان اس کی ذاتی ملکیت میں تھی۔ لیکن جب ملک میں ایک دفعہ زر کی کساد بازاری ہوگئی۔ تو اس نے اپنی ذاتی کان کو بھی شاہی سکہ کے لئے دارالضرب کے حوالہ کر دیا اور اس کے طویل عہد میں دیر تک اس پر عمل ہوتا رہا۔

علاقہ زنگیر میں ہر دو شیوہ اور تجر کے دیہات لوہے کی کان کے لئے بہت مشہور ہیں۔ کسی زمانہ میں ان دیہات کی پتھریلی زمینوں سے لوہا نکلتا رہا ہے۔ بلکہ تجر کے متعلق تو مشہور ہے کہ بڈشاہ کے زمانہ میں وہاں سے سونا بھی دستیاب ہوا کرتا تھا۔ لیکن لوہے کے آثار تو اب بھی ان مقامات میں نظر آتے رہتے ہیں اور بسا اوقات راقم مؤلف نے خود بھی دیکھے ہیں۔ (۱۱)

بڈشاہی دارالضرب

صراف کدل کے پاس جو بڈشاہ ہی کا تعمیر کردہ ہے ایک محلّہ ہے۔ اس کو ٹنکی صرائے بھی کہتے ہیں۔ اور مہاراج گنج اسی محلے کے قرب و جوار میں ہے۔ اس ٹنکی سرائے میں بڈشاہ کی دارالضرب (۱۲) تھی بلکہ دارالضرب ہی کی وجہ سے اس مقام کو ٹنکی سرائے کہتے ہیں۔ یعنی ایسی سرائے جہاں ٹکے بنتے ہیں۔ چونکہ صراف لوگ یہاں زر و نقرہ فروخت کرنے کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس پل کا نام بھی

صراف کدل ہو گیا۔

بڈ شاہی سکہ کی شکل وصورت

خالص چاندی کا بڈ شاہی سکہ مربع شکل کا ہے۔اس کے ایک طرف خط عربی میں ''السلطان بن سلطان زین العابدین'' درج ہے اور پشت پر ''ضرب خطہ کشمیر'' کی عبارت مکتوب (۱۳) ہے۔ایک تانبہ کا چھوٹا سا سکہ بھی نظر سے گزرا ہے۔جس کے ایک طرف ''سلطان زین العابدین'' اور دوسری طرف ''امیر المومنین ۸۵۱ھ'' درج ہے۔اس کے علاوہ سرینگر کشمیر کی ہینڈ بک آف آرکیولوجیکل میں بڈ شاہ کے ایک چاندی اور ایک سونے کے سکے کی کچھ کیفیت درج ہے۔چنانچہ چاندی کے سکہ پر ایک طرف ''السلطان الاعظم زین العابدین'' اور دوسری طرف ''ضرب کشمیر فی شہود سنہ اثنی واربعین ثمانمایۃ'' کے الفاظ درج ہیں۔یہ سکہ سنہ اثنیٰ واربعین کے مطابق ۸۴۲ھ میں جاری کیا گیا تھا۔دوسرا سکہ تانبہ کا ہے۔اس کے ایک طرف ''السلطان الاعظم زین العابدین'' اور دوسری طرف ''ضرب کشمیر فی شہود سنہ احد'' درج ہے۔سنہ احد سے صرف اتنا معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ سکہ سنہ ایک یا ۱۱ یا ۲۱ یا ۳۱ یا ۴۱ وغیرہ میں رائج ہوا۔لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ یہ ہجری یا کشمیری یا لوکک سنہ تھا یا کون سا تھا؟

بڈ شاہی اوزان اور پیمانے

سلطان نے دیکھا کہ اس کی مملکت میں گز، جریب اور پیمانے اور اوزان

پوری مقدار کے نہیں ہوتے۔ گزوں اور پیمانوں کی کمی سے زمیندار خسارہ میں رہتے ہیں۔اس نے زمینداروں کی پاس خاطر سے جن کی ہمدردی سے اس کا دل ہمیشہ لبریز رہتا تھا۔اور جن کو وہ اصلی معنوں میں ملک کی ریڑھ کی ہڈی تصور کرتا تھا۔ جریب کو مروجہ جریب سے زیادہ بڑھا دیا۔ گز اور پیمانے اور اوزان پوری مقدار کے رائج کئے۔ آئین اکبری میں بڈشاہی عہد اور مابعد کے پیمانوں اور اوزان کی مندرجہ ذیل کیفیت درج ہے۔

ایک تولہ ۱۶ ماشہ یا ۹۶ رتی (ایک ماشہ چھ رتی کے مساوی) اوزان حسب ذیل تھے:۔

۲/۱، ۷ پال= ایک سیر۔۲ سیر = ۲/۱ من۔۴ سیر = برابر ایک ترکھ اور ۱۶ ترکھ برابر ایک خروار۔

خروار اس کا نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ وزن گدھے کے بوجھ کے برابر ہے اور گھوڑے کا بوجھ ۲۲ ترکھ قرار دیا گیا ہے۔قریباً یہی اوزان اور پیمانے اکبر کے زمانے میں بھی رائج تھے۔موجودہ زمانے میں ایک ترکھ پانچ سیر ۳ چھٹانک کے برابر اور ایک خروار دو من ۵ سیر ۳ چھٹانک کے مساوی ہے اور من چالیس سیر کا ہے۔

حواشی:

۱) آج سے دوسو سال پیشتر (۱۱۴۸ھ) کے مورخ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کاشمیری نے اپنی تاریخ اعظمی میں کوڑیوں کے سکے کے رواج کا ذکر کیا ہے اور یہ تو بہت دور کی بات ہے۔اب سے چندسال پیشتر راقم الحروف نے پنجاب اور کشمیر میں کوڑیوں کے سکہ کا رواج دیکھا ہے۔ایک پیسے کا سولہ گنڈے ہوتے تھے اور ہر گنڈے میں چار کوڑیاں ہوتی تھیں۔

۲) راج ترنگنی حصہ اوّل صفحہ ۶۱۰۔

۳) ضمیمہ نوٹ جلد دوم صفحہ ۱۳۰ راج ترنگنی۔

۴) عہد حکومت ۷۶۸ء لغایت ۷۹۷ء۔

۵) بقول ابوالفضل ایک ہزار دینار ایک اساس یا ۴/۱ روپے یا دس دام کے برابر ہے۔ ایک کروڑ دینار کی قیمت ۲/۱، ۲ ہزار روپے، دس کروڑ کی پچیس ہزار اور سو کروڑ دینار کی قیمت ۲/۱، ۲ لاکھ روپے کے برابر ہوتی ہے۔

۶) عہد حکومت ۱۰۸۹ء لغایت ۱۱۰۱ء۔

۷) شریور کی راج ترنگنی کے ترنگ ۳ شلوک ۲۱۴ میں ۵ وتشتکا یا ۲۵ کے سکہ کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے وہ ایک تانبہ کا سکہ تھا۔ جسے حسن شاہ (۱۴۷۲ء لغایت ۱۴۸۴ء) نے مالی مشکلات کے باعث کھوٹ ملا کر رائج کیا۔از ضمیمہ نوٹ ہائے راج ترنگنی صفحہ ۱۱۰۔

۸) مورتیوں کو توڑ کر سکے مضروب کرنے کا رواج بعض ہندو راجاؤں کے عہد میں بھی ملتا ہے۔

۹) وجیز التواریخ غیر مطبوعہ مصنفہ ملا عبدالغنی کاشمیری سال تصنیف ۱۲۷۴ھ۔

۱۰) ہر دو شیوہ کے لوہے کے متعلق مفصل کیفیت کے لئے دیکھو تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم مصنفہ راقم۔

۱۱) از احسن التواریخ غیر مطبوعہ مصنفہ مولوی عزیز الدین قاضی کشمیر مرحوم۔

۱۲) از احسن التواریخ غیر مطبوعہ مصنفہ مولوی عزیز الدین قاضی کشمیر مرحوم۔

بیسواں باب

بڈشاہ اور ہندو

کشمیر کے قدیم مذاہب

کشمیر میں ہندوستان کی طرح زمانہ قدیم میں ہندو مذہب ہی تھا۔ اور اس کے چار فرقے تھے۔ برہمن، کھتری، ودیش، شودر۔ لیکن مذہباً ان کے عقائد میں بہت اختلافات تھے۔ کوئی ناگ پرست تھا، کوئی آفتاب پرست، کوئی آتش پرست، کوئی دیوتا پرست۔ بہت تھوڑے لوگ تھے جو خداشناس اور خداپرست تھے۔ جب کشمیر کے راجہ اشوک نے سنہ ۲۰۸ بکرمی یا کم وبیش میں بدھ مذہب اختیار کرلیا۔ تو قدیم مذہب والوں نے اس کی بہت مخالفت کی۔ مگر راجہ کے مقابلہ میں کسی کی کوئی پیش نہ چلی۔

اشوک کے بعد کئی راجے اس مذہب کی پابند رہے اور انہوں نے بہ جبر و اکراہ یا بہ صلح وصفائی بدھ مذہب کو تمام کشمیر میں رائج کردیا۔

آخر ایک وقت آیا کہ ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی مذہب بدھ کو زوال شروع ہوا۔ راجہ چندرا جو شیو مذہب کا پیرو تھا۔ بدھ مذہب کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اس نے بدھ مذہب کا استیصال کر کے اپنے مذہب کو بڑا فروغ دیا۔ جب شنکراچارج کشمیر میں آیا۔ تو اس نے شیو مذہب کو اور بھی زیادہ ترقی دی۔

ذوالچو کا المناک واقعہ

کشمیر مذہبی اختلافات بلکہ فسادات اور ملک کے اندرونی فتنوں میں مصروف تھا۔ کہ دفعتاً ایک وبائے عظیم نے اس میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یعنی ذالقدر خان عرف ذوالچو بہتر ہزار سوار جرار لیکر بے خبر کشمیریوں پر جو خانہ جنگیوں کے انجام سے غافل ہو کر باہمی کشت وخون میں مصروف تھے۔ حملہ آوار ہو گیا۔ جو ملک اور جو قوم نفاق وفساد کا شکار رہی ہو باوجود کثرت جمعیت کے اس کی کیا طاقت ہے کہ کسی بیرونی دشمن کا خواہ وہ قلیل سے قلیل فوج بھی کیوں نہ رکھتا ہو مقابلہ کر سکے۔

اس موقعہ پر ابراہیم لودی اور بابر بادشاہ کی لڑائی پر غور کرو۔ ابراہیم کے پاس کئی سومست اور جنگی ہاتھوں کے علاوہ ایک لاکھ فوج تھی۔ لیکن امراء چونکہ آپس میں پھٹے ہوئے تھے اور بادشاہ کے اقربا وخویش اس سے ناراض تھے۔ اس لئے بابر نے صدہا میل دور ایک غیر ملک سے آکر بارہ ہزار فوج کے ساتھ سارے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ غرض ذوالقدر خاں نے جس کو کشمیری ذوالچو (ا) کہتے ہیں ملک میں قتل عام مچا دیا۔ انسان کیا مال مویشی ناپیدہ ہو گئے۔ ملک جو جنت نظیر کہلاتا تھا۔ دوزخ سے بدتر ہو گیا۔ ذوالچو چھ ماہ تک کشمیر میں رہا اور اس وقت کشمیر سے باہر نکلا۔ جب سارے ملک کو بے چراغ کر گیا۔ کہتے ہیں کہ وہ گھوڑی (مظفر آباد) کے رستے واپس گیا اور مضافات ونواحات سے ہارہا کشمیری اور پہاڑی قید کر کے ہمراہ لے گیا۔ مگھر اور پوہ کا مہینہ تھا۔ جب بالائے کوہ پہنچا تو اس قدر برف پڑی کہ قیدیوں اور قید کرنے والوں میں سے ایک متنفس بھی نہ بچ سکا۔

حملہ ذوالچو کے نتائج

ذوالچو کے بعد کشمیر میں دیر تک بے اطمینانی کی حالت رہی۔ لوگ ذوالچو کو خواب میں دیکھتے تھے اور چونک اُٹھتے تھے۔ جس طرح ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کیا تھا اور شیخ سعدی نے زوال خلافت بغداد پر ایک غمناک اور خون رلا دینے والا مرثیہ لکھا تھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

آسمان راحق بود گرخوں بہ بارو بر زمین
برزوال ملک مستعصم امیر المومنین

یہی حال ذوالچو نے کشمیر کا کیا۔ لیکن افسوس اس بدنصیب ملک کی اس ذلت وخستہ حالی پر کسی نے خون کے آنسو تو کیا حسرت وافسوس کے دو قطرات اشک بھی نہ بہائے۔

کثرت حوادث اور انتظام حکومت کی خرابیوں اور انقلاب عظیم کی وجہ سے کشمیر کا اب کوئی خاص مذہب نہ تھا۔ یہاں رینچن شاہ نے کشمیر کے تخت وتاج پر قابض ہوکر ۱۳۲۵ء میں مذہب اسلام قبول کرلیا۔

بہت سے ہندو مشائخ کبار کے حسن خلق اور تعلیم اسلام کے تاثرات سے مسلمان ہوگئے۔ کئی ایسے تھے جن کو مصالح ملکی نے تبدیل مذہب پر مجبور کیا۔ ایک کافی تعداد ایسی تھی جو سلطان سکندر بُت شکن کے وزیر ملک سیف الدین عرف سیہہ بٹ کے جوش مذہبی کی بدولت دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو تشدد سکندری کی تاب نہ لا سکے اور ہجرت اور ترک وطن پر مجبور ہوکر کشمیر سے باہر چلے

گئے۔

سلطان بُت شکن کے بعد علی شاہ اس کا بڑا بیٹا تخت پر بیٹھا اور چونکہ اس زمانہ میں بھی ملک سیف الدین مدار الہام اور مختار کل تھا۔ اس لئے ہندوؤں کی بے اطمینانی وبیقراری کی جوصوت سلطان بت شکن کے زمانے میں تھی اس میں اس کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہ ہوسکی۔

بڈشاہ کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ

جب تخت کشمیر نے زین العابدین کے پاؤں چومے اور تاج شاہی نے اس کے سر پر آکر فخر محسوس کیا۔ تو کشمیر کے ہندوؤں کی بے اطمینانی، مضطرب الحالی اور شکستہ دلی کے احساس کے باوجود بادشاہ کچھ عرصہ تک سرکشوں اور سلطنت کے مخالفوں کے استیصال میں مصروف رہا۔ اسے ذرا اطمینان حاصل ہوا تو اس نے صحیح تعلیم اسلام پر کاربند ہوکر ملک کے غیر مسلم گروہ کی جس کی تعداد کشمیر میں غالباً اس وقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ تالیف قلوب کرنا زندگی کا خاص مقصد قرار دیا۔

جسم پر حکومت کرنے کی بجائے وہ دلوں پر حکومت کرنے کو ترجیح دیتا تھا اور اس کے طرز عمل نے ثابت کردیا کہ وہ اپنے قول اور عہد اور اپنی زبان پر سختی سے پابند رہتا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ جو سلوک بڈشاہ نے کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ہندو راجہ کسی ہندو کے ساتھ نہیں کرسکا۔ انہی مراعات کی وجہ سے بڈشاہ بٹ شاہ کے نام سے بھی مشہور ہوگیا ۔

بڑھ کے ہوگا اس سے کیا ہر دلعزیزی کا ثبوت

بن گیا بڈشاہ سے بٹ شاہ زین العابدین

بڈ شاہ نے اپنے طویل عہد حکومت میں ہندوؤں کو جس طرح نوازا اور مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کی جو حوصلہ افزائی کی اوران کے مقدس مقامات اورقدیم عمارات کے ساتھ جس انصاف ومساوات کا سلوک کیا اورقابل ہندو علماء ادبا کی جو سرپرستی کی اس سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ بادشاہ اپنے باپ اور بھائی کے خلاف حکمت وتدبر سے بھرا ہوا ایک عجیب دل ودماغ لیکرآیا تھا۔اس کی نظر میں مسلمان اس لئے قابل وقعت نہ تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندو اس لئے قابل نفرت نہ تھا کہ وہ ہندو ہے۔ بلکہ وہ ہر شخص سے کسی نہ کسی کمال کا متلاشی تھا۔ چنانچہ مسلمان مشائخ کی طرح اسے ان ہندو جوگیوں سے بھی جن کے پہلو میں حقائق ومعارف سے لبریز دل ہوتا تھا۔ برابرعقیدت وارادت تھی۔

جب ہم دربار بڈشاہی کے ارکان وشعرا پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں ہندوؤں کی ایک کافی تعداد نظر آتی ہے۔(۲)

مختلف تاریخوں کے مطالعہ سے بڈشاہ کی ہندونوازیوں کی جو کیفیت معلوم ہوسکی ہے۔اس کی بیسویں صدی کے نفاق پرور واتحاد شکن دور میں ذرا وضاحت سے قلمبند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مہاجر کشمیری پنڈتوں کی واپسی

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے۔ سلطان سکندر بت شکن کے نومسلم وزیر ملک

سیف الدین بٹ کے تشدد کی وجہ سے ہنود کی ایک کثیر تعداد کشمیر سے باہر چلی گئی تھی۔ یہ لوگ دہلی، لکھنو بنارس، دکن، الہ آباد اور ہندوستان کے دیگر مقامات میں جا کر آباد ہو گئے۔ جب بڈشاہ کا زمانہ آیا اور اس نے سلطنت کے فوجی انتظامات اور دشمنان سلطنت کو محکوم و مغلوب کرنے کے بعد ملک کی آبادی کی طرف توجہ کی۔ تو اس نے مہاجر لوگوں کو واپس بلوانے کے لئے ایک اشتہار عام جاری کیا۔ ان کو بہت سی مراعات کی توقع دلائی۔ ان سے انصاف وعدل کا وعدہ کیا۔ ان کی زمینیں اور جائیدادیں بعد ثبوت کامل ان کو واپس دلانے کی خوش خبری سنائی۔

چنانچہ کئی ہزار کشمیری ہندو جنہوں نے کئی سال سے ہندوستان کو اپنا وطن بنا رکھا تھا۔ حب وطن اور جدید بادشاہ کے اعلان مراعات کی وجہ سے پھر کشمیر چلے آئے۔ بادشاہ نے بھی ان کے ساتھ مراحمت خسروانہ سے کام لیا۔ جو جاگیر دار تھے، ان کی جاگیریں واپس کیں اور جو اپنی جائیداوں کا ثبوت دے سکے، ان کی جائیدادیں ان کو واپس دلائیں۔ جن کا ثبوت نہ مل سکا، ان کو مکانات وغیرہ کے لئے زمینیں عطا کیں۔

پنڈتوں کی واپسی کے متعلق ایک ہندو مورخ (۳) لکھتا ہے۔ ''رسومات ظلم از ولایت کشمیر براندوختہ وطبقہ برہمناں راکہ بہ مسعایت سیہہ بٹ نامی کہ در عہد سلطان سکندر جدائی وطن اختیار کردہ بودند باز آوردہ در معابد ومقامات خود را اقرار گرفتہ وظائف مستمر آں مقرر گزاشت۔''

معترضین کے نزدیک بڈشاہ کا گناہ

کشمیر کے بعض مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ بڈشاہ میں سب خوبیاں

تھیں۔لیکن بڑا عیب یہ تھا کہ اس نے اسلام کی اشاعت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ جو ہندو اس کے باپ کے زمانہ میں ترک وطن کر کے ہندوستان کے دیگر مقامات میں چلے گئے تھے۔ ان کو بھی اس نے واپس بلا لیا اور ان پر شاہانہ مراعات کی نوازشیں کیں۔ یہ اعتراض جن لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے وہ قوانین سلطنت اور فرائض الملوک سے قطعی بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔ بادشاہ خدا کی مخلوق کا خدا کی طرف سے نگہبان ہوتا ہے۔ رعایا کی جان و مال کی حفاظت، اس کی عزت و آبرو کی نگہداشت اور اس کے حقوق و مذہب کی نگہداری اور آئین عدل و انصاف کی عمل پیرائی اس کا فرض اولین ہوتا ہے۔

جو لوگ ہزار ہا کی تعداد میں اس کے وطن سے باہر چلے گئے تھے۔ وہ باہر جا کر مصائب و تکالیف میں زندگی کے دن گزارنے کے علاوہ شاہان کشمیر کی بدنامی کا باعث ہوتے تھے اور جہاں جاتے تھے بڈشاہ کے باپ سلطان سکندر کے مذہبی ظلم و تشدد کے افسانے بیان کر کے اس کو اور مسلمانوں کو بدنام کرتے تھے۔

اس زمانہ میں ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی ۔ اگر ہندوؤں کی حکومت ہوتی تو یہ جلا وطن کشمیری ان کو حملہ کشمیر کی دعوت دیتے اور وہ ہندو راجے اپنے مذہب کی توہین اور اپنے ہم مذہبوں کی ذلت دیکھ کر کشمیر کی اسلامی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے۔ کیا جبار خان اور عظیم خان کے زمانہ میں جب کشمیر میں افغانوں کی حکومت تھی۔ کشمیری پنڈتوں کے ایک جلیل القدر خاندان پر تباہی نہیں آئی اور کیا اس خاندان کے افراد نے پنجاب جا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو حملہ کشمیر کی دعوت نہیں دی اور کیا اس کشمیری پنڈت خاندان کی ذلت و رسوائی مہاراجہ کے لئے ایک بہانہ نہ بن گئی۔ اور

کیا اس نے طیش میں آ کر ۱۸۱۹ء میں کشمیر کی آخری اسلامی حکومت کا خاتمہ نہیں کر دیا۔ پھر اس سے اور پیچھے شہنشاہ اکبر کے زمانے تک چلے جاؤ۔ جب کشمیر میں چک بادشاہوں کا طوطی بول رہا تھا اور سنیوں اور شیعوں کے فسادات نے ملک کو ایک عظیم مصیبت میں مبتلا کر کے بڑے بڑے جلیل القدر سنی خاندانوں کے قتل و غارت کے واقعات نے ایک جماعت کثیر کو لاہور میں اکبر بادشاہ کے پاس حملہ کشمیر کے داعی بنا کر بھیجنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیا اکبر کی فوجوں نے ۹۹۸ھ میں کشمیر پر آخری حملہ کر کے کشمیر کی آزاد حکومت کو بالکل نہیں مٹا دیا تھا۔ اس قسم کے واقعات پر غور کرو اور پھر بتاؤ۔ اگر بادشاہ کشمیر مسلمانوں کے علاوہ اپنے ملک کے غیر مسلم فرقہ کی دلداری و دلدہی کرتا ہے تو کیا بُرا کرتا ہے اور کیا آئین ملک داری اس قسم کے عدل کی تعلیم نہیں دیتا۔ بادشاہ نے اگر مہاجر کشمیر پنڈتوں کو جو بیرون کشمیر مسلمان فرمانروایان کشمیر کی بدنامی اور وطن کی رسوائی کا باعث ہو رہے تھے۔ واپس بلوا لیا اور علی قدر مراتب ان کی دلدہی کی تو نہ صرف حب وطن کا حقیقی ثبوت دیا۔ بلکہ اسلام کی رواداری کی ایک روشن مثال قائم کی۔ (۴)

رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران، امیر امان اللہ خان اور نادر شاہ شاہان افغانستان نے بھی اپنے اپنے عہد میں اپنے ہم وطن بلکہ جلا وطن لوگوں کو جو ہندوستان میں مقیم تھے۔ اپنے اپنے ملکوں میں واپس آنے کی اجازت دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کے باوجود وہ اپنے مذہب کا سختی سے پابند تھا۔ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے پکا مسلمان تھا۔ لیکن جس طرح ساری دنیا کا خالق رب المسلمین نہیں بلکہ رب العالمین ہے۔ اسی طرح بڈشاہ بادشاہ ہونے کی حیثیت

سے مسلمانوں ہی کا بادشاہ نہیں تھا بلکہ وہ اپنی تمام رعایا کا بادشاہ تھا۔ جس میں مسلمان بھی تھے، پنڈت بھی تھے اور بدھ مت کے لوگ بھی تھے۔

نومسلم کشمیری پنڈتوں کی شدھی

سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے خوف یا طمع کی وجہ سے مذہب اسلام قبول کرلیا تھا۔ بڈشاہ نے جب مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور مشتہر کیا کہ اسلام لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین کی تعلیم دیتا اور مذہب کے معاملے میں جبر وتشدد سے منع کرتا ہے۔ تو کئی پنڈت جو سابقہ سلاطین کے عہد میں ملک سیف الدین کے جبر سے بہ اکراہ مسلمان ہو گئے تھے۔ پھر اپنے سابقہ دین میں آگئے۔ ان کی برادری نے بھی ان کو شامل کرنے سے انکار نہ کیا اور کسی قاضی اور مفتی کو بھی جرأت نہ ہوسکی کہ ان سے ارتداد کا مواخذہ کرتا (۵)۔ اور ایک ہندو مورخ لکھتا ہے۔ ''علماؤ فضلا رامجال آں نہ بُود بر برہمنانے کہ در حکمرانی سلطان سکندر از درجہ خود افتادہ بودند۔ زباں تعرض کشائنید''۔ صاحب طبقات اکبری بھی بڈشاہ کے حالات میں لکھتے ہیں'' وبرہمنانے کہ در عہد سلطان سکندر مسلمان شدہ بودند بمرتد گشتند وعلماء رامجال منع وگرخت برایشاں نبود۔ القصہ ہرکس بہ ہر وضع وہر مذہب کہ مے خواست مے بود۔''

کرنل سر ولزلی ہیگ (۶) نے بھی بڈشاہ کے زمانہ میں نومسلم کشمیری پنڈتوں

کی شدہی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ عہد سکندری میں کشمیر کے جو ہندو خطۂ کشمیر سے باہر چلے گئے تھے۔ بادشاہ نے ان کو بھی واپس بلوایا اور بہت سے ہندو جو بحالت مجبوری جان بچانے کے لئے اسلام قبول کر چکے تھے۔ پھر اپنے مذہب میں بادشاہ کے حکم سے واپس آ گئے۔

جزیہ کی موقوفی

جونراج اپنی راج ترنگنی میں اس جزیہ کا ذکر کرتا ہے۔ جو کشمیر کے مسلمان بادشاہ کشمیر کے ہندوؤں سے وصول کیا کرتے تھے۔ کشمیر کے ابتدائی مسلمان سلاطین کے زمانہ میں اس ٹیکس کی مقدار دو پل چاندی سالانہ تھی۔ سیٹن صاحب لکھتے ہیں۔ چونکہ یہ وزن آٹھ تولہ کے برابر ہے۔ اس لئے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اس زمانہ کے لوگ اس سختی کو بجا طور پر محسوس کرتے تھے۔ پُل چار کرش کا ہوتا ہے اور ایک کرش ۱۶ ماشہ کا ہوتا ہے۔ اس لئے ایک پل ۴ تو لک (تولہ) کے برابر سمجھنا چاہئے۔ اب تک کشمیر میں سیر کے ۴/ا حصہ کے لئے پل ہی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس ترنگنی میں جونراج نے لکھا ہے کہ بڈشاہ نے گھٹا کر اسے ایک ماشہ سالانہ کر دیا تھا اور اس رعایت اور نوازش کے لئے جونراج نے بادشاہ کی بہت تعریف کی ہے۔ بہرحال جزیہ کم تھا یا زیادہ اور اسلامی نکتہ نگاہ سے جائز تھا۔ یا ہندوؤں کے خیال میں ناجائز! اس کی سختی ہندو عام طور پر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے ہندوؤں کے خیالات اور انکے عرضداشتوں سے متاثر ہو کر جزیہ کو اتنا کم کر دیا کہ وہ بہت تھوڑا بلکہ برائے نام رہ گیا (۷) اور

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جو تھوڑا بہت بھی تھا وہ بھی موقوف کر دیا۔ (۸)

ایک محبّ وطن کشمیری پنڈت

جزیہ کی موقوفی کے متعلق ذیل کا واقعہ دلچسپی سے مطالعہ کیا جائے گا۔ جس کا ذکر جونراج نے زینہ ترنگنی میں کیا ہے۔ ایک دفعہ بادشاہ کی کہنی پر ایک سخت زہریلا پھوڑا نکلا۔ شریور لکھتا ہے۔ ملیچھوں کے ظلم سے شرفا اور اہل ہنر لوگ ملک سے باہر چلے گئے تھے اور جو موجود تھے وہ سابقہ ظلم کے خوف سے چھپ چھپا کے زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ آخر بڑی تلاش کے بعد ایک حکیم کا پتہ چلا۔ جو عمل جراحی میں صاحب کمال تھا۔ اس کا نام شیو بٹ تھا۔ جب اس کو بادشاہی آدمی بلانے کے لئے گئے۔ تو وہ خوف وہراس کی وجہ سے آنے میں پس وپیش کرتا رہا۔ اور جب آیا تو بادشاہ نے اس کے زخمی دل پر تشفی کا مرہم رکھا۔ شیو بٹ کے علاج سے اس پھوڑے میں سے کافی زہریلا مادہ نکلا۔ آخر جب بادشاہ کو صحت کامل ہوگئی اور شیو بٹ کی شہرت بھی دور دور پھیل گئی اور بادشاہ کے غسل صحت کے بعد عوام نے بھی مختلف ذرائع سے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ تو بادشاہ نے حکیم موصوف کو نقد انعام دینا چاہا۔ لیکن اس نے زرنقد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اپنے جذبات پر قابو یافتہ کوئی شخص کسی خوبصورت اور من موہنی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ البتہ یہ کہا کہ میری ذات کے لئے خداوند نعمت کی شاہانہ توجہ سے بہت کچھ ہے۔ اگر سرکار مجھے عنایت خسروانہ سے ممنون ہی فرمانا چاہتے ہیں تو میری قوم کو زر جزیہ سے بالکل ہی

معاف فرما دیا جائے۔ تا کہ ایک شیو بٹ کی جگہ اس کی ساری قوم حضور کے ازدیاد اقبال ودولت کی دعا کرتی رہے۔

شیو بٹ کے یہ الفاظ ایثار وقربانی کی زندہ نظیر تھے۔ بادشاہ کے دل پر اثر کر گئے۔اور کیون نہ کرتے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

چنانچہ بادشاہ نے شیو بٹ کی یہ درخواست منظور کی اور کشمیر کے ہندو جزیہ کے ٹیکس سے نجات حاص کر گئے۔آج ہر کشمیری پنڈت شیو بٹ کی حب الوطنی اوراس کے جذبۂ ایثار پر فخر کرتا ہے اور تاریخ اس کے نام کو سنہری حروف میں پیش کر رہی ہے۔(۹)

ہندو جوگیوں کیلئے جوگی لنگر

بادشاہ کی فیاضیوں اوراس کی ہندونوازیوں کی داستانیں گوکشور ہندوستان کی فصیل یعنی ہمالیہ سے باہر سمندر پار نہ جاسکی ہوں۔ تاہم اس میں (۱۰) اسی قسم کا واقعہ شاہجہان شہنشاہ ہند کے زمانہ میں بھی گزرا ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہجہان کی عزیز ترین بیٹی شاہزادی جہاں آرا بیگم ایک مرتبہ بیمار ہوگئی۔ یہ ۱۶۱۰ء کا ذکر ہے۔ڈاکٹر باٹن ایک انگریز زمانہ میں دارالسلطنت میں موجود تھا۔ اس کے علاج سے شہزادی کو شفاعت کلی حاصل ہوئی۔ شہنشاہ نے اس کوانعام دینا چاہا۔لیکن اس نے انعام لینے کی

بجائے یہ عرض کیا کہ میری قوم کے تاجروں کو ایک تو بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے بنگال میں کارخانہ قائم کرنے کا کمپنی کو حکم صادر فرمایا جائے۔شہنشاہ نے اس کی دونوں باتیں مان لیں۔انہیں دونوں باتوں نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کی جڑیں مضبوط کردیں۔شیوبٹ کے ایثار کا واقعہ اس واقعہ سے دوسوسال قبل کا ہے۔لیکن کشمیر کی تاریخ ہمیشہ تاریکی میں رہی اور چونکہ اس واقعہ کا تعلق انگریزی قوم کے کسی فرد یا ہندوستان کے شہنشاہ سے نہیں تھا۔ بلکہ کشمیر کے ایک بادشاہ سے تھا۔اس لئے بھی اس کو شہرت نصیب نہ ہوسکی۔ورنہ یہ ایثار بھی اپنی جگہ کوئی کم اہمیت نہیں رکھتا۔کلام نہیں کہ کشمیری پنڈتوں کے علاوہ جو کشمیر سے ہجرت کر گئے تھے اور بڈشاہ کے زمانے میں جن کی کثیر تعداد واپس آ گئی تھی۔انہی ایام میں اکثر دوسرے برہمن بھی بادشاہ کی شہرت سن کر کشمیر آ گئے۔ان میں جگن ناتھ اور کوروکشیتر کے عالموں کے علم وفضل اور ان کی صحبتوں سے بادشاہ نے بہت استفادہ کیا اور ان کے معقول مشاہرے مقرر کرکے اپنی علم نوازی اور بے تعصبی کا ثبوت دیا۔ بلکہ لکھا ہے کہ وہ ان لائق وفائق ویدانتوں اور عالم فاضل برہمنوں کی قدر مسلمان درباریوں سے بھی زیادہ کرتا تھا (۱۱)۔لیکن ہندو جوگیوں کی جن میں کشمیری سادھو بھی تھے۔ایک عظیم تعداد ایسی تھی جو توکل کے غلط معنی سمجھ کر اور ہاتھ پاؤں توڑ کر ملک اور قوم کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ثابت ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے ان کے لئے رینہ واری میں مطبخ عظیم مقرر کیا۔ جہاں سے دو وقت کا کھانا ہر ایک جوگی کو سرکار کی طرف سے مفت ملتا تھا۔اور انکے روزینے بیت المال سے مقرر کرادیئے (۱۲)۔جس مقام پر یہ مطبخ یعنی لنگر تھا۔اب وہ جگہ جوگی لنگر کے نام سے موسوم ہے۔یہ جوگی لنگر عہد بڈشاہی کا پوئر ہوس یعنی غریب گھر تھا۔

مندر شنکراچارج کی مرمت

کمراز کے علاقہ میں راجہ پرتاب پیڈ کا مندر موضع تاپور میں نرندیشور کے نام سے تھا۔ راجہ جیاپیڈ کے تین مندر (۱) چتراتھا کیشو (۲) شیشہ شائی کیشو اور (۳) امرتہ کیشو اندرکوٹ میں تھے۔ یہ سب مندر ایسی تباہ حالت میں تھے کہ از سرنو ان کا اصلی شان وشوکت میں آنا بہت محال تھا۔ بادشاہ نے ان مندروں کی بوسیدہ وکہنہ ہڈیوں یعنی ان کے پتھروں سے جو ادھر ادھر بیکار پڑے ہوئے تھے۔ ایک نہایت مفید کام لیا۔ ان سے کسی مسجد کی تعمیر نہیں کی۔ ان کو کسی محل میں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ان پتھروں سے ایک ستھو (بند) نائید کھائی سے سوپور تک بنوایا۔ اور ایک صفاپور سے سوپور تک جو رفاہ عام کے لئے وقف تھے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اس نے بعض منادر جو منہدم ہو گئے تھے، از سرنو تعمیر کرائے۔ ان میں مندر ''ازشٹی شور'' جو کوہ سلیمان یا شنکراچارج پر واقعہ ہے۔ خاص طور پر مشہور ہے۔ یہ مندر راجہ سندیمان نے ۴۸۰ ب میں تعمیر کرایا تھا۔ راجہ گوپادت اور راجہ للتادتیہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کی مرمت کرائی۔ لیکن بعد کے راجاؤں نے چنداں توجہ نہ کی۔ مندر کی حالت خراب تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سلطان سکندر کے زمانے میں زلزلہ کی ایک ہی ضرب نے اس کی چھت کے پتھروں کو شکستہ و منہدم کر دیا۔

بڈشاہ نے اپنی طویل عمر کے آخری ایام میں اس مندر کی طرف توجہ کی۔ اس کے انہدام کو پائیداری سے اور اس کی شکستگی کو پختگی سے تبدیل کیا اور چھت کو نئے سرے سے تعمیر کر کے اس کے نیچے چار سنگین ستون استوار کئے۔ چنانچہ اس کے ایک ستون پر مندرذیل دو سطریں منقوش ہیں (۱۳) سطر اوّل۔ ایں ستون برداشت خواجہ

رکم بن مرجان وسال پنجاہ (۱۴) وچہار کشمیری۔

سطر دوم: "معمار این ستون واجی ہشتی زرگر در سال پنجاہ وچہار کشمیری نیز بر دیوار شمالی لزوبان سنگین آں منقوش بود۔"

اس سال کشمیری سال ۴۵۴۱ھ تھا۔ مگر اہل کشمیر عموماً احاد لکھتے تھے اور مآت ساقط کر دیتے تھے۔ جس طرح جونراج اور شریور ۳۶ لوکک یا ۳۸ھ لوکک لکھتے آئے ہیں۔ حالانکہ ان سے مراد ۴۴۳۶ھ، لوکک و ۴۴۳۸ھ لوکک ہوتی تھی اور اس سنہ کی ابتدا آبادی کشمیر یا زمانہ کلجگ سے شمار کی گئی ہے۔ اور آج کل بھی نہ صرف کشمیر میں بلکہ ہر جگہ یہی رواج ہے۔ مثلاً آج ۱۹۴۴ء ہے لیکن تحریروں میں بالعموم ۴۴ء ہی لکھا جاتا ہے۔

مندروں کے ساتھ پاٹ شالائیں

بادشاہ نے بُت خانوں اور مندروں کی مرمت ونگرانی کے علاوہ ان کے ساتھ پاٹ شالے بھی بنوائے۔ جہاں ہندو ودیارتھی مذہبی علوم نہایت آزادی سے حاصل کرتے تھے۔ ان کی مذہبی کتابیں جوان کی ہجرت کے ساتھ کشمیر سے نابود ہوگئی تھیں۔ ہندوستان سے واپس منگوائیں۔ بقول ملا بہاء الدین "دفاتر کفر وشکر کہ ازیں دیار بدر کشیدہ بودند باز طلبید ند"۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ ہندو جو کچھ ان کتابوں میں درج ہے۔ اس پر عمل کیا کریں۔ مندروں کی مرمت اور پاٹ شالاؤں کے اخراجات کیلئے بادشاہ نے جاگیریں عطا کیں۔ استاد تنخواہوں سے بے فکر تھے اور طالب علم فیسوں سے آزاد

تھے۔افسوس یہ باتیں بادشاہ کے ساتھ ہی مٹ گئیں۔

آہ! اے سلطان زین العابدین بڈشاہ ما
نوحہ کشمیر پڑھ بیٹھے تیری میت کے ساتھ

سنسکرت اور فارسی کا میل جول

بادشاہ نے ہندوؤں کا مذہبی لٹریچر صرف پاٹ شالاؤں ہی میں تقسیم نہیں کیا بلکہ ویدوں، شاستروں، پرانوں اور ان کی کئی مذہبی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں اور فارسی کتابوں کا سنسکرت زبان میں کر کے ہندوؤں کے مذہبی خیالات سے مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی مذہبی تعلیم سے ہندوؤں کو آگاہ اور باخبر کیا۔

بادشاہ کی عقلمندی بے تعصبی اور دور اندیشی کا ملک کی سیاسی حالت پر بہت اچھا اثر پڑا۔ چنانچہ جب مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کی مذہبی تعلیم سے واقف ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔

تو ذاتی بغض وعناد کی جڑیں جو تھوڑی بہت ابھی باقی تھیں۔ وہ بھی حرف غلط کی طرح کٹ گئیں۔ اب دونوں قومیں اکثریت واقلیت کی تمیز کئے بغیر آپس میں شیر وشکر ہو گئیں۔

جزیہ کی موقوفی نے بھی اس بادشاہ کے عہد میں کفر واسلام کی تفریق مٹادی تھی۔ لیکن دونوں قوموں کو دونوں کے علوم سے آگاہ کر کے بادشاہ نے نہ صرف اپنے مصائح ملکی یعنی قومی اتحاد کی وجہ سے ملک میں امن وامان کو مضبوط کیا۔ بلکہ کو بھی آئے

دن کے فتنہ وفساد سے نجات دلا دی۔

کیا کوئی اندازہ کرسکتا ہے۔ کہ بڈشاہ کیسا بے تعصب اور محبّ وطن بادشاہ تھا اور اس کی رعایا کیسی صلح جو اور امن پسند اور مختلف مذاہب کے بزرگوں کا احترام کرنے والی تھی۔ آہ اب یہ صورتیں خراب وخیال ہوگئی ہیں۔

ہو گئیں وہ صورتیں کو صورت موج سراب
خلق کو احسان ان کے اب بھی ہیں خاطر نشیں

کشمیری پنڈت اور فارسی

انگریزوں کے ابتدائی دور میں مسلمان علما اور پیر صاحبان نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے حصول سے جو حکمران قوم کی زبان تھی اور ملک کے ہر حصہ میں سرعت کے ساتھ پھیلی تھی محروم رکھا تھا اور زبان کی اسی محرومی کی وجہ سے مسلمان برطانوی عہد حکومت میں اب تک دفتری ملازمتیں نہ حسب خواہش اور نہ تناسب آبادی کے لحاظ سے حاصل کر سکے ہیں۔

بڈشاہ نے جزیہ کی موقوفی، سنسکرت لٹریچر کی سرپرستی اور اپنے ذاتی حسن سلوک سے ہندوؤں میں بہت کچھ ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات بھی بڑے خوشگوار تھے۔ لیکن ابھی تک ایسے ہندو علماء موجود تھے۔ جو ہندوؤں کو فارسی کی تعلیم سے جو اس وقت کشمیر کی دفتری زبان تھی اور جس کے حصول کے بغیر کسی ہندو کا کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہونا بہت مشکل تھا،

روکتے اور منع کرتے تھے اور اس کو ملیچھوں کی زبان کہتے تھے اور اس کے پڑھنے والے پر برادری سے خارج کرنے کے فتوے صادر کیا کرتے تھے۔

بڈشاہ نے ہندوؤں کو سمجھایا کہ فارسی دفتری زبان ہے۔ اگر تم اس سے الگ رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملکی حکومت میں تم کو کوئی حصہ نہ ملیگا۔ ملک کی کثیر تعداد مسلمان ہے جو کئی لاکھ تک ہے۔ تمہاری تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے فارسی زبان جس کو مسلمانوں نے اپنی مذہبی زبان عربی کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے اور جو کشمیر میں سوا سو سال سے زیادہ عرصہ سے اور ہندوستان میں کئی سو سال سے دفتری زبان کی حیثیت سے جاری ہے، بدلی نہیں جاسکتی۔ اس کے حصول کے لئے تم کو کوئی دقعت نہیں۔ تعلیم مفت ہے اور اس کے تمام اخراجات حکومت کے ذمہ ہیں۔ تم بھی مسلمانوں کی طرح فارسی پڑھو اور ملک کے عہدوں میں حصہ لو اور مل جل کر اپنے ملک کی ترقی وفلاح کی تدابیر سوچو۔

چنانچہ اسی زمانہ میں پنڈتوں نے فارسی پڑھنی شروع کی اور تھوڑے عرصہ میں اس قوم میں فارسی زبان کے ایسے نامور شاعر اور اور عالم فاضل پیدا ہوئے کہ بادشاہ نے ان کی قابلیت کی وجہ سے ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور وہ اعلیٰ مراتب ان کو عطا کئے کہ ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھے۔ فارسی پڑھنے والے ہندو طلباء کو خاص وظائف ملا کرتے تھے اور ان میں سے بعض نادار طلباء کو خوراک بھی حکومت کی طرف سے عطا ہوتی تھی۔

مختصر التواریخ کا مصنف (۱۵) بڈشاہ کی بے شمار خوبیاں بلکہ اس کے احسانات کو جو اس نے ہندو قوم کے ساتھ کئے تھے۔ تسلیم کرنے اور یہ تحریر کرنے کے

باوجود کہ ''درعایت فقراء وضعفاء وپرداخت حال رعایا وبرایا دقیقہ ازشفقت ومہربانی دریغ نمے داشت'' بڈشاہ جیسے نیک دل اور نیک نیت بادشاہ پر یہ حملہ کرتا ہے کہ اس نے پنڈتوں کو فارسی تعلیم کی تحریک محض اس لئے کی کہ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ کردیا جائے اور ان کو بامِ عروج سے قعر مذلت میں گرادیا جائے۔ چنانچہ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ''سلطان زین العابدین درفکر کار اُفتاد کہ ایں رکھیشر ان وریاضت کیشاں بہ چہ عنوان ازیں درجہ براندازم بمر درایام چند نفر برہمن رابدولت دنیا خام طمع ساختہ بہ خواندن علم فارسی مشغول ساخت وبہ خوردن نان شبانہ عادی کرد۔ تا انیکہ اندک ہمگی خواص وعام بہ طمع دولت ناپائیدار کہ یکجا قرار ندار وراغب ومائل گردیدند وطریقہ دیگر بروئے کار آمد وقانون قدیم اختلاف پذیرت وہر کس از درجۂ ریاضت اُفتادہ بدام حرص وہوا در اُفتاد۔''

مختصر التواریخ کے مصنف نے بڈشاہ کی رواداری پر جو زہریلی نظر ڈالی ہے۔ وہ دیکھ چکے ہو۔ اب گلزار کشمیر کے ہندو مصنف کی رائے بھی ملاحظہ فرمائے جس نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ کشمیر کے علاوہ ہندوستان کے اکثر لوگ کشمیر کے برہمنوں کی ان کے کمالات علم کی وجہ سے عزت وتکریم کرتے اور نقد وجنس سے ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ جب دولت اسلامیہ کشمیر پر قابض ہوگئی تو امراء لوگ انقلاب سلطنت کی وجہ سے برہمنوں کی خاطر اچھی طرح نہ کرسکے۔ یہی باعث تھا کہ اہل علم رفتہ رفتہ علم سے بھی اور دولت سے بھی بے بہرہ ہوگئے اور چونکہ محنت اور جفاکشی کی ان کو عادت نہ تھی۔ اس لئے ان کی گزراوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ بڈشاہ کے حسن سلوک کی تعریف سن کر مہاجر کشمیری پنڈتوں کی ایک کثیر جماعت کشمیر میں واپس آگئی

تھی اور ہر چند ان کو بادشاہ نے سر آنکھوں پر جگہ دی تھی۔ تاہم بہت سے لوگ مالی حیثیت سے امداد کے قابل تھے۔ بادشاہ نے جوگی لنگر میں نادر محتاج برہمنوں کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ برہمن لوگ بھی علم مروجہ (فارسی) حاصل کریں۔ سرکاران کو ان کی قابلیتوں کے موافق کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کردیگی۔ چنانچہ صاحب گلزار کشمیر کے چند اصل الفاظ ذیل میں درج ہیں۔ ''سلطان تعسّر گذران ایں جماعت نہ پسندیدہ از نا قابلیت محنت کشی و بار برداری کہ در تعیش عادات سعی بازو نہ داشتند بہ نظر چارہ گری در تعلیم علم فارسی بہ محاسبہ طوعاً و کرہاً مائل کنانیدہ ہر یکے را فراخور حوصلہ و خرج واجبی بہ کارے منسوب نمودہ تقسیم رزق کردہ داد۔''

شارٹ ہسٹری آف کشمیر ایک تازہ تصنیف ہے۔ جو اس عہد میں لکھی گئی ہے، جب کہ ملک میں فرقہ وارانہ اختلافات ترقی پر ہیں اور کوئی قوم دوسری قوم کے کسی مذہبی بزرگ یا دنیاوی بادشاہ کی نیکی اور اس کے احسانات کو تسلیم کرنا اپنی بلکہ اپنے مذہب کی کمزوری محسوس کرتی ہے۔ اس کتاب میں جو ایک کشمیری پنڈت (۱۶) کی تصنیف ہے لکھا ہے۔ زین العابدین کی متبرک یادگار ہمارے دلوں میں ہے۔ جو کچھ اس نے کیا دانائی اور مآل اندیشی سے کیا۔ اس کے تاج کے نیچے قابلیت ہی قابلیت چھپی ہوئی تھی۔ اس کے عہد میں ہر کسی کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ہندوؤں نے اس کے مبارک دور میں (فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد) اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری ملازمتیں حاصل کیں۔

پنڈتوں کے دو فرقے

پنڈتوں میں جن لوگوں نے دفتری زبان (فارسی) سیکھ کر نوکریاں حاصل کیں ان کا نام کارکن مشہور رہوا۔ جو مذہبی کام کرتے تھے، ان کو باچھ بٹ کہتے تھے۔ اگرچہ بڈشاہی کے عہد میں کارکن پنڈتوں نے سرکاری دفاتر پر اچھا خاصا اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ لیکن تاریخ اس امر کی شہادتیں بھی پیش کر رہی ہے کہ بڈشاہ کے کئی سو سال بعد افغانوں کے عہد میں جو بے آئینی اور مظالم کا دور تھا۔ کشمیری پنڈت حکومت کے تمام شعبوں پر حاوی تھے۔ یہاں تک کہ خود افغانستان میں کارکن پنڈتوں کا طوطی بول رہا تھا۔ چنانچہ نند رام تکو ایک معزز کشمیری پنڈت نے کابل میں جا کر وہ عروج حاصل کیا کہ آج تک ''سکہ زد در کابلستان نند رام'' مشہور چلا آتا ہے۔

پنڈتوں کے یہ دونوں فرقے آج تک موجود ہیں اور تعجب یہ ہے کہ ان کا باہمی اختلاف بھی آج تک نابود نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں بھی نہیں کرتے۔

بڈشاہی دربار کے پنڈت کارکن

پنڈتوں نے بڈشاہی دور ہی میں فارسی زبان کی طرف توجہ کی اور اپنی ذہنی قابلیتوں کی وجہ سے اسی زمانے میں اعلیٰ اعلیٰ عہدے حاصل کر لئے۔ جن

عہدیداروں کے نام کشمیر کی مختلف تواریخوں سے ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ان کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

(۱) پنڈت شیو بٹ حکیم شاہی۔

(۲) پنڈت زونہ راج مترجم ومؤرخ۔

(۳) پنڈت یودھ بٹ مترجم۔

(۴) پنڈت سداشیو بایو جوتشی ومنجم۔

(۵) پنڈت گوپال کول صدر قانون گو کشمیر۔

(۶) پنڈت مادھو کول قانون گوئے کامراج۔

(۷) پنڈت گنیش کول قانون گوئے کامراج۔

(۸) سوم پنڈت مصاحب وشاعر ومترجم۔

(۹) تلک چاریہ بدھ مذہب مصاحب۔

(۱۰) روپے بٹ منجم وریاضی دان۔

(۱۱) تارپور بٹ درباری حکیم۔

(۱۲) سیما منجم۔

(۱۳) پنڈت شری بٹ وزیر انصاف۔

(۱۴) پنڈت شریور مؤرخ ومصاحب۔

زونراج لکھتا ہے۔یہی وہ لوگ تھے جن کی وساطت اور برکت سے بادشاہ کے عہد میں برہمنوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ان میں سے چند ایک کے حالات بڈشاہی درباریوں کی ذیل میں لکھے جائینگے۔

گاؤ کشی بند اور رسم ستی کا مشروط اجراء

گائے کا گوشت مسلمانوں میں حلال و جائز ہے۔ چنانچہ مسلمان سلاطین کے عہد حکومت کے ساتھ ہی کشمیر میں گاؤ کشی بھی شروع ہو گئی تھی۔ بڈشاہ نے اپنی محکوم رعایا کے ایک فرقہ کے تالیف قلوب کی خاطر اور زراعتی کاروبار کو ترقی دینے کے لئے ممالک محروسہ میں گاؤ کشی کی ممانعت کے احکام جاری کر دیے۔ اور نہ صرف یہی کام کیا۔ بلکہ رسم ستی کو بھی جو ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے چلی آتی تھی اور سابقہ سلاطین اسلام نے اس کو ایک ظلم سمجھ کر بند کر دیا تھا۔ اور خود زین العابدین بھی اس کے دوبارہ اجراء پر راضی نہ تھا۔ صرف ہندوان کشمیر کی خاطر اس نے اس رسم کو جو فی الواقع صریح ظلم تھی۔ بعض شرائط کے ساتھ دوبارہ جاری کر دیا۔

چنانچہ شریور لکھتا ہے۔ اس ملک میں بھی ہندوستان کی طرح ہندو عورتیں اپنے خاوندوں کی لاشوں کے ساتھ ستی ہو جایا کرتی تھیں اور چونکہ ہندو رسم ستی کو اپنا مذہبی قانون سمجھتے ہیں۔ اس لئے بادشاہ اس کو بند نہ کر سکا۔ اور اس نے ان کے مذہبی معاملہ میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔

ممکن ہے گاؤ کشی کو بند کرنے کے متعلق اس زمانہ کے علماء نے بادشاہ کے اس فرمان کو مذہب اسلام میں دخل دینے کا مترادف سمجھا ہو اور اس پر ناراضگی کا اظہار کیا ہو۔ لیکن بادشاہ جو صلح کل تھا اور سمجھتا تھا کہ ذبیحہ گاؤ کے حلال ہونے کے باوجود اسلام نے یہ حکم کہیں نہیں دیا کہ مسلمان اگر گائے کا گوشت نہیں کھائے گا۔ یا اس کی قربانی نہیں دیگا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اس لئے اس نے علمائے وقت کو ایک

ہمسایہ اور ماتحت قوم کے مذہبی جذبات کے احترام کی طرف توجہ ضرور دلائی ہوگی اور علماء اسلام نے بھی ہمسایہ قوم کی دلداری کی وجہ سے بادشاہ کی ملکی مصلحتوں کو سمجھ لیا ہوگا۔ خصوصاً جب کہ ذبیح گاؤ کے بغیر بھی ایک مسلمان مسلمان رہ سکتا ہے۔

ہندو مُردوں کے ٹیکس کی منسوخی

سکندر بُت شکن اور علی شاہ کے زمانے میں یہ دستور چلا آتا تھا کہ ہندو اپنے مردوں کو جلانے کے جب شمشان بھومی میں لے جایا کرتے تھے۔ تو ان سے مردہ جلانے کا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بڈشاہ کے عہد میں بھی کچھ عرصہ تک اس کا رواج رہا۔ شریور لکھتا ہے کہ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو اس کو جلانے اور اس کی ماتمی رسومات ادا کرنے کے لئے مجھ سے بھی محصول طلب کیا گیا۔ میں نے بادشاہ کو اس ٹیکس کی اطلاع دی اور اس کی منسوخی کی طرف توجہ دلائی۔ بادشاہ نے فوراً میری عرضداشت پر شاہانہ توجہ فرمائی اور بیک جنبش قلم اس ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس کو معاف فرما دیا۔ چنانچہ اس وقت سے کشمیر میں یہ ٹیکس معاف ہے۔ ہر ہندو اپنے مُردوں کی رسومات اطمینان سے ادا کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں پر چوٹ کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ لیکن عام ملیچھ ٹیکس کی اس منسوخی سے خوش نہیں ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ جب بادشاہ نے ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کے احکام جاری کئے ہوں گے۔ تو ضرور علماء اہل شریعت نے کسی نہ کسی رنگ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہوگا۔ لیکن یہ نیک دل بادشاہ حکومت کے استحکام اور اپنے فرائض کو ان سے بہتر سمجھتا تھا۔ مسلمان

بادشاہ کے ان احسانات کے باوجود مسلمانوں کے لئے شریور کا یا کسی اور مورخ کا بار بار ملیچھ کا لفظ لکھنا اس کے اپنے ملیچھ پن یا اس کے دل کی اندرونی کثافت کا ثبوت ہے۔

بڈشاہ اور امرناتھ کی یاترا

اس کا قدیم سنسکرت نام امریشور اور کشمیری نام امرناتھ ہے۔ یہ ایک ایسا تیرتھ ہے، جہاں نہ صرف کشمیری بلکہ پنجابی، مدراسی، بنگالی اور ہندوستان کے دوسرے حصص کے لوگ بھی یاترا کے لئے آتے ہیں۔ امرناتھ ایک مرتفع غار (گفا) کا نام ہے۔ جو اسلام آباد سے پانچ منزل یا پانچ دن کے راستہ پر واقع ہے۔ یہ مقام ۱۷۳۰۰ فٹ کی بلندی پر ایک برفانی چوٹی کے جنوبی پہلو میں ہے۔ اس غار کے اندر سفید برف کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اس پانی کے انجماد سے بنا ہوا موجود رہتا ہے جو چٹان سے رستا رہتا ہے۔ ہندو اسے سوامریشور کا مجسمہ خیال کرتے ہیں اور شولنگ تصور کر کے پوجتے ہیں اور اس کے درشن کو باعث خیر و برکت سمجھتے ہیں۔ باوجود اس شہرت کے راج ترنگنی (پنڈت کلہن) اور نیل مت پران میں اس مقدس تیرتھ کا بہت کم ذکر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس کی اس قدر شہرت نہ تھی اور نہ کبوتروں کا جوڑہ کہیں سے نکلتا تھا۔ جیسا کہ آج کل کے زائرین (یاتری) ان کی شہادت دیا کرتے ہیں۔

مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلا بادشاہ بڈشاہ ہے۔ جو مندروں کے اس متبرک تیرتھ پر پہنچا۔ چنانچہ زونراج نے اپنی راج ترنگنی میں (۱۷) لکھا ہے کہ سلطان زین العابدین اس تیرتھ کے لئے تمام مشکلات کو عبور کر کے وہاں گیا۔

بادشاہ ہندوؤں کے میلوں اور تیرتھوں پر جایا کرتا اور اپنی شمولیت سے ان تیرتھوں کی رونق کو دوبالا کیا کرتا تھا۔ افسوس ہے امرناتھ کی شاہی یاترا کے مفصل حالات نہیں مل سکے۔ ورنہ معلوم ہوسکتا کہ کس جاہ وجلال سے اور کس ساز وسامن کے ساتھ وہاں جانا ہوگا۔ بادشاہ کے یاترا جانے سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ کلہن پنڈت یا راجہ جے سنگھ کے زمانہ میں امرناتھ کی بہت زیادہ شہرت نہ تھی۔ تاہم بڈشاہ کے زمانہ میں یہ اس قدر مشہور تھا کہ خود بادشاہ وہاں یاترا کے لئے گیا تھا۔

شاردا تیرتھ اور بڈشاہ

ہندوؤں کا یہ مشہور تیرتھ کمراز کی طرف دریائے کشن گنگا کے دائیں کنارے ضلع مظفر آباد کی تحصیل کرناہ میں واقعہ ہے اور بہت قدیم زمانہ سے مشہور ہے۔ چنانچہ البیرونی (بہ زمانہ محمود غزنوی) نے اپنی کتاب الہند، ملہیم چندر کے مصنف دیا کرن اور کلہن نے راج ترنگنی میں اسی طرح جونراج اور اس کے بعد کے مصنفوں اور فارسی مورخوں میں ابوالفضل (بزمانہ اکبر) وغیرہ سب نے اس کا ذکر کیا ہے۔

زونہ راج کی ایک تحریر کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ سلطان زین العابدین بھی اس تیرتھ کی یاترا کیلئے گیا تھا۔ سٹین صاحب نے راج ترنگنی کے انگریزی ترجمہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ غالباً ۱۴۲۲ء میں اس مندر کی زیارت کیلئے گیا۔

اس زمانہ کے مشکل ترین راستوں پر غور کرو۔ پہاڑوں کی عظیم رفعت کو جہاں ہر موسم میں برف کے تودے لگے رہتے ہیں، دیکھو۔ دریاؤں ندی نالوں کی

طغیانیول پر نظر ڈالو اور بادشاہ کی عقید تمندی اور دلوں پر حکومت کرنے کی پالیسی پردھیان کرواور پھر بتاؤ کیا ایسی مثالیں آج بھی مل سکتی ہیں۔

مسجدیں اور پنڈت اور قشقہ

سلطان بُت شکن اور علی شاہ کے زمانہ میں ہندوؤں کو مسجدوں میں داخل ہونے بلکہ ان سے چھو جانے تک کی سخت ممانعت تھی۔ بڈشاہ نے یہ سختی ہٹادی۔ اور حکم دیا کہ ہندوؤں کو بشرط طہارت مسجدوں میں داخل ہونے اور ان کے صحنوں میں پھرنے اور ان کے دیکھنے کی عام اجازت ہے۔ کوئی پنڈرت سلطان بُت شکن اور سلطان علی شاہ کے زمانہ میں نہ اپنے آپ کو علانیہ ہندو کہہ سکتا تھا اور نہ اپنی پیشانی پر قشقہ لگا سکتا تھا۔ جو ان کا قدیم دستور تھا۔ بادشاہ نے پنڈتوں سے اس مصیبت کو بھی دور کیا۔ اور کھلے بندوں ان کو ہندو کہلانے اور قشقہ لگانے کی اجازت عطا کی۔ علاوہ ان مراعات کے جرمانہ پیشکش نذرانہ جو سلطان بُت شکن کے زمانہ سے جاری تھا۔ معاف کردیا۔ (۱۸)

ہندوؤں کے لئے ہندو عدالتیں

ہندوؤں اور مسلمان مصنفوں اور مورخوں نے بڈشاہ بادشاہ کی اس انصاف

پروری کی سنہری الفاظ میں داد دی ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مذہبی مقدمات کے تصفیہ کے لئے ہندو جج اور مسلمانوں کے مذہبی مقدمات کے لئے قاضی مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ خواجہ محمد اعظم اپنی تاریخ واقعات کشمیر میں لکھتے ہیں۔ ''از ہر ملتے بہ جہت فیصل قضایا شخصے را از ہماں آئین تعین مے کرد۔'' اور جب مدعی اور مدعا علیہ ہندو اور مسلمان ہوتے تھے۔ تو ان کے مقدمات کا تصفیہ دو جج مل کر کرتے تھے۔ جن میں ایک ہندو ہوتا تھا، ایک مسلمان۔ یہ وہ انصاف اور وہ عدل ہے کہ آج بھی ہندوستان کو کامل طور پر نصیب نہیں ہو سکا۔

شکار سے نفرت اور گوشت سے پرہیز

بڈشاہ کو باوجود ایک عظیم الشان فاتح و کامران بادشاہ ہونے کے شکار سے کوئی رغبت نہ تھی۔ شکار سے جو خرابیاں انسانوں اور حیوانوں پر آتی ہیں۔ وہ سب اس کے پیش نظر تھیں۔ صدہا انسان شکار کو گھیرے اور شور مچانے کیلئے ہمراہ ہوتے۔ ان میں سے کئی ایک رستہ کی خرابیوں اور پہاڑوں کے نشیب و فراز کی نذر ہو جاتے۔ پھر ان غریبوں کا جو ہرج اور نقصان ہوتا وہ اس کے علاوہ تھا۔ مبداء فیاض نے اس کے پہلو میں ایک دردمند دل رکھا تھا۔ اس نے اپنے ابتدائی دور کے بعد شکار کو نہ صرف خود ترک کیا۔ بلکہ اس خیال سے کہ اس کی رعایا کا ایک گروہ (طبقہ ہنود) شکار سے نفرت رکھتا ہے۔ اس نے کشمیر میں شکار کی قطعی ممانعت کر دی۔ بعض بعض ہندو تقریبوں اور تہواروں پر گوشت بھی ترک کر دیا کرتا تھا اور اپنے مذہب کے مبارک مہینہ یعنی

رمضان میں گوشت کا مطلقاً استعمال نہ کرتا تھا۔

رفاہ عام دان اور دھرم نمبل

بادشاہ نے شورپور حال ہیرپور واقعہ درہ پیر پنچال میں جو شوپیان سے تھنہ وراجوری کے رستہ میں ایک پڑاؤ ہے۔ اور اپنے تاریخی واقعات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ کچھ مواضع اس کام کے لئے وقت کر دکھے تھے کہ ان کی آمدنی سے مسافروں کو جو پنجاب یا گردنواح سے کشمیر میں آیا کرتے تھے۔ بلا امتیاز مذہب وملّت مفت کھانا ملا کرے۔ ہیرپور میں بادشاہی لنگر موجود رہتا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کیلئے علیحدہ علیحدہ انتظام ہوتا تھا۔ اس دان یا فیاضی کا نام شریور نے اپنی راج ترنگنی میں ان ستر اوچھن لکھا ہے۔

وُلر میں فصل سنگھاڑا بہ افراط ہوتی ہے۔ اس کے چاروں ساحل اس فصل کی پیداوار سے لبریز رہتے ہیں۔ بادشاہ نے تمام فصل کو غریب غربا کے لئے وقف کر دیا اور نام اس کا دھرم نمبل رکھا۔ چنانچہ تاریخ حسن میں لکھا ہے۔ ''از ابتدائے عہد بڈشاہ تا حال وقف عام است آں را دھرم نمبل مے گونید۔'' لیکن اس کا جنوبی وغربی حصہ اب مدت سے ضبط سرکار ہے۔ چنانچہ مصنف تاریخ حسن لکھتا ہے۔ ''آنکہ درنواحی غرب وجنوب مے روید از قدیم ضبط سرکار۔''

بڈشاہ ہندوؤں پر کیوں مہربان تھا؟

ہندو مورخوں اور ہندوؤں کی تقلید میں مسلمان مورخوں نے ہندوؤں پر شاہی عنایات کے متعلق عجیب وغریب حکائتیں لکھی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ سلطان ابتدائے عہد میں ہندوؤں کی طرف چنداں ملتفت نہ تھا۔ لیکن ایک دفعہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوگیا تو شیو بٹ اور دیگر اطبائے نامدار کی تمام تدابیر کے باوجود بھی اسے آرام نہ آیا۔

آخر شیو بٹ اور بودی بٹ ایک باکمال جوگی کے پاس گئے۔ جو علم سیمیا میں یگانہ روزگار تھا اور کشمیر کے ایک گوشہ میں رہتا تھا۔ بادشاہ کی بیماری کا حال اس سے عرض کیا۔ جوگی نے کہا۔ سلطان کی موت سے تو کوئی چارہ نہیں۔ تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے۔ البتہ ایک صورت ہے کہ قدرت بھی اپنا کام کرے اور بادشاہ بھی زندہ رہ سکے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ جب بادشاہ کا دم نکل جائے تو میں اپنے خاص عمل کے ذریعے روح اپنے قالب سے نکال کر اس کے قالب میں ڈال دوں گا۔ جب میری روح سلطان کے بدن میں منتقل ہو جائے تو میرے قالب کو حفاظت و احتیاط سے تھام کر میرے اصلی آسن پر لے آؤ۔ تاکہ سلطان کو صحیح وتندرست بلکہ زندہ کر کے میں پھر اپنی اصلی حالت پر آجاؤں۔ چنانچہ جوگی کو اس کے شاگردوں سمیت بادشاہ کے دونوں مصاحب بادشاہ کے پاس لے آئے۔ جب بادشاہ کا مرغ روح اس کے نفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ تو جوگی نے اپنا عمل شروع کیا۔ اپنی روح اس کے قالب میں ڈالدی۔ اس کے شاگردنے امراء سے کہا کہ اپنے بادشاہ کو جا کر دیکھ لو۔ وہ اب صحیح

وسالم موجود ہے اور میں اب اپنے استاد کو معالجہ کیلئے اپنے استھان میں لئے جاتا ہوں۔

وجیز التواریخ کے مصنف نے استھان میں لیجانے سے اختلاف کیا ہے۔وہ لکھتا ہے مصاحبوں نے جوگی کے قالب کو ہندو رسوم کے مطابق جلا دیا۔اس واقعہ کے بعد بادشاہ ۳۲ سال تک عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا اور ہندوؤں کی اس بے غرضانہ محبت وخدمت کا اس کے دل پر محکم اور پائیدار اثر پڑا۔

ہندو مورخین کا خیال ہے کہ چونکہ نئے زین العابدین میں ایک ہندو کی روح موجود تھی۔اس لئے قدرتاً اسے ہندوؤں سے محبت تھی۔شارٹ ہسٹری آف کشمیر کا ہندو مصنف بھی اس کی تائید کرتا ہے اور لکھتا ہے۔لوگوں کا عام خیال ہے کہ اس بڑی شخصیت میں ہندو روح حلول کر گئی تھی۔جو اس کو ہندوؤں کی طرف راغب کرتی رہتی تھی۔

لیکن ارباب دانش سے مخفی نہیں ہے کہ روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل نہیں ہوسکتی۔البتہ مرض کا منتقل ہونا قرین قیاس ہے۔جیسا کہ بابر کی موت اور ہمایوں کی بیماری کا حال سب لوگ جانتے ہیں کہ باپ بیٹا دونوں سخت بیمار تھے۔ بابر نے خلوص دل سے خضوع خشوع کے ساتھ دعا مانگی کہ بارالٰہا ہمایوں کی بیماری میری بیماری میں شامل کر کے اس کو صحت وتندرستی عطا فرما۔دعا دل سے نکلی تھی اثر کر گی۔بابر زیادہ بیمار ہو گیا اور ہمایوں تندرست ہونے لگا۔یہاں تک کہ تیسرے ہی دن بابر کا انتقال ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جوگی اور بڈشاہ کا معاملہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔

بہرحال ہندو اس کے احسانات عظیمہ کے قائل ومعترف ہیں اور اس کی انصاف پڑدہی اور رعایا پروری اور علم دوستی، شکرگزاری اور احسان مندی کے ساتھ ذکر کرتے رہتے ہیں۔

راجہ راجور کی بیٹی اور بڈشاہ

صاحب اسلامک کلچرانِ کشمیر لکھتے ہیں۔ راجوری کے راجہ سندر سین نے جس کی تخت نشینی کا سال ۱۴۵۰ء بتایا جاتا ہے۔ اپنی بڑی لڑکی راجیہ دیوی بڈشاہ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجی۔ بادشاہ اس وقت جھیل ولر کی سیر کررہا تھا۔ ڈولی اور ڈولی کا جلوس معہ کنیزگان وہیں پہنچا۔ بادشاہ نے دیکھ کر فرمایا کہ یہ کس مائی کی ڈولی ہے۔ جو واقف کار تھے انہوں نے واقعہ عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ جس کو ماں کہہ دیا ہے اس کو بیوی کیونکر قبول کرسکتا ہوں۔ بادشاہ نے اس خیال سے کہ ڈولہ واپس بھیجنے میں راجہ کی ہتک ہوگی راجیہ دیوی کو شاہی حرم میں بھجوادیا۔ جہاں ہمیشہ اس کی خدمت میں وہ ایک بیٹے کی حیثیت سے حاضر ہوتا رہا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ رانی بادشاہ کا یہ حسن سلوک دیکھ کر تھوڑے عرصہ کے بعد مسلمان ہوگئی اور اس نے بادشاہ کی اجازت سے اپنی یادگار کے طور پر نالہ مار پر راجوریکدل یا راجوری کدل کے نام سے ایک پل تعمیر کرایا۔

صاحب اسلامک کلچران کشمیر نے جو واقعہ جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی سے لیا ہے۔ لیکن اس واقعہ کا ذکر نہ زونراج کی زینہ ترنگنی اور نہ شریور کی زینہ راج ترنگنی میں ہے۔

البتہ اس واقعہ کے تسلیم کرنے سے بہ ظاہر اس لئے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کے اپنے محلات میں یکے بعد دیگرے پہلے بھی راجہ مدر دیش کی دو راجکماریاں رہ چلی تھیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر راجہ راجوری نے اپنی راجکماری بطور پیشکش بادشاہ کے پاس بھیج دی ہو۔ جب کہ اس ملک میں پہلے بھی اس قسم کی نظیریں موجود تھیں اور

خصوصاً جب کہ راجہ راجوری اس کے ماتحت بھی تھا۔ اور اس کا احسان مند بھی تھا۔ کیونکہ رانا سوہا(Aana Soha)(۱۹) نے اس پر یک لخت حملہ کر دیا تھا اور بڈشاہ کی بروقت اعانت نے سوہا کو شکست فاش دے کر اسے جان سلامت لے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک نو عمر اور پرچہرہ راجکماری کے پاس جو بیوی بنائے جانے کی خاطر بادشاہ کے حضور میں بھیجی گئی تھی۔ ہمیشہ ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح جانا۔ بادشاہ کے اخلاق حسنہ، اس کی مقدس زندگی اور اس کے صفائے قلب کی ایک نادر مثال ہے اور اس کا یقیناً ہندوؤں اور عام لوگوں پر بڑا اثر ہوا ہوگا۔

بادشاہ کی عنایات برہمنوں پر

زونراج لکھتا ہے۔ بارہ کھشیتر وجیا کھشیتر اور اشانک کے مقامات پر بادشاہ نے خیرات خانے کھول رکھے ہیں۔ جن سے برہمن بھی مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔ پرگنہ کرال میں زین پور بادشاہ کی نئی بستی ہے وہاں برہمنوں کو خاص مراعات ملی ہوئی ہیں۔ اس نے اکثر برہمنوں کی زمینیں بلا لگان دے رکھی ہیں۔

شریور نے بھی شکر گزاری کے الفاظ کے ساتھ بادشاہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے اندرکوٹ میں بادشاہ کی فیاضیوں سے اس قدر برہمن اور تپسوی جمع رہتے کہ ان کے سنکھوں اور نادوں کی گونج مانسبل تک جایا کرتی۔ ناگ یاترا اور گھن چکر کے تہواروں پر بادشاہ کی طرف سے برہمنوں کو پھول، میوے اور کھانا مفت ملا کرتا۔ ان

میں جو سب سے بڑا تھا، جس کو وہ میرا (Mera) کہتے تھے۔ بادشاہ نے اس کو خلعت عطا کیا۔ تحفہ تحائف دیئے اور اعزازی نشان عطا کر کے اس کا مرتبہ بلند کیا۔

بادشاہ وتستہ اور سندھو کی جائے اتصال شادی پور کے مقام پر ہمیشہ مچھلیوں کو چاول کھلایا کرتا تھا۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں میں برہمنوں کو بڑے بڑے جلیل القدر عہدے دے رکھے تھے۔ جن کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وتستہ کی یادگار میں دربار چراغاں

بادشاہ اندرکوٹ کے برہمنوں کو انعامات اور تحفہ تحائف دیکر چاند کی ۱۲ تاریخ کو رخصت کر دیا کرتا اور تیرھویں تاریخ کو جشن دیکھنے کے لئے شہر میں واپس آجایا کرتا۔ جو وتستہ (دریا) کی پیدائش اور اس کے فیوضات کی یادرگار کے طور پر کشمیر کے برہمن ہر سال منایا کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر چراغاں کی اس قدر کثرت ہوتی کہ شہر بقعۂ نور بن جاتا۔ اور چونکہ بادشاہ اس میں خود دلچسپی لیتا تھا، اس لئے مسلمان بھی جشن پر چراغاں میں شامل ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ کشتی پر سوار ہو کر چراغاں کا نظارہ دیکھا کرتا۔ دریا کے دونوں کناروں پر چراغوں اور موم بتیوں اور فانوسوں کی قطاریں جب دریا کے لہراتے ہوئے پانی میں اپنا عکس ڈالتی تھیں۔ تو یہ منظر دیکھنے والوں کے دلوں میں عجب کیفیت پیدا کرتا۔ بادشاہ اس نورانی منظر کے دیکھنے کے لئے جب کشتی پر سوار ہوتا اور دارالحکومت کے پاس آکر کشتی سے اُترتا تو رعایا کی دعاؤں کے شور سے آسمان گونج اُٹھتا۔

بادشاہ چراغاں دیکھ چکنے کے بعد دربار ہال میں آتا۔ جہاں درباری اس کے آنے سے پیشتر ہی اپنی اپنی نشست گاہیں سنبھال لیتے۔ پہلے رقص وسرود کی محفل گرم کرتا۔ اس سے فارغ ہو کر دربار منعقد کرتا اور بقول شریور ساری رات اسی طرح بسر کر دیتا۔(۲۰)

نظام ملک خوش اسلوب تھا اس عہد زرّیں میں
وطن اک جنت مرغوب تھا اس عہد زریں میں
ہر ایک لمحہ بہت ہی خوب تھا اس عہد زرّیں میں
زمانہ کس قدر محبوب تھا اس عہد زرّیں میں
کھلے تھے ہر طرف خلد بریں کے باب اے جہلم

روشن صدیقی

جہانگیر نے بھی توزک میں کشمیر کے اس جشن چراغاں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ یہ ایک قدیم رسم ہے، جو ہر سال ادا کی جاتی ہیں۔ ہر غریب، ہر امیر جس کا گھر لب دریا واقع ہے۔ شب برات کی طرح چراغاں روش کرتا ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے۔ میں نے برہمنوں سے اس جشن کی وجہ دریافت کی۔ تو انہوں نے کہا کہ اس تاریخ کو دریائے وتستہ (بہت) کا سر چشمہ ظاہر ہوا تھا۔ اور یہ رسم زمانہ قدیم سے اسی طرح منائی جا رہی ہے۔ اس جشن کا نام دتہ تر واہ ہے۔ جو چاندی کی تیرھویں تاریخ کو ہوتا ہے۔ کشمیر میں تر واہ تیرہ کو کہتے ہیں اور دَت یا دھت بہت کا مترادف ہے۔ جو دریائے جہلم کا قدیم نام ہے۔

مفتوح و ماتحت ہندو راجگان سے بادشاہ کا سلوک

بادشاہ کو ملک گیری اور خود بخود پیش قدمی کا چنداں شوق نہ تھا۔ لیکن جب کبھی ان باتوں کے لئے واقعات وحالات اس کو مجبور کر دیتے۔ تو وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ کرتا تھا اور جب کسی ملک کو فتح کر لیتا تو مفتوح والئے ملک ہی کو فتح کیا ہوا ملک بعض شرائط کے ساتھ واپس کر دیتا تھا اور اس کو ملک کی آسائش کی طرف توجہ دلایا کرتا تھا۔

اس مملکت سے ملحق یا ماتحت جس قدر والیان ملک تھے۔ ان سب سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ راجگان گندھار، راجگان سندھو، راجگان راجور، راجہ مدر، راجہ اودبانڈپو، بلتستان وغیرہ اس کے حسن سلوک کے مداح تھے۔

راجہ مالدیو والئے مدر دیش کے ساتھ اس کے جو تعلقات تھے اس کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے۔

اودبانڈپور کا راجہ بھی اس کا رشتہ دار تھا۔ وہ راجہ سندھو سے مدد لیکر بار بار سرکشی کرتا تھا اور بڈشاہ بار بار اس کی خطائیں معاف کرتا تھا اور فتح پانے کے باوجود اس کو پھر تخت پر بٹھاتا تھا۔

بھٹہ قوم کی سرزمین پر گوگا قوم کی حکومت تھی۔ بادشاہ نے اس کو بھی فتح کر لیا۔ شے زیئی (لداخ) کے مقام پر مہاتما بدھ کی ایک سنہری مورتی تھی۔ لوگوں نے اس مندر کو جس میں وہ مورتی تھی لوٹنا چاہا۔ بادشاہ نے بڑی حکمت کے ساتھ ان کو اس ارادے سے باز رکھا۔

کلوت (۲۱) کا علاقہ جب بادشاہ نے فتح کر لیا تو بھٹہ قوم پر بادشاہ کی سخت ہیبت چھا گئی۔ اور بھٹوں نے آیندہ چھیڑ خانی اور سرکشی بند کردی۔

راجہ راجوری کا تلک راج

بادشاہ نے جب ۴۴۳۸ سنہ لوکک کے سیلاب عظیم کے بعد ایک نیا شہر زینہ تلک کے نام سے جیاپیڈ پور (اندرکوٹ) کے قریب آباد کیا۔ تو اس نے اپنی سالگرہ (جنم دن) کا جشن جس کو وہ ہر سال منایا کرتا تھا، اس نئے شہر میں منانے کا ارادہ کیا۔ اس دربار میں جو ماتحت راجے، رئیس اور جاگیردار اور اہل دربار دارالحکومت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان سب کو اس نئے شہر کی رونق بڑھانے کے لئے یہاں آنا پڑا۔ انہی ماتحت راجاؤں میں راجوری کا نیا راجہ جے سما (جے سنگھ) بھی تھا۔ جس کو ابھی تک باقاعدہ مسند نشینی اور راجگی کے اختیارات نہیں ملے تھے۔ بادشاہ نے اس تقریب پر راجہ جے سنگھ کو اپنے ہاتھ سے راج تلک لگایا۔ بادشاہ اس کی خدمات سے بڑا خوش تھا۔ اس نے مسرت کے ساتھ راجوری کی خوش حال اور شاداب سلطنت کا جے سنگھ کو حقدار تسلیم کیا۔

۳۸ سنہ لوکک میں سیلاب آتا تھا۔ ۳۹ سنہ لوکک میں یعنی دوسرے سال بادشاہ نے زینہ تلک کو آباد کیا ہوگا۔ ۳۹ سنہ لوکک ۱۴۶۳ء اور ۸۶۷ھ کے مطابق تھا۔ اس حساب سے راجہ جے سنگھ کو ۱۴۶۳ء میں راجوری کی باقاعدہ حکومت ملی تھی۔

تاریخ راجور کا مصنف لکھتا ہے کہ راجگان راجور شہاب الدین غوری کے

زمانہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ اور جہانگیر توزک میں لکھتا ہے کہ فیروز شاہ خلجی کے عہد میں والیان راجور نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

راجگان راجور کا قبول اسلام

صاحب اسلامک کلچران کشمیر لکھتے ہیں کہ بڈشاہ کے زمانہ میں ہندو ہی تھے ۔ چنانچہ راجوری کے راجہ چندر سین نے اپنی راجکماری بڈشاہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔

لیکن زونراج جو بڈشاہ کے عہد کا مصنف، درباری شاعر اور مصاحب ہے اپنی تاریخ زینہ راج ترنگنی میں راجوری کے نئے راجہ کا نام جے سما جس کو ہم جے سنگھ یا جے سین کہہ سکتے ہیں، لکھتا ہے۔ اس لئے راجگان راجور اور توزک جہانگیری دونوں کی تحریریں بڈشاہ کے ہمعصر مصنف کی تحریر کے سامنے کوئی وقعت (۲۱) نہیں رکھتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڈشاہ کے زمانہ میں راجگان راجور ہندو ہی تھے۔ یہ مسلمان کب ہوئے۔ یقیناً بڈشاہی عہد کے بعد کسی زمانے میں ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ مصنف تاریخ راجگان جموں و کشمیر صفحہ ۱۲ جلد اوّل میں لکھتا ہے۔ ''خاندان راجگان راجور بعہد شاہان مغلیہ مسلمان ہو گئے۔ ان کی برادری کچھ ہندو بھی ہے۔'' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاہان مغلیہ کا تعین بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ بابر یا ہمایوں یا سوری خاندان یا اکبر کے زمانہ ہی میں مسلمان ہوئے ہوتے تو جہانگیر فیروز شاہ خلجی کا ذکر نہ کرتا۔ جو مغل خاندان سے کئی سو سال قبل ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ راجگان راجور کے قبول اسلام کا زمانہ بہر حال بڈشاہ اور بابر کے درمیان گزرا ہے۔

صاحب اسلامک کلچر نے راجوری کے راجہ کا نام سندرسین لکھا ہے اور اس کی تخت نشینی کا سال ۱۴۵۰ء بتایا ہے۔ چونکہ راجہ جے سا کو ۱۴۶۳ء میں بادشاہ اپنے ہاتھ سے راجوری کا راج تلک دیتا ہے۔ اس لئے جے سا سندرسین کا فرزند یا اس کے قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ کیونکہ ۱۴۵۰ء اور ۱۴۶۳ء یہ دونوں سال بالکل قریب العہد ہیں۔

بڈشاہی عہد میں حقوق بیوگان

کرنل سرہیگ لکھتے ہیں۔ بڈشاہ کے عہد میں ہر فرقہ اور ہر شخص کو مذہبی آزادی کی نعمت جو اس سے قبل کشمیر میں مفقود تھی، حاصل تھی۔ بادشاہ نے اسی سلسلہ میں بیوگان کو بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیدی۔ کرنل سرہیگ نے ان الفاظ کی سند کیلئے گو کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن جس بادشاہ نے زچہ و بچہ کی آسائش کے لئے ممالک غیر سے قابلہ (دائیاں) منگوائی ہوں۔ جس نے ستی کی رسم کو کبھی دل سے پسند نہ کیا ہو اور پھر اس کو بھی بہ جبر نہیں۔ بلکہ عورت کی مرضی اور منشاء کے ماتحت رکھا ہو۔ جس نے ہندو قوم کے لئے جزیہ تک معاف کر دیا ہو۔ جس نے بہ جبر مسلمان ہونے والے ہندوؤں کو پھر ہندو دھرم میں آجانے کی اجازت دیدی ہو۔ کوئی تعجب نہیں اگر اس نے ہندو بیوگان کے مصائب کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی ہو۔

ممکن ہے اس زمانے میں مسلمان بیوگان کی بھی دوبارہ شادی نہ ہوتی ہو یا اس کا بہت کم راج ہو۔ اس لئے کہ کشمیر میں اسلامی سلطنت کے قیام کو ابھی سو سوا سو (۲۲) سال ہی کا عرصہ گذرا تھا۔ لیکن ہندو بیوگان میں دوبارہ شادی کا ان ایام

میں مطلق کوئی رواج نہیں تھا۔ ہندو بیوہ عورت ہو یا مسلمان بیوہ عورت۔ اس کو خاوند کے مرنے کے بعد اپنی بقیہ تمام زندگی جس مصیبت کے ساتھ کاٹنی پڑتی ہے۔ اس زمانے میں جب کہ مسلمانوں میں نکاح بیوگان کا عام راج ہے اور ہندوؤں کا ایک طبقہ بھی ان کے نکاح ثانی کو جائز سمجھ کر قدیم رسم رواج کو توڑ رہا ہے۔ شاید اس کا احساس بہت کم ہو سکے۔ لیکن نہ صرف زمانہ قدیم میں بلکہ موجودہ زمانہ سے صرف نصف صدی پیشتر بیوہ عورت خصوصاً ہندو بیوہ عورت کو میکے اور سسرال دونوں جگہ نحوست کا باعث سمجھا جاتا تھا۔

حواشی:

۱) ذوالچو کی اصلیت کے متعلق صاف طور پر کسی تاریخ سے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون تھا۔ اور کس خاندان سے تھا۔ وہ بادشاہ تھا یا کسی بادشاہ کی طرف سے کشمیر پر حملہ آور ہوا تھا۔ کشمیر کی تاریخیں اس کو تاتاری النسل بتاتی ہیں اور اس لحاظ سے وہ کشمیر کے لئے اپنے اجداد کی طرح چنگیز خان ثانی ثابت ہوتا ہے۔ لیکن بیرونی مورخ اس کے حسب نسب کے متعلق خاموش ہیں۔ صاحب تحقیقات اکبری صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ ''ذوالچو میر بخشی قندہار بود''۔ اس سے صرف اتنا ہی معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ قندہار کا حاکم تھا۔ یا فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس سے آگے صاحب طبقات لکھتے ہیں۔ وہ جمعیت عظیم کے ساتھ کشمیر آیا اور اس ولایت کو زیروزبر کر گیا۔ چنانچہ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ''و بہ جمعیت تمام برسر کشمیر آمدہ تمام آں ولایت را زیروزبر ساخت''۔ صاحب طبقات یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجہ سہد یو نے اپنی رعایا پر تشدد کر کے بہت سا روپیہ اکٹھا کیا اور اس ظالم کی خدمت میں بطور پیشکش بھیجا تا کہ یہ بلا دور ہی سے ٹل جائے۔ مگر جب روپیہ لیکر بھی اس پر کوئی اثر نہ رہا تو راجہ خود ہی کشمیر سے باہر چلا گیا۔ چنانچہ صاحب طبقات کے اصل الفاظ اس طرح ہیں۔ ''و راجہ سہد یو زر بسیار بر رعایا توجیہہ کردہ بہ جہت پیشکش ذوالچو فرستادہ۔ خود بگوشہ بدر رفت۔'' اس کے بعد مورخین کشمیر کا بیان ہے کہ راجہ کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا اور ذوالچو ملک میں قتل عام کر کے اور ہزارہا لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اور غلام بنا کر مراجعت کے دوران میں جب بالائے کوہ پہنچا تو شدت برف باری سے نہ خود بچ سکا اور نہ اس کے ہمراہی اور نہ اسیر اور نہ غلام! صاحب طبقات نے اس کی یا اس کے ہمراہیوں کی ہلاکت کا تو کوئی ذکر نہیں کیا۔ البتہ وہ لکھتے ہیں کہ اس نے کشمیر کو تباہ و برباد کیا اور شدت سرما کی وجہ سے وہ واپس چلا گیا۔ چنانچہ ان کے اصل الفاظ ہیں۔ ''ذوالچو بواسطہ کثرت سرما آں جا نتوانست بود و بہ قندھار بازگشت نمود''۔ پنڈت آنند کول بامزئی

اپنے جغرافیہ ریاست جموں وکشمیر میں لکھتے ہیں۔ کہ بمبہ قوم ذوالچو کے ہمراہ ہی کشمیر آتی تھی۔ مگر یہ درست نہیں۔ اس کی تفصیلات تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔

۲) ان کی کچھ کیفیت دربار بڈشاہی کے ملکی و مالی وادبی مصاحبوں کی فہرست میں دیکھئے۔

۳) پنڈت بیربر کاہچرو مصنف مختصر التواریخ کشمیر غیر مطبوعہ۔

۴) یاد رکھنا چاہئے کہ سلطان شمس الدین التمش سے لیکر بلکہ اس سے بھی قبل کے زمانہ سے محمد تغلق کے زمانے تک جو بڈشاہ اور اس کے باپ سلطان سکندر کا ہمعصر ہے۔ حکومت اسلامیہ کے بنیادی اصولوں میں جزیہ بھی شامل تھا۔ جو صرف ہندوؤں ہی سے لیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے سلطان محمد تغلق نے ہندوؤں کی دلجوئی کو محسوس کیا۔ اس نے رسم ستی کی سخت مخالفت کی اور اگر کوئی عورت ستی ہونا بھی چاہتی تو اس پر سخت پابندیاں عاید کیں۔ ہندوؤں کو اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز کیا اور مسلمان رعایا کی طرح ہندو رعایا کی بہتری و بہبودی کا ہمیشہ خیال رکھا۔ علمائے عصر اور مفتیاں وقت کا حکومت پر بڑا اثر تھا۔ جب سلطان محمد تغلق نے ہندوؤں کے ساتھ مراعات روا رکھیں اور مفتیوں اور قاضیوں کے فیصلوں پر نظر ثانی شروع کی اور ان کے کئی فیصلے جن میں جانبداری یا تعصب کی جھلک پائی جاتی تھی، مسترد کر دیئے۔ یا سلطان کے خوف سے مفتیوں نے خود ہی مقدمات میں اپنی رائے بدلنی شروع کر دی تو علماء اور مفتیوں نے سلطان کو برا کہنا شرع کیا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو بڈشاہ نے محسوس کیا اور عملاً کر دکھایا اور پھر بہت مدت کے بعد جس کو اکبر اعظم نے سیاست وقتی کے تقاضہ سے بہت بڑی اہمیت دی۔

۵) مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

۶) پنڈت بیربر کاہچرو۔

۷) تاریخ ہند جلد سوم صفحہ ۲۸۱ بزبان انگریزی مصنفہ سرولزلی ہیگ۔

۸۔۹) فتحیات کبرویہ غیر مطبوعہ۔

۱۰) تاریخ کشمیر اردو قلمی مصنفہ خواجہ حسن ملک ومکمل تاریک کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

(۱۱ فتحیات کبرویہ قلمی صفحہ ۳۲۲ و گلزار کشمیر مصنفہ دیوان کرپارام۔

(۱۲ تاریخ حسن حصہ اوّل۔

(۱۳ پنجاہ و چہار (چوون ۵۴) سے مراد ۱۴۵۴ سال کشمیری ہے۔ مفصل حالات کیلئے دیکھو ضمیمہ اسنہ لوکک وسنہ کشمیری۔

(۱۴ کرنل سرہیگ نے اپنی تاریخ ہند جلد سوم کے صفحہ ۲۸۲ پر لکھا ہے۔ بڈشاہی نے فارسی زبان کو دفتری زبان بنایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڈشاہ سے پہلے ہی کشمیر میں یہ زبان دفتری ہو چکی تھی۔

(۱۵ ہر برکہ ور بہ عہد درجہ کا بے نگر بانی کوت در کرہ

(۱۶ شارٹ ہسٹری آف کشمیر صفحہ ۲۶ و ۲۷ مطبوعہ ۱۹۲۸ء مصنفہ ہواشہ لال کول بی اے۔

(۱۷ بمبئی ایڈیشن شلوک ۱۳۳۳ بہ حوالہ راج ترنگنی اردو ترجمہ۔

(۱۸ طبقات اکبری۔

(۱۹ یہ پل آج بھی کسی نہ کسی حالت میں موجود ہے۔

(۲۰ یہ واقعہ زونراج نے لکھا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ رانا سوہا کس ملک کا راجہ تھا۔

(۲۱ کشمیر کی طرح اس قسم کی رسم مصر میں بھی دریائے نیل کی پیدائش اور طغیانیہ اور اس کی برکات کے متعلق زمانہ قدیم سے منائی جاتی ہے۔ چنانچہ ۲۴ راگست ۱۹۳۸ء کو بھی قاہرہ دارالحکومت مصر میں یہ رسم عید کی شکل میں منائی گئی۔ حکومت مصر کے کل دفاتر اور ادارے اس دن بند تھے۔ ملک میں عام تعطیل تھی۔ لاکھوں آدمی دریائے نیل کے کنارے ایک وسیع ساحل پر جمع تھے۔ جن میں ہر فرقہ کے لوگ شامل تھے۔ گورنر قاہرہ بادشاہ مصر کے قائم مقام کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ ایک جہاز جھنڈیوں اور بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا اور اس کا نام عروس نیل رکھا گیا۔ ساڑھے دس بجے رات تک جلسہ رہا۔ فوج جو اس جموقعہ پر آئی۔ دس ہزار تھی۔ نیل زندہ باد، بادشاہ فاروق زندہ باد، اور مصری فوج زندہ باد کے فلک شگاف نعرے دلوں میں جذبات وطنیت پیدا کر رہے تھے۔ گورنر کے آنے پر فوج نے سلامی دی۔ توپیں داغی گئیں۔ آتشبازی چھوڑی گئی۔ رقص وسرُ د کی

محفل گرم ہوئی۔ اور گورنر کی صدارت میں خطبات پڑھے گئے۔ روشنی کی کثرت نے رات کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔

۲۲) کلوت علاقہ کلو کا قدیم نام ہے۔ جو آجکل کانگڑہ میں واقع ہے۔ کلو اور لاحول اور اس کے ملحقہ علاقہ جات کشمیر کے راجگان ہنود کے زمانہ میں کشمیر کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ بڈشاہ نے بھی ان کو فتح کیا۔ اور چونکہ یہ مقامات بھٹوں کی سرحد پر واقع تھے۔ بلکہ یہیں سے بھٹہ آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ اس لئے بھٹہ قوم کے سرداروں نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔

۲۳) راقم نے بھی تاریخ اقوام کشمیر اور تاریخ اقوام پونچھ میں راجگان راجور اور توزک جہانگیری کی سند پر راجگان راجور کے قبول اسلام کا زمانہ بڈشاہ سے بہت پہلے بتایا ہے۔ زونراج کی تاریخ ان کتابوں کی تصنیف کے بعد دستیاب ہوئی ہے۔

۲۴) بڈشاہ ۸۲۳ھ میں تخت کشمیر پر بیٹھا۔ اس سے صرف ۴۲ سال پیشتر ۷۸۱ھ میں جب کہ حضرت سید علی ہمدانیؒ کشمیر میں تشریف لائے۔ تو سلطان قطب الدین کشمیر کا بادشاہ تھا۔ اور اس زمانہ میں کشمیر میں اسلام کا یہ حال تھا کہ بادشاہ قطب الدین کے عقد میں دو حقیقی بہنیں تھیں حالانکہ اسلام دو سگی بہنوں کو بیک وقت کسی مسلمان کے عقد میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جب حضرت سید علی ہمدانیؒ کو اس بات کا علم ہوا۔ تو انہوں نے بادشاہ کو شریعت اسلامیہ کی رُو سے ایک کو طلاق دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے ان کے مشورہ پر عمل کر کے اپنی دونوں بیگموں میں سے جو سگی بہنیں تھیں ایک کو طلاق دیدیا۔

اکیسواں باب

پھولوں کا تیوہار

اکبر شاہ ثانی خلف شاہ عالم ثانی کے بیٹے مرزا جہانگیر کو جب ۱۸۰۹ء میں رزیڈنٹ دہلی مسٹر سٹین پر گولی چلانے کی وجہ سے الہ آباد میں انگریزوں نے نظر بند کر دیا۔ تو شاہزادہ کی ماں نواب ممتاز محل نے یہ منت مانی کہ جب شاہزادہ رہا ہو کر آئے گا تو وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر پھولوں کو چھپر کھٹ اور غلاف چڑھائے گی۔ چنانچہ جب شہزادہ رہا ہو کر آیا تو بادشاہ بیگم نے اپنی منت پوری کی۔ اس موقع پر اتنی خلقت جمع ہو گئی کہ بڑا بھاری میلہ لگ گیا۔ اس کے بعد اکبر شاہ یہاں ہر برس ساون کے مہینہ میں آتا رہا۔ اس کی جیب خاص سے دوسو روپیہ پھول والوں کو پنکھے وغیرہ کی تیاری کے لئے ملا کرتا تھا۔ اس کے فرزند ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں بھی یہ میلہ برابر قائم رہا۔ بلکہ اس زمانہ سے اب تک یہ میلہ ہر برس قطب صاحب میں دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ اور اسے ''پھول والوں کی سیر'' کا میلہ کہتے ہیں۔ دہلی میں اس میلہ کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہے۔ اس موقعہ پر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر خوش الحان قوال بھی

آ جاتے ہیں۔ جس سے رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔

اس (ا) سے صدیوں پیشتر اس قسم کا ایک میلہ کشمیر میں بھی ہوتا تھا۔ جسے ''پھولوں کا تہوار'' کہتے تھے۔ اس تیوہار پر شگوفہ پھوٹنے کا نظارہ ہی کیا جاتا تھا۔ یہ موسم بہار کے آغاز میں ہوتا تھا۔ اسے ''جشن نوروز'' اور ''جشن شگوفہ'' کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ان دنوں کی یادگار ہے جب کشمیری تہذیب و تمدن پورے اوج پر تھے۔ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی یہ جشن کشمیریوں کے دلوں کو برماتا اور ان میں زندگی اور جوش کی لہر پیدا کرتا ہے۔ ہر پیشانی مسرور نظر آتی ہے اور ہر غنچہ دل نسیم بہجت سے شگفتہ دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ تقریب عیش و طرب ہے جس کے طغیان ابتہاج اور طوفانِ لذّات میں باشندگان کشمیر ڈوب جاتے ہیں۔

مارچ کا مہینہ شروع ہوتے ہی جاڑے کی استبدادی حکومت میں اضمحلال ہونے لگتا ہے۔ اس وقت نیچر گہری نیند سے بیدار ہو کر انگڑائیاں لیتی، فلک بوس پہاڑوں سے برف ڈھلنی شروع ہوتی، دریاؤں کے منجمد پانی حرکت میں آتے۔ مردہ زمین میں از سرِ نو زندگی کے آثار نمایاں ہوتے اور چھوٹے چھوٹے پودے اپنی برفانی قبروں سے سر باہر نکالتے ہیں۔

سورج گرمجوشی کا اظہار کرتا ہے۔ چاند اپنی چاندنی سے اناج میں مٹھاس ڈالتا اور پھولوں میں رنگ بھرتا ہے۔ تمام کوہ و دشت سبزے سے ڈھک جاتے۔ درخت غنچہ بار ہوتے۔ ان کی نازک نازک شاخیں دھانی کونپلوں کے زیور اور رنگا رنگ کے پھولوں اور شگوفوں کے بوجھ سے لچکنے لگتی ہیں۔ پھر جوں جوں دن گزرتے ہیں۔ چاروں کھونٹ خوشحالی چھا جاتی ہے۔ جدھر نظر اٹھاؤ۔ پھول ہی پھول دکھائی

دیتے ہیں۔ مکانوں کی چھتیں، سڑک کی روشیں، باغوں کے جنگلے۔ غرضیکہ ہر مقام عروس بہار بن جاتا ہے۔ موجِ گل کی شدت سبزے کو مغلوب رنگ کر لیتی ہے اور تا بہ حدنگاہ پھولوں کی رنگینی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

ندی نالوں اور جھیلوں کا پانی بھی خشک لذت پیش کرنا اور آب حیات کا کام دیتا ہے۔ ان کے کنارے پانی سے لبریز چاولوں کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں ایسی معلوم ہوتی ہیں، جیسے کسی باکمال مصور نے اپنی تصویر میں لاتعداد خطوط کھینچ کر مہارت فن کا مظاہرہ کیا ہو۔ سطح آب پر مست تعطر غنچے اس طرح پڑے لوٹتے ہیں گویا کسی پری کا ہار ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ شگوفے ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر پھولوں کا مینہ برساتے اور زمین کو گل پوش کرتے ہیں۔ شمشاد کے بلند و بالا درختوں کے سفید سفید پھول روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں ادھر اُدھر اڑتے اور باغوں میں سبزے کا فرش مخملی آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے۔ نیلے نیلے، لال، گلابی، کاسنی، بنفشی، سفید اور نارنجی رنگ کے پھولوں کی کیاریاں ہر طرف لذت وانبساط بکھیرتی۔ نگہت پھولوں کے اندر سے انگڑائیاں لیتی ہوئی نکلتی۔ ٹھنڈی نسیم رندانہ وضع کے ساتھ بید مجنوں کی شاخوں سے کھیلتی اور اسے سرتاپا لرزش بنا دیتی ہے۔

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوائے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

فضا مہک جاتی ہے۔ چلتے پھرتے خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ع اڑتی ہے شراب پھول بن کر۔

اس کے ساتھ ہی خوبصورت قوس وقزح کی سی رنگین تتلیاں ایک مستقل

اضطراب کے ساتھ ہوا میں رقص کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ خوش نما چڑیاں اور خوش آواز پرندے اپنے وطن میں واپس آ کر بہار کے گیت گاتے اور بھونرا پھولوں کے گرد پروانہ وار جھومتا ہے۔

جب فطرت کے یہ نئے نئے روپ اور البیلے سنگھار انسانی جذبات میں طلاطم برپا کرتے اور افقی مناظر نظر کے لئے بالکل نا قابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ تو سیر و تفریح کے شوقین باہر نکل آتے ہیں اور باغات کے قریب جھیل کا تمام ساحل شکاروں سے بھر جاتا ہے۔ لوگ ملکہ بہار کی آمد کے انتظار میں سارا سارا دن باغوں میں گزارتے۔ پھولوں سے کھیلتے اور ان کی خوش آبی سے دماغوں کو تر و تازہ کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا قدرت خدا تمام سرما ''رتی'' اور ''کاما'' کی سیر و تفریح کے لئے باغات کو شاداب کرنے میں مشغول رہی ہے۔ کیسے باغات؟ جہاں کے زہریلے کیڑے بھی غیر تکلیف دہ اور جہاں کے موسیقی نواز پرند سیاحوں کو گا کر خوش آمدید کہتے ہیں۔

اگرچہ کشمیر میں پھولوں کے عظیم الشان تہوار کی سابقہ شان و شوکت تو اب نظر نہیں آتی۔ تاہم کشمیر کے زندہ دل لوگ شگوفہ کے موسم میں ''پھول نہیں تو پنکھڑی ہی سہی'' کے مصداق اب بھی اپنا دل خوش کر لیتے ہیں۔

بادشاہ کی روانگی نج بہاڑہ کو

بڈشاہ کے عہد میں اس تہوار کی رونق کا کچھ اور ہی عالم تھا۔ ہم یہاں شری ور

کی زینہ راج ترنگنی سے کشمیر میں پھولوں کے تہوار کی کچھ کیفیت بیان کرتے ہیں۔

موسم بہار (۲) بادشاہ نے اپنے فرزند ادہم خان کے ساتھ لڑائی ہی میں گزار دیا۔ اب گرمی کے دن آرہے تھے۔ چیت کے مہینے میں پھولوں کا تہوار بھی منایا جانے والا تھا۔ بادشاہ اس تہوار کی رونق بڑھانے کے لئے ولی عہد کو ہمراہ لے کر شاہی کشتی پر سوار ہوا۔ شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کی کشتی کے آگے پیچھے وزراء امراء کی کشتیوں کی قطاریں وتستہ کے صاف وہموار سینہ پر اس طرح دوڑ رہی تھیں۔ جیسے دودھ کی سڑک پر راجہ اندر کی رتھیں جارہی ہوں۔

بادشاہ کشتی پر جھنڈا لہرارہا تھا۔ رات کو بادشاہ نے اونتی پورہ میں قیام کیا۔ صبح پھر ترتیب ونظام کے ساتھ کشتیاں مدوراج (مراز) کی طرف روانہ ہوئیں۔ وجیشور یعنی بج بہاڑہ اور دیگر مقامات پر بادشاہ کو ناچ رنگ اور رقص وسرود کے تماشے جو اس تہوار کے موقعہ پر لوگوں کی فرحت کا باعث تھے نظر آئے۔

بادشاہ کی آخری منزل بج بہاڑہ ہی تھی۔ اس لئے وہ یہیں اتر پڑا۔ جس مکان میں بادشاہ نے قیام کیا۔ وہ اتنا وسیع تھا کہ چند وزراء اور اس کا ولی عہد بھی وہیں قیام پذیر ہوگئے۔ باقی وزراء اور درباری لوگوں کے لئے خیمے لگائے گئے اور چند ہی گھنٹوں میں بج بہاڑہ ایک سجی سجائی دُلہن کی طرح آراستہ ہوگیا۔

بادشاہ کی قیام گاہ یاسمین اور دیگر کئی قسم کے پھولوں سے سجائی گئی تھی۔ دوسرے وزراء اور درباریوں کے خیمے اور مکانات بھی گلہائے رنگارنگ سے زینت چمن کیا رشک چمن نظر آرہے تھے۔

کمالات موسیقی کا شاہی دربار

بادشاہ نے اس تہوار کے لئے جس کا تعلق صرف کشمیری پنڈتوں کے ساتھ ہی تھا۔ ایک دربار منعقد کیا۔ دربار کے چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ چونکہ اس دربار کا سیاسیات یا ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک تہوار کا جشن تھا۔ اس لئے بادشاہ نے اپنے درباری گویوں اور فن موسیقی کے ماہرین کو اپنے کمالات دکھانے کا حکم دیا۔ پہلے چھوتی لڑکیاں آئیں۔ جو خوبصورتی کے ساتھ خوش الحانی .کے جوہر بھی رکھتی تھیں۔ان کے کشمیری گیت اہل دربار کو مسحور کر رہے تھے۔ شریور لکھتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے جنت کی حوریں دنیا کی اس جنت پر آکر گا رہی ہیں۔

تارا نام ایک ماہر موسیقی نے ناراج (Naracha) قسم کا گانا بادشاہ کو سنایا۔ اُت سوا (Utsawa) نام ایک عورت نے جو کشمیر کی مشہور گانے والیوں میں تھی۔ اپنے لحن داؤدی سے کشمیری زبان میں وہ گیت گائے جو اپنے مضامین کے لحاظ سے بھی بڑے موثر تھے اور جس طرز سے وہ ادا کئے گئے تھے وہ بھی دلوں کی موہ لینے والی تھی۔

سجایا (Sajaya) نے اپنے دلفریب نغموں سے اپنے استاد عبدالقادر کا نام روشن کردیا۔ ملا جادق خراسانی نے مگرمچھ کے چمڑے کے طنبور پر بادشاہ کو اپنا گانا سنایا۔ ملا جمال (۳) نے جو ملیچھ زبان میں اعلیٰ قسم کا گانا جانتا تھا۔ بادشاہ کو اس موقعہ پر بہت خوش کیا۔ اپنے متعلق شریور لکھتا ہے کہ میں تمام راگ اور راگنیوں سے پورے

طور پر آگاہ ہوں۔ میں نے بھی بادشاہ کو کدو کے بنائے ہوئے طنبورے پر گا کر دل شاد کیا۔ حافران (۴) اور دوسرے درباری گویئے میرے ساتھ مل کر نہایت مشکل طرزوں میں جو تُرشک (ترکی) کہلاتی تھیں۔ گاتے رہے۔ ہم نے بارہ مختلف قسم کی طرزوں میں بادشاہ کو گانے سنائے اور جب تاروں کے ذریعہ صدائیں گونجتی تھیں تو لوگ بن پیئے مست نظر آتے تھے۔

آتش بازی کی کیفیت

دن کو عام تفریحات کے علاوہ رات کو مختلف قسم کی آتش بازی چلائی گئی۔ جو کوئلہ، گندھک، شورہ وغیرہ سے بنائی جاتی تھی۔ بادشاہ کو اس فن سے بھی پوری آگاہی تھی۔ حبیب آتشباز نے اس کی ہدایات کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی آتش بازی تیار کی تھی۔ شریور لکھتا ہے۔ شورہ خالی نالیوں کے اندر بھر دیا جاتا تھا۔ پھر اس کو آگ لگا دی جاتی تھی اور اس آگ سے جو چنگارے نکلتے تھے وہ ایک ایسا درخت معلوم ہوتے تھے جس کے پتے سنہری شعاعوں کی شکل میں نظر آتے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔ ایک نل میں شورہ بھر دیا گیا۔ اور اس نل کو رسی کے ساتھ باندھ کر شورہ کو آگ لگا دی گئی۔ آگ لگنے کی دیر تھی کہ نل خود بخود اس شورہ کے زور سے اتنی دور تک جہاں تک وہ رسی لمبی تھی کشش مقناطیس کی طرح روانہ ہونے لگا اور جب اس رسی کو واپس کھینچا گیا تو وہ نل جو شورہ سے بھرا ہوا تھا اسی طرح شرر باریاں کرتا، شعلے چھوڑتا اور چنگاریاں نکالتا واپس آ گیا۔

دربار شبینہ میں آتشیں ناچ

آتش بازی کے بعد رات کو بھی دربار منعقد ہوا۔اس میں رقص وسرود کی محفل گرم ہوئی اور آتشیں ناچ نے تو قیامت پیدا کر دی۔ شریور اس ناچ کی تعریف میں لکھتا ہے۔شورہ سے بھرے ہوئے نل ناچنے اور گانے والی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے ہاتھوں میں دیئے جاتے تھے اور جب شورہ کو آگ لگا دی جاتی تھی تو وہ ناچنا اور گانا شروع کر دیتی تھیں۔ اس ترکیب سے ان کے ہاتھوں سے چنگارے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بادشاہ اور اس کے وزراء اور دیگر لوگ اس نظارہ سے بہت خوش ہوتے تھے۔ یہ اس قسم کا آتشیں ناچ تھا کہ بادشاہ سے قبل اور بادشاہ کے بعد کشمیر کیا کسی اور ملک میں بھی نہیں سنا گیا۔

بادشاہ نے گانے والوں اور گانے والیوں سب کو ان کی حیثیت کے موافق انعام واکرام سے مالا مال کیا۔اسی تقریب پر اس نے حکم دیا کہ طنبور اور رباؤ (رُباب) اور موسیقی کے دیگر آلات سونے چاندی اور جواہرات سے مزّین کئے جائیں۔

اس موقعہ پر شریور لکھتا ہے۔ہمیں ایسا بادشاہ کہاں ملیگا۔ جو ایجادات میں بھی ماہر ہے۔موسیقی کا بھی قدردان ہے اور فصاحت و بلاغت جس کے گھر کی ادنیٰ کنیز ہے۔کتابیں تصنیف کرتا ہے اور مقدس کتابوں کے مضامین شوق سے سننے کا عادی ہے اور ہمہ صفت موصوف ہے۔

ولی عہد حاجی خان کو شاہی انعام

شریور لکھتا ہے جس وسیع مکان میں بادشاہ اور ولی عہد ٹھہرے ہوئے تھے۔

اسی مکان میں بادشاہ نے ولی عہد سے کچھ ایسی فلسفیانہ باتیں کیں۔ جن کے جواب سے اس کو مسرت حاصل ہوئی۔ بادشاہ نے یہیں اپنے فرزند دوم یعنی ولی عہد کو ایک خنجر جو سونے سے مرصع تھا۔ بطور انعام عطا کیا۔

چونکہ دربار میں کچھ لوگ بادشاہ کے بڑے مگر شکست خوردہ فرزند ادہم خان کے حامی تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے ان لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب تخت کشمیر حاجی خان کے سوا اس کے کسی اور فرزند کا حق نہیں ہے۔ اس کو خنجر مرصع بطور اظہار محبت عطا فرمایا۔

اہل دربار اور عوام پر حاجی خان کا اثر و اقتدار قائم کرنے کے لئے بڑے فرزند کی جلاوطنی کے بعد بادشاہ اس کو اپنے تمام کاموں میں شریک رکھتا تھا۔ کوئی دربار سیاسی یا تفریحی یا مذہبی ایسا نہ ہوتا تھا جس میں حاجی خان شریک نہ ہو۔ بلکہ ہر سفر اور ہر سیر و سیاحت میں بادشاہ حاجی خان کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

حواشی:

۱) ماخوذ از مضمون مولانا محمد عبداللہ قریشی بی اے بعنوان "کشمیر میں دعوت پھولوں کی۔"

۲) یہ ان ایام کا ذکر ہے۔ جب ۸۶۳ھ کی لڑائی کے بعد بادشاہ نے ادہم خان کو جلاوطن کرکے حاجی خان کو خلعت ولیعہدی دیدیا تھا۔

۳) شریور ہر غیر کشمیری اور غیر سنسکرت زبان کو ملیچھ زبان اور ہر غیر ہندو کو ملیچھ تصور کرتا ہے۔

۴) شاید جعفر نام ہو۔

بائیسواں باب

علم موسیقی اور بڈشاہ

بڈشاہ کی موسیقی سے دلدادگی

بڈشاہ کے دربار میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے صاحب کمال موجود تھے۔ اس کی فیاضی وسخاوت اور اس کی قدردانیوں اور ہنر پروریوں کی شہرت سن کر ہندوستان کے علاوہ خراسان وبغداد تک سے ارباب کمال کھنچے چلے آتے تھے۔

مشائخ کبار اور علمائے کرام بھی اس کے دربار میں موجود تھے۔ جوگیان باصفا اور صوفیان بے ریا بھی اسکے دربار کی زینت تھے۔ شاعران جادو بیان بھی بزم شاہی کی رونق تھے۔ اور صنائع وکاریگر اور دیگر اہل حرفت نے بھی اس کی سرپرستیوں کے دامن میں پرورش پاکر اپنے کمالات سے اس کی شہرت کو چار چاند لگا رکھے تھے۔ انہی میں علم موسیقی کے ماہر بھی تھے اور بڈشاہ چونکہ علم موسیقی کا شائق بلکہ کئی سازوں کا موجد تھا۔ اس لئے دیگر اہل علوم وفنون کے ساتھ علم موسیقی کے جاننے والوں کی بھی بڑی قدر ہوتی تھی۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں کہ سلطان زین العابدین ہر قسم کے علوم وفنون کا سرپرست تھا۔ علم موسیقی میں وہ بڑا ماہر تھا۔ اس کی سخاوتوں کے

قصے سن سن کر اطراف واکناف سے کئی قسم کے باکمال کشمیر میں جمع ہو گئے تھے (۱)

غرض ۔

ہر طرف سے آتے تھے کچھ کچھ کے کیا کیا اہل ذوق
اہل علم اہل ہُنر اور اہل تقویٰ اہل دیں

بادشاہ موسیقی کا اس قدر دلدادہ اور اس سے اس قدر مسحور ہو چکا تھا کہ جب کبھی وہ مطربیوں سے خوش ہوتا تو ان کو بیش قیمت انعام واکرام دیتا اور ان میں جو زیادہ ہی ماہر ہوتے ان کو درباری گویئے مقرر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ لکھا ہے کہ مطربیوں سے خوش ہو کر اس نے کئی مرتبہ ان کے آلات موسیقی مثلاً بین ورباب وغیرہ سونے سے آراستہ کرا دیئے۔ اور ان کو زر سے لبریز کرا دیا (۲) جیسا کہ پھولوں کے تہوار کے سلسلہ میں گزشتہ باب میں ذکر ہو چکا ہے۔

صاحب وجیز التواریخ نے بھی بادشاہ کی سرود افزائی کا ذیل کے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ سلطان کو ساز و سرود سے بھی بہت رغبت تھی۔ وہ اس فن کو خوب جانتا اور راگ کی ماہیئت کو خوب سمجھتا تھا۔ ملاّ عود اور ملاّ جمیل کہ علم موسیقی میں صاحب تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے بانی تھے۔ اس نے خراسان سے بلوائے اور ان کو انعامات سے سرفراز کیا۔ (۳)

بڈشاہ کے علم موسیقی میں ماہر ہونے کا قریباً تمام مصنفین و مورخین نے ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے کئی آلات خود بھی ایجاد کئے تھے۔ لیکن ایک آلہ یا ساز کا ذکر صاحب طبقات نے ذیل کے الفاظ میں کیا ہے۔ بادشاہ نے گانے کا ایک ایسا آلہ تجویز کیا تھا کہ "یک نقش رابہ دوازدہ مقام ادامے نمود"۔ یہ ساز آج عنقا ہے۔

بادشاہ کی قدردانیوں کا ذکر کرتے ہوئے صاحب طبقات لکھتے ہیں۔ سلطان کے حکم سے رباب، بین اور دیگر آلات سرود مرصع بہ زر کیے جاتے تھے۔

کشمیر میں موسیقی کے مدارس

ابوالفضل کے قول کے مطابق ایرانی وتورانی راگی بھی اس کے دربار میں موجود تھے۔ ان میں سے بعض نے کشمیر میں موسیقی کے مدارس جاری کیے اور جب انہوں نے بادشاہ کے حضور میں ان مدارس کی سرپرستی کی درخواستیں کیں تو بادشاہ نے جو فقہ وحدیث اور تفسیر کے مدارس کا بھی سرپرست اور سنسکرت زبان کے پاٹ شالاؤں کا بھی مربی تھا اور فارسی زبان کی درسگاہوں کا بھی معاون تھا۔ فنون لطیفہ کی اشاعت کا خیال رکھتے ہوئے موسیقی کے مدارس کی بھی سرپرستی وامداد قبول فرمائی۔

ان مدارس میں سے چند ایک سرینگر ہی میں تھے اور گو ابوالفضل اور صاحب تاریخ فرشتہ نے ان کا محل وقوع نہیں بتایا۔ تاہم قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ مدارس نوشہرہ کے قرب وجوار میں ہونگے۔ جو بڈشاہ کا دارالحکومت تھا۔ اور جس کو بدشاہ نے عالیشان ایوانوں اور نہروں اور باغوں کے اجراء سے نمونہ بہشت بنا رکھا تھا۔

ایرانی راگنیاں جو کشمیر کے سازندوں اور مطربوں نے اختیار کر لیں۔ حسب ذیل بتائی جاتی ہیں۔ ساگا راست، کشمیر راست، چراغ، عراق، نوا، ریحائی، شاہ نواز، نوروز، نے ریز، اور زنگولہ۔ (۴)

کشمیری آلات موسیقی

کشمیری سازندے طوطی شہنائی بجانے میں بڑے ماہر تھے۔لیکن ان کے بڑے بڑے آلات موسیقی جو بڈشاہ کے زمانے سے اب تک چلے آتے ہیں۔حسب ذیل ہیں۔گیچگ ، جو ہندی سارنگی سے مشابہت رکھتا ہے۔لیکن اس سے ذرا بڑا ہے۔ اسے ایک کمان سے بجاتے ہیں۔ستار جو ہندی ستار سے چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ نہایت نفیس ساز ہے اور جب بجایا جاتا ہے تو چنگ کی سی آواز دیتا ہے۔

دربار بڈشاہی کے نامور مغنی

پنجاب، کشمیر اور ہندوستان کے اکثر موسیقی دان نہ صرف اپنے ادنیٰ کیریکٹر سے موسیقی کو بدنام کررہے ہیں۔ بلکہ اہل علم نہ ہونے کی وجہ سے معزز طبقوں میں وہ قابل وقعت نظروں سے بھی نہیں دیکھے جاتے۔گزشتہ زمانے کے لوگ اس فن کو ایک علم اور فن کے طور پر حاصل کیا کرتے اور اس کی تکمیل کے بعد اس پر اعلیٰ اعلیٰ کتابیں لکھا کرتے۔جن سے نہ صرف ان کی قابلیتوں کا اظہار ہوتا تھا بلکہ فنون لطیفہ کے شوقین ان کتابوں سے مستفیض ہوتے تھے۔

بڈشاہ خود اس علم میں صاحب کمال تھا۔اس نے بازاری گویوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ بلکہ اس فن کے ایسے ایسے صاحب کمال بلوائے جو اس زمانہ میں اپنی

نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان کو دربار میں دوسرے صاحبان علوم وفنون کے برابر جگہ دی۔ چند نامور موسیقی دان جو اس کے دربار کی زینت تھے۔ حسب ذیل ہیں۔

یودی بٹ

کشمیری پنڈت تھا۔ خدا نے اسے عجیب دماغ دیا تھا۔ ذہن اس قیامت کا رسا اور حافظ اس بلا کر تیز تھا کہ شاہنامہ فارسی جس کو فردوسی نے تیس سال میں لکھا تھا۔ اسے از بر یاد تھا۔ سلطان کو شاہنامے سے عشق تھا۔ جب یودی بٹ اپنی مستانہ لے میں اسے پڑھتا تھا تو بادشاہ پر ایک وجدائی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی ایک کتاب علم موسیقی میں زین نام ہے۔ جو نہایت معتبر سمجھی جاتی ہے۔ بادشاہ یودی بٹ کی بڑی قدر کرتا تھا۔

ملا عُود

خراسانی النسل تھا۔ اور اس فن کے صاحب کمال خواجہ عبدالقادر کا عزیز اور مشہور شاگرد تھا۔ عود (بربط) بجانے میں بے مثل تھا اور اسی رعایت سے اس کا نام ملا عود مشہور ہو گیا تھا۔ بادشاہ کی قدردانیوں کی شہرت سن کر خراسان سے کشمیر آیا۔ لکھا ہے کہ جب یہ عود بجاتا تھا تو سامعین نقش بہ دیوار ہو جاتے تھے۔ جب یہ بادشاہ کے دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے جو ہر فن اور ہر علم کا قدردان تھا اس کو اپنے دامن دولت میں جگہ دے کر فکر روزگار سے بے نیاز کر دیا۔ صاحب طبقات اکبری نے بھی ملا عود کا ذکر کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ عود اس غضب کا بجاتا تھا کہ محفل مدہوش ہو جاتی تھی۔ بادشاہ نے بارہا اس کو اپنی نوازشوں سے نوازا۔

ملّا جمیل

بڈشاہ کے چرچے ہندوستان سے نکل کر ایران تک جا پہنچے تھے۔ جب خراسان میں یہ خبر پہنچی کہ کشمیر کا بادشاہ اکثر سازوں عود، رباب، طنبور وغیرہ کو طلائے خالص سے بڑھ کر جواہرات سے مرصع کرتا ہے اور سازندوں کی ایسی قدر کرتا ہے۔ کہ ان کو شام غربت کی خزاں میں صبح وطن کی بہاریں فراموش ہو جاتی ہیں۔ تو بہت سے صاحبان کمال نے اپنی آشفتہ حالی کو دور کرنے کے لئے کشمیر کا رُخ کیا۔ ملا جمیل بھی جو علم موسیقی کا ماہر ہونے کے علاوہ بزلہ سنج اور شاعر بے بدل تھا۔ انہی میں سے ایک تھا۔ اس کی خوش الحانی وخوش خوانی اور اس کے خوش رنگ کلام سے تمام دربار خوش رہتا تھا۔ سلطان اس پر بڑا مہربان تھا اور دل کھول کر اسے انعام دیا کرتا تھا۔

چنانچہ صاحب سیر المتاخرین جلد اوّل میں لکھتے ہیں۔ ''ملا جمیل سلطان ابوسعید مرزا بادشاہ خرسان کے دربار کی زینت تھے۔ جب اس نے سنا کہ بادشاہ کشمیر کو بھی علم موسیقی میں دسترس ہے۔ تو اس نے بطور تحفہ ملا جمیل کو معہ اور تحائف کے بڈشاہی دربار میں بھجوادیا۔''

مصنف تاریخ حسن بھی ملا جمیل کے متعلق لکھتا ہے۔'' در سخندانی وخوش خوانی لاثانی بود وخواندگی ہائے خوب در مجلس سلطان لے کردو سلطان رارقتے تمام وست داد وردصلہ آں چنداں زربہ ملا جمیل مے بخشید کہ شرح آں مقدور نیست ونقش ہائے ملا جمیل درکشمیر مشہور راست''۔

سوم پنڈت

بڈشاہ کے اس نامور درباری کا ذکر اس کے درباریوں کے ذیل میں آئیگا۔

یہاں اس کا صرف اس قدر ذکر کیا جاتا ہے جو علم موسیقی سے تعلق رکھتا ہے۔ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ اس نے بادشاہ کے لئے ایک نئی کتاب مانک علم موسیقی پر لکھی جسے بادشاہ نے اپنے نام پر معنون کرنا منظور فرما کر اس کی عزت افزائی فرمائی۔ صاحب اسلامک کلچران کشمیر لکھتے ہیں۔ سوم علم موسیقی کے ماہر ہونے کی وجہ سے بھی بادشاہ کا نہایت منظور نظر تھا۔

کشمیری مطرب دربار اکبری میں

اکبر اعظم جو بڈشاہ ہی کا ایک نمونہ تھا۔ دیگر اہل کمال کی طرح مغنیوں کا بھی بڑا مربی تھا۔ یہ بڈشاہ سے قریباً سو سال بعد ہوا ہے۔ اس زمانہ میں بھی کشمیری مغنی اپنے کمال کی وجہ سے اتنی شہرت رکھتے تھے کہ اکبر جیسے عظیم الشان بادشاہ کے دربار میں بھی ہندی، ایرانی اور تورانی اور تان سین جیسے صاحب کمال جس نے علم موسیقی میں حیات تازہ پیدا کر دی تھی مغنیوں کے پہلو بہ پہلو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اکبر کے زمانے میں چونکہ ہندی مغنیوں کی کثرت تھی۔ ان کے فیض صحبت سے کشمیری مغنی بھی متاثر ہوئے اور جب یہ وطن میں واپس آئے تو ان کے ساتھ ہی ہندوستانی راگنیوں نے وادی کشمیر میں قدم رکھنا شروع کیا۔

جس طرح کشمیری زبان حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ جدید سانچہ میں ڈھل رہی اور نئے نئے الفاظ قبول کر رہی تھی۔ اسی طرح اکبر کے زمانے میں کشمیری موسیقی ایرانی و ہندی موسیقی کے اشتراک سے ایک جدید قالب اختیار کر چکی تھی۔

موجودہ کشمیری موسیقی

آج کشمیری راگ سارے ہندوستان میں موسیقی کے لئے باعث توہین سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ہندوستان میں مثل مشہور ہے کہ راگ ہندوستان میں پیدا ہوا۔ پنجاب میں یہ پروان چڑھا اور کشمیر میں جا کر دفن ہو گیا۔ اور یہ اعتراض اور نکتہ چینی وہ لوگ کرتے ہیں۔ جن کے اہل وطن بادشاہ کشمیر کے دربار میں خالی دامان لے کر آتے تھے۔ اور جب واپس جاتے تھے تو کامیابیوں کا ایک خزانہ ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے تھے جو بادشاہ کشمیر کے دامن دولت سے لپٹ کر یہیں کے ہو رہتے تھے۔ اور کہتے تھے۔

کس طرح جائے ترا در چھوڑ کر جائے کہاں
فوقؔ وابستہ ہے تیرے دامن دولت کے ساتھ

جس ملک کی اپنی دولت چھن جائے۔ اس کا اخلاق اور تمدن سب بدل جاتا ہے۔ بلکہ بگڑ جاتا ہے۔ اس کی خوبیاں برائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور فاتح جو غیر ملکی ہوتا ہے۔ ہر طرح سے ان کو پست ہمت اور پست خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ محکوم قوم کے کمالوں پر زوال آ جاتا ہے۔ اس کی آزادی پر غلامانہ عادات غالب آ جاتی ہیں اور غلامی کی وجہ سے ان میں خوشامد، خوف، جھوٹ وغیر عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو قوم اور ملک یہاں تک زوال پذیر ہو جائے۔ اس میں موسیقی کہاں تک ترقی کر سکتی ہے۔ ترقی تو کجا اس کا اصل حال پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر موسیقی اور شاعری تو فارغ البالی، آزادی، بے فکری اور قومی حکومت کی عیش وعشرت کا نتیجہ ہوتی

ہے۔

خوشہ چینوں کے لگے رہتے تھے کیا کیا جمگھٹے
جب تک آتا تھا نظر پھولا پھلا یہ گلستاں
ایک ہی گردش میں تیری سب نے آنکھیں پھر لیں
ایک ہی چشمک میں تو نے کیا کیا اے آسماں
اب نہ وہ گل چیں نہ وہ گلبن نہ وہ باغ وبہار
اب نہ ساقی نہ وہ محفل نہ وہ پیر مغاں
ہے یہ افسانہ نصیحت اہل عالم کے لئے
ہے زمانے کے لئے عبرت ہماری داستاں

حواشی:

۱) ترجمہ۔

۲) اسلامک کلچران کشمیر (انگریزی) صفحہ ۲۲۴۔

۳) اصل فارسی میں ہے۔ یہ ترجمہ ہے۔

۴) مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے عرصہ ہوا، بڑودہ کی مجلس موسیقی کی تحریک سے ایک دلچسپ مضمون ہندی راگ پر ایرانی موسیقی کا اثر کے عنوان سے لکھا تھا اور اسی میں کشمیر کی موسیقی کا بھی ذکر کیا تھا۔ یہ اقتباس اسی مضمون سے لیا گیا ہے۔

تیئسواں باب

کشمیری صنعت وحرفت بڈشاہی عہد میں

کشمیری صنعت کی ترقی کا دور

مرزا حیدر جو بڈشاہ سے پون صدی بعد کشمیر میں ایک بادشاہ کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ اپنی تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے۔ کشمیر ایسی عجیب وغریب صنعتوں کا مرکز نظر آتا ہے۔ جو سمرقند، بخارا، ماوارالنہر میں بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔ ان صنعتوں میں پتھر کو جلا دینا، پتھر کو کاٹنا، بوتلیں بنانا، تاب دان تراشنا اور طلائی ورق بنانا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ کشمیر میں صنعت وحرفت کی اس ترقی کا سہرا سلطان زین العابدین کے سر ہے۔ اس کے زمانے میں کشمیر علوم وفنون اور صنعتی وحرفتی کاروبار کا گہوارا اور امن وامان کا ملجا وماوی تھا۔

مرزا حیدر نے اس بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی کیفیت الفاظ ذیل سے معلوم ہوسکتی ہے۔ ”وصاحبان حرفہ کردر اکثر شہر ہا کم مے باشند مثل حکاک سنگتراش وشیشہ گر۔ تابدان تراش وزرکوب وغیرہ ہنرمندان کہ درتمام ماوارالنہر وسمرقند، بخارا در ہیچ جا ایں جماعہ نمے باشد ساختہی وپرداختہ آں سلطان است۔“

مرزا حیدر کے ان الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کی تاریخوں میں بڈشاہی عہد کے صناعوں کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ بڈشاہ ان کو سمرقند اور ماوراالنہر سے اُس وقت اپنے ہمراہی لایا تھا۔ جب تیمور کی وفات کے بعد اس کو قید سے نجات ملی تھی۔ وہ سراسر غلط ہے۔ مرزا حیدر اس کا قریب العہد مصنف ہے اور اس کے زمانے میں کئی اشخاص ایسے زندہ اور موجود ہوں گے۔ جن سے وہ حالات کی تحقیق و تفتیش کر سکتا تھا اور یقیناً اس نے بڑے بوڑھوں کو بلا کر ان سے حالات کی تصدیق بھی کی ہوگی ورنہ سمرقند اور بخارا وغیرہ ممالک اس کے بزرگوں کا وطن تھا۔ اگر تمام بڈشاہی صنائع انہی ممالک سے آئے ہوتے تو وہ فخر و مباہات کے ساتھ اپنے وطن کے کاریگروں اور صناعوں کا ذکر کرتا۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ قالین باف اور غالیچہ ساز سمرقند اور بخارا یا خراسان وغیرہ ممالک سے آئے ہوں اور سنگتراش اور مصوّر کشمیر ہی کے ہوں۔ کیونکہ ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی سنگتراشی اور مصوری کی صنعت ہندو زمانہ قدیم ہی سے چلی آتی ہے۔

بڈشاہی خشت اور ٹائیل

محلہ مدین صاحب سے تھوڑی دور آگے منڈی بل کے عبرت انگیز کھنڈروں میں بڈشاہی عہد کی کچھ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں بھی نظر آتی ہیں۔ راقم الحروف کو وہاں کے لوگوں نے ایک اینٹ کے دو ٹکڑے لا کر دکھائے۔ جب ان کو جوڑا گیا تو یہ اینٹ ۱/۲،۱۸ انچہ موٹی اور ۱۵ انچہ لمبی اور ۱/۲،۱۲ انچہ چوڑی نکلی۔ اینٹ کا ایک پہلو بالکل

صاف اور دوسرا کھردرا تھا۔ بڈشاہی عہد کی ٹائیلوں کا نمونہ مزار سید مدنی اور مقبرہ سلاطین کے ڈمٹ میں تھی، جہاں بڈشاہ کی والدہ مدفون ہیں نظر آیا۔ یہ ٹائیلیں سبز رنگ کی ہیں۔ اوران کی خوشنمائی اور خوبصورتی اب تک قائم ہے۔ مزار مدنی صاحب کے دروازہ کی ٹائیلیں بڑے سائز کی ہیں اور جو ٹائیلیں مزار السلاطین ڈمٹ کی بیرونی سطح پر نظر آتی ہیں، وہ بہت چھوٹی چھوٹی ہیں اور ڈمٹ (گنبد) کے چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اسی طرح معلوم ہوتی ہے۔ جیسے انگشتری پر کسی نے سبز ہیرا جڑ دیا ہے۔

یہ چھوتی چھوٹی خوبصورت ٹائیلیں یا تو مرور ایام سے خود بخود ہی گنبد کے سوراخوں سے گر پڑی ہیں یا طوائف الملوکی کے زمانے میں بے رحم لوگوں کے ستم پرور ہاتھوں نے اکھاڑ لی ہیں۔ اب تو سرف چند ایک باقی ہیں۔ جو بنانے والوں کی خوش ذوقی کا پتہ دیتی ہیں۔

ریشم کا کارخانہ

ریشم کا کام کشمیر میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ لیکن بڈشاہ کے عہد میں کشمیر کی اس صنعت کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی۔ اس وقت دمشق، بخارا اور ختن تک کی منڈیوں میں کشمیر کا ریشم جاتا تھا اور بہت پسند کیا جاتا تھا۔ بخارا سے کشمیر کے ریشم کو بہت تعلق رہا ہے۔ اگرچہ اس کے بیج وہیں سے آتے تھے۔ لیکن اہل کشمیر کے صنعتی

دماغوں کا یہ حال تھا کہ تیار کئے ہوئے ریشم کی کھپت بھی بخارا ہی میں ہوتی تھی۔(۲)

ختن کے تاجر یورپ اور وسط ایشیا تک کشمیر کا ریشم پہنچایا کرتے تھے۔ مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے۔ کشمیر کا ریشم دور دور تک پسند کیا جاتا ہے اور اس کا استعمال فیشن میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ غریب طبقہ کی عورت بھی اسے ضروریات زندگی میں شمار کرتی ہے اور جس کو یہ میسر نہ ہو سکے اس کو بدقسمت تصور کیا جاتا ہے۔ کشمیر کے عجائبات میں توت کے درخت بھی ہیں۔ جو بہت بڑی تعداد میں ریشم کے کیڑوں کی خوراک کے لئے لگائے جاتے ہیں۔

شریور بھی راج ترنگنی میں بڈشاہ کے زمانہ میں ریشم کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ریشم کی پیداوار میں اس دلچسپی سے کام لیا اور اس کو ایسی ترقی دی کہ ہر شخص ریشمی لباس ہی میں ملبوس نظر آتا تھا۔

سر والٹر لارنس کی رائے میں ریشم کے کیڑے پالنے کے لئے کشمیر کی سرزمین نہایت موزون ہے۔ چنانچہ توت کے بہت سے قدیم درخت جو بے برگ وبار بڑے تناور اور جسیم ہیں۔ اب تک کشمیر کے دیہات میں کثرت سے نظر آرہے ہیں۔ موجودہ حکومت ابھی اکثر دیہات میں جہاں کاہچرائی اور خالصہ زمین کی کثرت ہے۔ توتوں کے درخت نصب کرا رہی ہے۔ اور قریبا ہر گاؤں میں ریشم کے کیڑوں کے تخم زمینداروں کے ڈبیوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جو چالیس دن کے بعد غنچہ ابریشم تیار کر کے ریشم کے کارخانہ میں لے آتے ہیں۔ موجودہ حکومت جموں وکشمیر کو بھی اس صنعت سے خاص آمدنی ہو رہی ہے۔

زنگیری پٹو

عام طور پر اس کو دیہاتی بُنتے ہیں۔ بھیڑوں کی اون سے بنایا جاتا ہے۔ سب سے اچھا پٹو علاقہ زنگیر میں ہوتا ہے۔ جو زین العابدین نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ یہ سادہ بھی ہوتا ہے اور دھاری دار بھی۔ صالحہ ماجی بیگم سلطان محمد شاہ والئے کشمیر نے خانقاہ معلیٰ کی تعمیر کے سلسلہ میں جو پانچ ہزار کرتے مزدوروں کو تقسیم کئے تھے۔ وہ زنگیری پٹو ہی کے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں زنگیری پٹو سوپوری پٹو کے نام سے مشہور ہے۔

پیپر ماشی

بوسیدہ کاغذوں کو کوٹ کر مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں اور ان پر منقش کام کیا جاتا ہے۔ اس کو پیپر ماشی کہتے ہیں۔ اس کا رواج بھی بڈشاہی زمانہ ہی سے ہوا ہے۔ اس کو کار قلمدانی بھی کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے منقش قلمدان اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت صندوقچیاں نقش ونگار کے ساتھ تیار کی جاتی ہیں۔

پیپر ماشی کا کام عموماً شیعہ اہل ہُنر بناتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ کابل میں دس ہزار اور فرانس اور دیگر یورپین ممالک میں بیس ہزار روپے کی قیمت کا یہ کام فروخت ہو جاتا تھا۔ مگر آج کل اس کی فروخت پر زوال آ رہا ہے۔ قلمدان دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک چھوٹے جو مسندی کہلاتے تھے اور جن کو اہلکاروں اور منشی لوگ اپنے

ساتھ لایا اور لیجایا کرتے تھے۔ دوسری قسم فرشی کہلاتی تھی۔ اس قسم کے قلمدان ایک ہی جگہ رہا کرتے تھے۔

فرانس میں جو شال دوشالہ وغیرہ تاجر لوگ بھیجا کرتے تھے۔ وہ پیپر ماشی کے بکسوں میں بند کئے جاتے تھے اور پھر وہ بکس بھی فرانس میں معقول قیمت پر فروخت ہو جایا کرتے تھے۔ چھتوں کی نقاشی اور ہاتھیوں کے ہودے بھی پیپر ماشی ہی سے تیار کئے جاتے تھے۔ چھتوں کی نقاشی تو اب بھی شیر گڈھی کے شاہی محلات اور بعض امراء کے مکانوں میں نظر آرہی ہیں۔ بلکہ لاہور کے حضوری باغ میں جو بارہ دری مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بنوائی تھی۔ اس کی چھت میں بھی اب تک اس کشمیری صنعت کے دلفریب جوہر نظر آرہے ہیں۔

بڈشاہ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی پیپر ماشی سے دیگر چیزوں کے علاوہ ڈھالیں، تیر کمان اور ترکش اور اس قسم کی دیگر اشیاء تیار ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اب پیپر ماشی کا وہ رواج نہیں رہا۔ اس صنعت کو زوال آرہا ہے۔ اب کاغذوں کی بجائے لکڑی کا برادہ زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگلے زمانے میں پیپر ماشی کا کام پچاس سال تک خراب نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ پائیداری نہیں اور ارزاں فروشی کی وجہ سے یہ صنعت بھی خراب ہو رہی ہے۔

آج کل پیپر ماشی سے تصویروں کے فریم اور پردے بنائے جاتے ہیں۔ چارپائیوں کے پائے، میزیں، ٹپائیاں، بڑے پیالے، رومالوں اور کارڈوں اور ٹکٹوں اور سگریٹ سگار کے بکس، موم بتی دان، بجلی کے لیمپ اور سٹینڈ وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔

بیرونی ارباب صنائع کشمیر میں

بادشاہ نے اہل صنائع کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ان صناعوں میں مندرجہ ذیل نام کے نام مختلف تاریخوں میں درج ہیں۔

کاغذ ساز، صحاف، قالین باف، زین ساز، دایہ (قابلہ) حکاک، سنگتراش، شیشہ گر، تابدان تراش، زرکوب، اسلحہ ساز، غالیچہ ساز، ماہران علم موسیقی، جلدگر آتش باز۔

بادشاہ نے بہت سے ان میں سے سرکاری کاموں میں لگا دئے۔ جن کو سرکاری ملازمت یا کام نہ مل سکا، ان کو اپنا علیحدہ کاروبار کرنے کے لئے مالی امداد دی اور ہر چند کہ یہ لوگ دور دراز مقامات سے آئے تھے۔ لیکن بادشاہ کی قدردانیوں نے ان کو یہیں آباد ہونے کے لئے مجبور کر دیا۔

غالیچہ سازی

کشمیر میں یہ بھی بڈشاہی یادگار ہے۔ بادشاہ کے بعد بھی کئی سال تک غالیچہ کی تجارت کو فروغ رہا۔ لیکن جب ملک خانہ جنگیوں میں مصروف ہو گیا اور بادشاہوں کو اپنی سلطنت بلکہ جانیں بچانے کی فکر پڑ گئی تو یہ تجارت اور صنعت بھی قریباً معدوم ہو گئی۔

کاغذسازی اور جلدسازی

کاغذ ملک چین کی ایجاد ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے ۷۵ سال بعد ایک شخص سچ لن نام پیدا ہوا۔ جس نے دنیا بھر میں سب سے پہلے کاغذ تیار کیا۔ پہلے وہ بانس وغیرہ سے کام لیتا رہا۔ لیکن وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہوا۔ تیس سال کے بعد اس نے شہتوت کے درخت کے ریشے تیار کئے اور ان سے کاغذوں کا پہلا دستہ تیار کیا۔

لیکن کشمیر میں کاغذ کا بانی زین العابدین ہی ہے۔ جس نے صحافوں اور کاغذ گروں کی حوصلہ افزائی کی اور جس نے اپنے ملک کے نوجوانوں کو اس قسم کی صنعتوں کے سیکھنے کے لئے بہت سی آسائشیں بہم پہنچائیں۔

ان لوگوں کو اس نے دارالخلافہ نوشہرہ میں آباد کیا۔ جہاں آج تک نہ صرف ان کاغذسازوں کی ذرّیات موجود ہیں۔ بلکہ کاغذ سازی کا کارخانہ بھی جاری ہے۔ کشمیری کاغذ تمام ہندوستان میں باوجود اپنی بے انتہا گرانی کے اپنی صفائی اور پائیداری کی وجہ سے نہایت پسند کیا جاتا ہے۔ یہ کاغذ اس قدر پائیدار ہے کہ اس کاغذ پر لکھی ہوئی کتابیں تین تین سو سال سے زیادہ عرصہ تک محفوظ و بے ضرر پائی گئی ہیں۔ پائیداری میں دنیا کا اور کوئی کاغذ کشمیری کاغذ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

عہد اسلاف کا ہے ایک مرقع دلکش
دور حاضر کا ہے آئینہ روشن کاغذ

چونکہ حکومت کی طرف سے اس کاغذ کی کوئی خاص سرپرستی نہیں کی جاتی اور عام بازاری کاغذ اس سے سستا ملتا ہے۔ اس لئے یہ صنعت بھی آج کشمیر میں زوال پر

ہے۔اُس زمانہ میں نہ چھاپہ خانوں کا رواج تھا۔نہ کتابوں کی بہتات تھی۔اس لئے جلدسازی کا بھی رواج بہت کم تھا۔اور کہیں تھا بھی تو بالکل معمولی اور ادنیٰ درجہ کا۔ بڈشاہ نے ہنرمند صحافوں کے ذریعہ اس فن کو بھی ترقی دی اور نہ صرف اعلیٰ جلدیں تیار کرائیں۔ بلکہ نقری جلدسازی کا کام بھی سب سے پہلے کشمیر بلکہ ہندوستان میں اسی نے شروع کرایا۔

کاغذسازی پرشاعروں کی طبع آزمائیاں

ایک شاعراسی زمانہ میں محلّہ کاغذگراں (نوشہرہ) سے گزرا۔دیکھا کہ ایک کاغذساز پرانے اور بوسیدہ کپڑوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے جمع کرتا اوران کودھوتا اور کاغذ بنانے کے لئے ان کوکوٹتا ہے۔

اس قسم کا کاغذ آبی کاغذ کہلاتا تھا۔شاعر نے کاغذ اور کاغذساز کی یہ کیفیت دیکھ کرفی البدیہہ(۳) کہا ہے۔

تا اجل آرام بخش رسم بے تابی شود
زندگانی مدِ آہ عہد بے خوابی شود
پرزدہ پرزہ جامہ عاشق سرراہ گفت دوش
گوشہ دامان عاشق کاغذ آبی شود

بادشاہ کوخبر ہوئی اس نے شاعر کو بلوایا۔اشعار سنے اور بطور اظہار خوشنودی انعام عطا فرمایا۔

کشمیر کے ایک مشہور خوشنویس اور شاعر سرخوش کی ایک بیاض میری نظر سے گزری ہے۔ جس میں بڈشاہ کے چند اشعار اور اس کے ذوق سخن کے واقعات درج ہیں۔ انہی میں کاغذ سازی کے متعلق بھی یہ سطور درج ہیں۔

کاغذ سازی در عہد سلطان ظہور یافت کہ سلطان از ملک قزوین کاغذ سازاں را آوردہ در کشمیر رواج کاغذ سازی داد تا آں زماں کہ کتاب ودفاتر براوراق توز (بھوج پتر) مے شد۔ ملائے ندیمی ایں واقعہ بہ نظمے نوشت کہ دو بیت بہم آمد"۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

کاغذ بہ دفتر آمد وشیرازہ درگرفت
پیچید روزگار زدیواں چو فرش توز
زیں(۴) تختہ ہائے کاغذ زیبائے رنگ رنگ
بشکست دور گردش پر کار عرش توز

کشمیری تلوار اور بندوق

جن لوگوں کو تاریخ پر عبور حاصل ہے اور جو چاہتے ہیں کہ ہر قوم اور ہر ملک میں کبھی نہ کبھی شجاعت وبساطت اور حکومت وسطوت کا دور دورہ رہا ہے۔ ان سے مخفی نہیں کہ کشمیری بھی کسی زمانہ میں صاحب السیف والقلم تھے۔ اس موضوع پر اہل کشمیر کی جنگی سپرٹ اور بڈشاہ کے فوجی کارناموں کے باب میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔

غرض جس زمانے کا ہم ذکر کررہے ہیں۔ وہ کشمیر میں عین شباب وعروج

کا زمانہ تھا۔ ہر کشمیری تلوار کا دھنی تھا اور تلواریں اور بندوقیں یہاں بنا کرتی تھیں۔
ایجرٹن صاحب لکھتے ہیں۔ کشمیر کی ساختہ تلواروں پر نہایت نفاست وخوبصورتی سے باریک بارک انسانی وحیوانی تصاویر کندہ ہوتی ہیں۔ تلواروں کا حاشیہ سونے سے چمکدار بنا دیا جاتا ہے۔ نیاموں پر نہایت خوبصورت شکلیں اور بیل بوٹے ہوتے ہیں جو شال کے سلمہ ستارہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تلواروں پر کشمیری ارباب صنائع جو تصویریں بناتے ہیں۔ ان میں عموماً پیدل یا ہاتھی سوار شکاریوں کو کسی شیر یا دوسرے کسی خونخوار جانور کا تعاقب کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ بندوق کی نالیاں بنانے میں بھی ان کو خاص شہرت ہے۔ لندن کے ہندوستانی عجائب خانے میں پرانے کشمیری پیش قبض اور شیر بچہ اب بھی دیکھے جاتے ہیں۔

لندن تو بہت دور ہے۔ سرینگر کے عجائب گھر میں بھی کشمیری اسلحہ جات موجود ہیں۔ جو زبان حال سے ؎

اشک ریزاں در عجائب خانہ برحال وطن
خود وتیرو زرہ وتیغ و سنانِ کاشمیر

کشمیری توپ کی ابتداء

شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کو اسلحہ سازوں نے مختلف قسم کے گرجنے اور ہولناک آوازیں پیدا کرنے والے ہتھیار دکھائے۔ جو لوگوں کو اپنی ہیبت انگیز گونج سے دہشت زدہ کر دیتے تھے۔ انہی نمونوں پر بادشاہ نے اس قسم کے ہتھیار مختلف

دھاتوں سے اپنے ملک میں بھی تیار کرائے۔ شریور نے سنسکرت زبان میں توپ اور دیگر ہتھیاروں کیلئے بادشاہ کے حکم سے اشعار لکھے۔ جو ان پر کندہ کرائے گئے۔ ان اشعار یا شلوکوں کا ترجمہ جے سی دت نے کنگس آف کشمیر کے صفحہ ۱۰۵ پر انگریزی میں کیا ہے۔ اردو میں ان کا ملخص درج کیا جاتا ہے۔

شری زین العابدین فاتح اعظم نے جو اندر کی طرح دنیا میں مشہور ہے اور کشمیر کا بادشاہ ہے۔ ۴۱ لوکک (۵) میں اس توپ کو جس کا عام چرچا ہے بنوایا۔ یہ توپ قلعوں کو تباہ کرتی ہے۔ لوگوں کے دلوں کو خوفزدہ کرتی ہے اور پہاڑوں میں زلزلہ سا پیدا کر دیتی ہے اور جنگلی گھوڑوں میں ہلچل ڈال کر ان کو بھاگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ توپ پتھروں کے گولے دور دور تک پھینکتی ہے۔ جو بالمقابل فوجوں کو تباہ کر دیتے ہیں ۔ یہ توپ بہت مضبوط ہے۔ کار آمد ہے اور اس کی پر شکوہ آواز دور تک اور دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہتی ہے۔

تفنگ اور آتش بازی کا رواج

بادشاہ کو فن آتش بازی سے پوری واقفیت تھی۔ حبیب آتش باز جو آتش بازی کے کھیل تماشوں سے بادشاہ کو محو حیرت کر دیا کرتا تھا۔ اکثر چیزیں بادشاہ کی ہدایت کے مطابق تیار کیا کرتا تھا۔ شریور لکھتا ہے۔ کشمیر میں شورہ پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ بادشاہ خود اس کا موجد بنا اور پھر یہ ملک میں عام طور پر بنایا جانے لگا۔ بادشاہ ہر عجیب اور نئی چیز کا رواج اپنے ملک میں چاہتا تھا۔ اس نے حبیب کو حکم دیا کہ خاص خاص

لوگوں کواس فن میں اُستاد کامل بناو۔

حبیب ہی نے کشمیر میں سب سے پہلے تفنگ ایجاد کی اور آخر بادشاہ کی عنایات سے وہ مقربان شاہی میں داخل ہو گیا۔

کرنل سرہیگ نے بھی اس آتش باز کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک کامل آتش باز نے نہ صرف آتش بازی ہی تیار کی بلکہ بادشاہ کے حکم سے اس نے آتشیں آلات بھی تیار کئے۔

حواشی:

۱) تاریخ رشیدی قلمی ورق ۳۲۷ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کشمیر۔

۲) رپورٹ مردم شماری ۱۹۲۱ء جموں وکشمیر۔

۳) از بیاض بوسیدہ وکہنہ مملوک خواجہ محمد اسماعیل صاحب نامی بقال تبت سرینگر کشمیر۔

۴) یہ بیاض میں نے پیر شمس الدین حیرت پاندانی کاشمیری کے پاس دیکھی تھی۔ زین تختہ ہائے کے آگے جو چند الفاظ تھے وہ کرم خوردہ تھے۔ مولانا نے مصرعہ کو پورا کرنے کے لئے فرمایا۔ لکھدو۔ ''زین تختہ ہائے کاغذ ریائے رنگ رنگ''۔

۵) اسلامک کلچران کشمیر صفحہ ۲۵۴ مطابق ۱۴۶۵ء موافق ۸۶۹ھ۔

چوبیسواں باب

بادشاہ کی علمی سرگرمیاں

بڈشاہ کئی زبانیں جانتا تھا

بادشاہ اپنے زمانے کے علم وادب ہی میں مہارت تامہ نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ اس زمانہ کی متعدد زبانوں سے بھی اسے بہت اچھی واقفیت تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے علم وعلماء دونوں کی قدردانیوں سے اپنے ادبی کارناموں کو ناپائیدار شہرت دی۔ آج ہندوستان وکشمیر کے مصنفوں اور مورخوں کے علاوہ یورپ کے محقق ومورخ بھی اس کے برمحل علمی عطیات اور اس کے ماہر علوم ہونے کی تعریف کررہے ہیں۔(۱)

کشمیری زبان تو بادشاہ کی ملکی ومادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ تبتی، فارسی، سنسکرت اور ہندی زبانیں بھی جانتا تھا۔ بلکہ ان زبانوں کا عالم وفاضل تھا(۲)۔ فارسی میں اس کے اشعار بھی موجود ہیں وہ علوم ریمیا وسیمیا میں بھی ماہر تھا۔

کرنل سرولزلی ہیگ تاریخ ہندوستان کی تیسری جلد میں لکھتے ہیں:۔

زین العابدین کو فارسی، ہندی، تبتی اور اپنی مادری (کشمیری) زبان پر پورا عبور تھا اور وہ شاعری، مصوری اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس نے سنسکرت سے مہابھارت

اور راج ترنگنی کا جوار جگان کشمیر کی مشہور منظوم تاریخ ہے۔ فارسی میں ترجمہ کرایا اور کئی فارسی اور عربی زبان کی کتابوں کو ترجمہ کے ذریعے ہندی لباس پہنایا۔

بادشاہ ایک مصنف کی حیثیت سے

شریور کی راج ترنگنی سے بادشاہ کی دو تصنیفوں کا پتہ ملتا ہے۔ ایک کتاب کا نام سوال و جواب ہے۔ جو آتش بازی بنانے اور شورہ وغیرہ پیدا کرنے کے متعلق ہے۔ شریور لکھتا ہے کہ بادشاہ نے حبیب میر آتش کو فارسی زبان میں آتش بازی کے متعلق جو ہدایات بطور سوال و جواب لکھائیں۔ ان کی ایک مختصر سی کتاب بن گئی۔ یہ پہلی کتاب تھی جو بادشاہ کے نام سے لکھی گئی۔ پھر بادشاہ کی تقلید میں کئی اور مصنفوں نے اسی طریق پر اپنی کتابیں تصنیف کیں۔ طبقات اکبری کا مصنف بھی اس آتش باز کا ذکر کرتا ہوا کتاب سوال و جواب کے متعلق لکھتا ہے کہ "متضمن فوائد بسیار است سلطان بہ اتفاق او تصنیف کردہ"۔ لیکن آج یہ کتاب بالکل نابود و معدوم ہے۔

بادشاہ کی دوسری تصنیف کا نام شکایت ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنے روحانی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ بقول شریور یہ بھی فارسی زبان میں تھی۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور نالائق و ناخلف اولاد کے ہاتھوں تنگ رہنے اور رنج اٹھانے پر لاولد رہنے کی ترجیح دی گئی۔ یہ کتاب بھی آج عنقا کا حکم رکھتی ہے۔

دارالترجمہ اوردارالتصانیف کا اجراء

بادشاہ نے اس زمانے میں جب کہ ہندوستان کے علاوہ دیگر تمام ایسے ممالک بھی جنہوں نے علوم جدیدہ کی شعاعوں سے آج تمام عالم کو منور کر رکھا ہے۔ اشاعت علوم وفنون کے طریقوں سے بالعموم بے خبر تھے۔ علمی وظائف کے علاوہ دارالترجمہ اور دارالتصانیف کے شعبے قائم کئے۔ جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی، تاریخی اور عام اخلاقی وطبی کتابوں کے تراجم ہوتے اورنئی تصانیف بھی قابل مصنفوں سے معقول مشاہرے دیکر لکھوائی جاتی تھیں۔ ملا احمد، زونراج، پنڈت یودی بٹ اور ملا نادری ان شعبہ جات کے معزز ارکان تھے۔ سب سے پہلے ملا احمد ہی نے مہابھارت کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ ایک کتاب ہندی زبان کی جس کا اصل نام معلوم نہیں ہوسکا بادشاہ نے فارسی میں ترجمہ کرائی اور نام اس کا افسانہ ہندی رکھا۔ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اب کہیں نہیں ملتی۔ اکبر نے ملا عبدالقادر بدایونی سے فرمایا۔ اس کی فارسی غیر متعارف ہے۔ اسے مانوس عبارت میں لکھ دو۔ ملا نے دو تین مہینے کے اندر کتاب تیار کر دی۔ اکبر نے دس ہزار تنگہ مرادی اور ایک گھوڑا انعام دیا اور نام اس کتاب کا بحرالاسماء رکھا۔ (۳)

معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ ہندی کی صرف ایک جلد ہی بڈشاہ کے حکم سے ترجمہ ہوسکی تھی۔ جیسا کہ دربار اکبری کی سطور ذیل ظاہر کرتی ہیں۔ بادشاہ نے ابوالفضل سے فرمایا۔ افسانہ ہندی کی صرف ایک جلد ہی سلطان زین العابدین کے حکم سے ترجمہ ہوئی ہے۔ بہت سی جلدیں اس کی باقی ہیں۔ انہیں ترجمہ کر کے پورا کر دو۔

چنانچہ اس کتاب کی اخیر جلد جو ساٹھ جزو کی ہے۔ ابوالفضل نے پانچ مہینے میں تیار کر دی۔

شریورزینہ راج ترنگنی میں لکھتا ہے۔ بادشاہ نے دش اوتار اور راج ترنگنی کا جو سنسکرت زبان میں کشمیر کی تاریخیں تھیں۔ فارسی زبان میں ترجمہ کرایا۔ ان کے علاوہ دیہات کتھار سارا (Khatasara rehat)، ہاتک شورسمسے تا اور پران جیسی ہندو مذہب کی کتابیں اب ملیچھ (۴) بھی اپنی زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔

شریور بادشاہ کی علم پرستیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ایک دفعہ مجھ سے دشست بر ہمہ درشن کی کتھا سنی۔ یہ کتاب بالمیک جی کی تصنیف تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے روح کو ایک قسم کی شانتی حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ اس کتاب کے سننے سے بہت محظوظ ہوا۔ بادشاہ نے اس کتاب کا اور دوسری کئی کتابوں کا فارسی اور کشمیری زبانوں میں ترجمہ کرایا۔ یہاں تک کہ اب علم نباتات اور علم کیمیا کا مطالعہ ہر شخص اپنی مادری زبان میں کرسکتا ہے۔

علم وعلماء کی سرپرستی

بادشاہ نے اپنے ممالک کے اکثر لوگوں کو جو علم کی اہلیت اور اس کا شوق رکھتے تھے وظائف دیکر بیرونی ملکوں میں بھیجا۔ ان میں لوگ شادی شدہ تھے۔ ان کے اہل وعیال کے اخراجات کا بوجھ بھی خزانہ شاہی پر ڈالا۔ علاوہ ازیں بیرونی ممالک سندھ، ہرات، ہندوستان، بخارا، خراسان، عرب وغیرہ سے فارسی، عربی اور سنسکرت

کے عالم بلوائے۔ ان کو معقول تنخواہیں دیں اور ان تنخواہوں کے لئے خاص خاص دیہات وقف کر دیئے۔ جو اہل علم زیادہ قابل تھے۔ ان کی جاگیریں بھی عطا کیں۔ بعض علماء فضلا ملک روم سے بھی کشمیر میں آئے۔ جیسا کہ بہاؤ الدین متو اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ "وعہد از او دیگر امصار علماء فضلاء درایں شہر آمدند مثلاً ملا محمد باقر رومی ومولانا احمد رومی کہ برادر یکدگر بودند از سلطان مورد انعامات شدہ درایں شہر سکونت ورزیدند"۔

خواجہ محمد اعظم واقعات کشمیر میں بادشاہ کے استاد مولانا کبیر کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ اس نے ان کو نوشہرہ دارالحکومت کے دارالعلوم کا صدر اعلیٰ مقرر کیا۔ اور طالبان علوم کے اخراجات کیلئے چند مواضعات وقف کر دیئے۔ تا کہ ناداری کی وجہ سے علم کے اس چشمہ سے کوئی پیاسا نہ رہنے پائے۔

ہندوؤں کے علوم کی اشاعت

بادشاہ نے ہندو علوم کی کتابیں جن کو مہاجر کشمیری پنڈت اس کے باپ اور بھائی کے زمانہ میں اپنی جلاوطنی کے ساتھ ہی پنجاب وغیرہ ممالک میں لے گئے تھے۔ ہندوستان سے منگوا کر ملک میں تقسیم کیں۔

شریور لکھتا ہے۔ سکندر بادشاہ کشمیر کے زمانے میں یاونوں (۵) کے اثر واقتدار سے ہندو علوم کی تمام کتابیں یا جلائی جا چکی تھیں یا کسی نہ کسی طرح ضائع ہو گئی تھیں۔ جو ہندو ان ایام میں کشمیر سے ہجرت کر گئے۔ ان میں جو اہل علم و فضل لوگ

تھے۔ وہ بھی اکثر کتابیں اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ اور ملک اچھی کتابوں سے بالکل خالی ہوگیا تھا۔ بادشاہ نے ان کتابوں کو ممالک غیر سے مختلف ذرائع سے حاصل کر کے پھر اپنے ملک میں علم وفن کو رونق دی۔ باہر سے پُران لائے گئے اور فلسفہ وغیرہ علوم کی کتابیں اپنے ملک کے علماء میں باہر سے منگوا کر تقسیم کیں۔

کسی نے یجروید کا ایک نسخہ ہدیہ دیا۔ بادشاہ نے اس کی تصدیق وتوثیق کے لئے چند آدمی دکن میں بھیجے تا کہ وہ اس کا مقابلہ کر کے صحیح نسخہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں۔

تاریخ ملا بہاؤ الدین متو میں بھی ان کتابوں کے کشمیر میں منگوائے جانے کا ذکر ہے۔ جو کشمیری مہاجرین اپنے ساتھ ہندوستان میں لے گئے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے ۔"دفاتر کفر وصحائف شرک ازیں دیار او کشیدہ بودند باز طلبید۔"

عالی حوصلگی، وسیع القلبی ، بے تعصبی اور سرپرستی علوم کی یہ ایک ایسی مثال ہے کہ اس کی نظیر نہ پہلے کی تاریخوں میں مل سکتی ہے اور نہ آج کوئی ملک اور کوئی بادشاہ اس قسم کی بلاتفریق مذہب وملّت دلجوئی رعایا کا ثبوت پیش کرسکتا ہے۔

مختلف علوم وفنون کی کتابوں کیلئے بادشاہ کے تحائف

بادشاہ کو علمی ذخائر جمع کرنے اور ان سے اپنے ملک کو مستفیض کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ وہ غیر ممالک کے بادشاہوں کو کشمیر کے بیش قیمت تحائف ایک معزز جماعت کے ہاتھ بھیجا کرتا۔ اور بادشاہ اس جماعت کے اخراجات کا کفیل ہوا کرتا۔

بہاؤ الدین متو اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔ ''ودریں دیار کتب ہاء مے فرستاد۔ ازیشان کتاب ہادر مختلف علوم وتصانیف کثیر آوراہند۔''

بادشاہ نے اس طریق سے ایک ایسا کتب خانہ بنالیا جو اس کے عہد میں اس کے کسی معاصر بادشاہ کے پاس نہ تھا۔ یہ کتب خانہ بادشاہ کے بعد ایک سو سال یعنی سلطان فتح شاہ کے عہد تک دستبرد زمانہ کے ہاتھوں محفوظ رہا۔ اس کے بعد دیگر تمام فانی اشیاء کی طرح یہ خزانہ علوم وفنون بھی جس میں خدا جانے کیسے کیسے بیش قرار علمی جواہرات تھے۔ فنا و نابود ہو گیا۔

عہد بڈشاہی میں فراوانی علوم وفنون

شریور لکھتا ہے۔ میں کیا لکھوں اور کہاں تک لکھوں کہ اس بادشاہ کے عہد میں کشمیر نے کس قدر ترقی کی۔ انتہا یہ ہے کہ مزدور اور باورچی تک شاعر اور مصنف بن گئے اور عورتوں تک نے حصول علوم میں نام پیدا کر لیا۔ اور ان لوگوں کی تصنیفات اس وقت تک (٦) بھی ہر گھر میں موجود ہیں۔ وہ لوگ جن کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ علم ہمارے نصیبوں میں ہوگا۔ وہ بھی علوم مختلفہ حاصل کر کے اور قابل ولائق ہو کر بادشاہ کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔

جو طلباء بیرونجات سے پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ بادشاہ نے ان کے لئے دارالاقامے قائم کئے۔ جہاں ہر طالب علم کی کتاب وخوراک وغیرہ کے مصارف خزانہ شاہی سے ادا کئے جاتے تھے۔ شریور لکھتا ہے۔ تاریخ طب، نباتات، کیمیا کوئی علم ایسا

نہ تھا جو مدارس میں پڑھایا نہ جاتا تھا۔

سیاسی حیثیت کے علاوہ علمی حیثیت سے بھی سرینگر یعنی دارالحکومت کو خاص اہمیت حاصل تھی اور ماتحت راجگان وروساء اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے علاوہ اپنے علاقہ جات کے دیگر طلباء کو بھی اسی جگہ حصول تعلیم کے لئے بھیجا کرتے تھے۔

ایک کتاب کے لئے مکہ معظّمہ کو ایک کاتب کی روانگی

علامہ جار اللہ کی تصنیف تفسیر کشاف کا اصل نسخہ بہت کمیاب تھا۔اس کے حصول کے لئے بادشاہ نے ہندوستان کے علاوہ ترکستان اور ماورالنہر کے اطراف میں بھی آدمی دوڑائے۔لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ایک مرتبہ جب کشمیری حجاج کا قافلہ اپنے وطن میں واپس آیا۔تو ان میں جو حاجی علم دین کے ماہر تھے۔انہوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ علامہ جار اللہ کی اصل تصنیف کا نسخہ مکہ معظّمہ میں موجود ہے۔بادشاہ نے یہ سُن کر ''یک مرد کاتبے راخرچ راہ واہل وعیال دادہ بہ ہمیں غرض بہ مکہ فرستاد۔''

چنانچہ وہ کاتب عرصہ دراز تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہا۔اس نے کتاب کے اصل نسخہ سے اس کی نقش کی۔پھر نقل کو بعد مقابلہ صحیح کرایا اور اس کی تصدیق کے سلسلہ میں اکابر علماء مکہ کے خطوط حاصل کئے۔جب یہ تفسیر کشمیر پہنچی تو شعراء نے نظمیں لکھیں۔چنانچہ ایک نظم (۷) کے چند شعر ذیل میں درج ہیں۔ے

شہ راز مدینہ نور برہاں آمد   رنجور مے اہل دیں بہ درماں آمد
آمد زخدا دفتر اخلاص ادب   (یہاں کاغذ کرم خوردہ ہے)

(یہاں کاغذ کرم خوردہ ہے)   با سلطاں با رسول قرآن آمد

اصل نسخہ تفسیر کشاف کی یہ مصدقہ نقل مرزا حیدر کے زمانہ تک کشمیر میں موجود تھی۔ جب کشمیریوں اور مغلوں میں جنگ ہوئی تو بیشتر مغل جان سے مارے گئے اور مرزا حیدر بھی قتل ہو گیا۔ اس وقت یہ کتاب ایک قاضی صاحب کے قبضہ میں آئی۔ جو مرزا کے ہمراہیوں میں تھا۔ وہ اپنی جان بچا کر اور کتاب کو بغل میں دبا کر اپنے وطن چلا گیا۔ (۸)

بادشاہ کے حکم سے جامع مسجد (سرینگر) کے شمال کی طرف ایک مدرسہ کی بناء ڈالی گئی جس میں عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بادشاہ نے اس کے اخراجات و مصارف کیلیئے چند دیہات وقف کر دیئے۔ قاضی میر علی بخاری جو چنگیز خان کی اولاد سے تھے۔ اس دار العلوم کے صدر بنائے گئے۔ (۹)

نوشہرہ میں بادشاہی دار العلوم

مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتے ہیں۔ نوشہرہ میں شفاخانہ اور لنگر خانہ ہی نہ تھا بلکہ دولت خانہ شاہی کے بالکل متصل راجدھانی (نوشہرہ) میں اعلیٰ پیمانہ پر ایک شاہی بیت العلوم بھی جاری کیا گیا۔ کئی گاؤں طالب علموں کے وظیفے، ان کے اخراجات اور ان کے استادوں کو فکر معاش سے آزاد رکھنے کے لئے وقف کئے گئے۔ اس بیت العلوم میں دار الاقامہ بھی تھا۔ جہاں طالب علم رہا کرتے تھے۔ مولانا کبیر جو بادشاہ کے استاد بھی تھے۔ اس دار العلوم کے صدر مدرس میں یا پرنسپل تھے۔

اس مدرسہ میں مندرجہ ذیل مسلمان استادوں کا نام تاریخوں میں نظر سے گزرا ہے۔ ملا پارسا، ملا احمد، ملا نادری، ملا یحییٰ، ملا ضیائی، جو بڈشاہی عہد کے نامور شاعر اور ادیب تھے اور قاضی حمید الدین جنہوں نے بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر کی تاریخ لکھی ہے۔ لیکن وہ آجکل عرصہ دراز سے نایاب ہے۔(۱۰)

غرض ۔

اس کے زرّیں عہد میں جاری تھے وہ دارالعلوم
جن کی شہرت کے ہیں شاہد آج بھی شمس ونجوم
جن کے علم وفن پہ نازاں ہندو سندھ وشام وروم
جن سے بچ کر کبھی چلتی رہی باد سموم
گردشِ ایام نے شکلیں وہ ایسی میٹ دیں
آج ان تعلیم گاہوں کا نشاں تک بھی نہیں

عہد بڈشاہ کی بعض تصانیف سنسکرت، فارسی اور کشمیری میں

بڈشاہ خود صاحب علم تھا۔ اس لئے اس نے اہل علم کی قدر کی اور اس کے عہد میں علماء وفضلاء نے بھی علم وفضل میں کشمیر کا نام روشن کیا۔ وہ خود شاعر تھا۔ اس نے شعراء کی حوصلہ افزائی کی۔ فارسی اور کشمیری زبان کے صاحب کمال پنڈت اور مسلمان

شعراءاس کے سلک ملازمت میں منسلک تھے۔ وہ خود مصنف تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے مصنفوں، مترجموں اور مورخوں کو دربار میں ممتاز جگہ پر سرافراز کیا۔ ان کو قرب حضوری میں رکھا۔ اور بلاتمیز مذہب وملّت ان کے دامن سوال کو گوہر مراد سے پُر کیا۔

ان کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مختلف کتابوں اور تاریخوں کی چھان بین کے بعد عہد بڈشاہی کی جن تصانیف کا پتہ مل سکا ہے ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ ۔

سنسکرت زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات

زینہ ترنگنی یاراجاولی۔ ازتصنیف پنڈرت زونراج۔

زینہ راج ترنگنی۔ ازتصنیف پنڈت شریور۔

یہ دونوں کتابیں زبان سنسکرت چھپ چکی ہیں اور ان کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں ہو چکا ہے۔

زینہ پرکاش۔ ازتصنیف اوتار بٹ۔ یہ وہی اوتار بٹ ہے جس کو شاہنامہ فردوسی ازبر تھا۔ اس کتاب میں بادشاہ کے فرامین، ارشادات اور بعض احکام بزبان سنسکرت درج تھے۔

ایشورشاتک منظوم۔ ازاوتار بٹ۔ نایاب ہے۔

شرح مہابھاشے۔ از پنڈت پتن جلی۔ یہ کتاب دراصل بعہد مہاراجہ کنشک تقریباً ۱۵۰ءء میں پتن جلی کاشمیری نے علم صرف ونحو کے متعلق لکھی تھی۔ بڈشاہ کے زمانے میں رام آنند نام ایک نحوی پنڈت نے اس کی آسان شرح لکھی۔ شرح اور اصل دونوں نایاب ہیں۔

مانک۔ ازسوم پنڈت۔ درعلم موسیقی۔

پرتھوی راج وجے۔(ٹیکا) مصنف نامعلوم۔ پنڈت جونراج نے سنسکرت میں اس کی شرح لکھی۔اس کا صرف ایک نسخہ بوہلر کوملا تھا۔

کرت ارجینا۔(ٹیکا) مصنف نامعلوم۔ پنڈت جونراج نے سنسکرت میں اس کی شرح لکھی اس کا صرف ایک نسخہ بوہلر کوملا تھا۔

لوک پرکاش۔ سنسکرت زبان میں لغت کی ایک کتاب ہے جس کومشہور کشمیری مصنف کھیمندر نے گیارہویں صدی عیسوی میں ۱۰۲۵ء سے ۱۱۰۰ء کے درمیان تصنیف کیا اور جونراج نے بڈشاہ کے زمانہ میں اس کی شرح لکھی۔ یہ کتاب عام طور پرمل جاتی ہے۔

شری کنٹھ چرت ٹیکا (منظوم)۔اس کا اصل مصنف کشمیری شاعر منکا ہے۔ جوکلہن مصنف راج ترنگنی کا ہمعصر تھا۔شرح اس کی جونراج نے لکھی۔

کتھا کوتک۔مترجم پنڈت شریور۔ اصل کتاب فارسی زبان میں مختلف حکایات پر مشتمل تھی۔جس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔شریور نے اس کا ترجمہ سنسکرت میں کیا۔اس ترجمہ کا ایک نسخہ بوہلر محقق کوملا تھا۔

زین۔ازیودھابٹ۔درعلم موسیقی۔

سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں

وقائع کشمیر۔ترجمہ راج ترنگنی مصنفہ پنڈت کلہن ، مترجم ملا احمد ملک الشعراء فاضل زبان سنسکرت۔کتاب نایاب ہے۔

ترجمہ مہابھارت۔مترجم ملا احمد وسوم پنڈت۔کتاب نایاب ہے۔

شرح کلام شیخ نورالدین۔مترجم ملا احمد۔شیخ نورالدین ولی کا کلام سنسکرت نما کشمیری میں تھا۔۱۸۳۵ء میں مشہور سیاح مسٹر ہوچل کواس کا ایک نسخہ ملا تھا۔

ترجمہ وش اوتار چرت۔ مصنف ومترجم نامعلوم۔شریور نے بادشاہ کی علمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

شرح وریہ ہت کتھا سرا۔ مصنف ومترجم نامعلوم۔شریور نے بادشاہ کی علمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔بحوالہ شریور دیکھو کنگس آف کشمیر جے سی دت صفحہ ۱۴۶۔

شرح باٹ کیشورسم ہتھا۔ مصنف ومترجم نامعلوم۔شریور نے بادشاہ کی علمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔بحوالہ شریور دیکھو کنگس آف کشمیر جے سی دت صفحہ ۱۴۶۔

کشمیری زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات

زینہ چرت۔(نثر) جس میں سوم پنڈت نے بادشاہ کے حالات زندگی شرح وبسط کے ساتھ لکھے ہیں۔شریور نے اس کا ذکر کیا ہے۔یہ کتاب آج تک کسی کو نہ مل سکی۔

زینہ ولاس۔(منظوم ناٹک) مصنف یودہ بھٹ۔اس میں بادشاہ کی زندگی کے ایک واقعہ کو ڈرامہ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

بان آسرور۔مصنف ومضمون نامعلوم۔بوہلر نے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ مجھ کو ملا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد بڈشاہی کی تصنیف ہے۔

اشلوک شیخ۔نورالدین ولی کا منظوم کلام نہایت ادق کشمیری زبان میں ہے جس میں سنسکرت کا زیادہ حصہ ہے۔اس منظوم کلام کو سب سے پہلے بڈشاہ کے عہد میں مرتب کیا گیا۔

فارسی زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات

تاریخ کشمیر۔ مصنفہ ملا نادری۔ کتاب ناپید ہے۔

تاریخ کشمیر۔ مصنفہ قاضی حمید۔ کتاب ناپید ہے۔

مقامات۔ مصنفہ حاجی بابا ادہم۔ درحالات اولیاؤ صوفیائے کرام۔

دیوان اویسی۔ حضرت سید محمد امین اویسیؒ کا صوفیانہ منظوم کلام۔

کفایہ منصوری۔ اس کا دوسرا نام کفایہ مجاہدہ ہے۔ یہ علم طب کی ایک لاجواب کتاب ہے۔ اور اچھی خاصی ضخیم ہے۔ اس میں کئی مقدمے ہیں۔ ہر مقدمے میں کئی مقالے، ہر مقالے میں کئی باب اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ اگرچہ کتاب نولکشور پریس میں چھپ چکی ہے۔ مگر راقم الحروف کو اس کا ایک قلمی نسخہ بھی ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کشمیر میں دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ جو ۱۲۴۸ء کا نقل کیا ہوا۔ نقل کنندہ کا نام محمد اکرم ہے۔ جو نعل بند پورہ سرینگر کا رہنے والا ہے۔ مصنف کا نام منصور بن محمد بن احمد بن یوسف بن قیصر الیاس ہے۔

حواشی:

۱) اسلامک کلچران کشمیر بحوالہ لفٹننٹ نیول جے۔اے۔ایس صفحہ ۴۱۶۔

۲) وجیز التواریخ فارسی۔

۳) دربار اکبری اردو مصنفہ شمس العلماء مولانا آزاد دہلوی صفحہ ۱۱۷۔

۴) شریور مسلمان سلاطین کشمیر کے عہد میں جہاں کہیں مسلمانوں کا ذکر کرتا ہے۔ان کو ملیچھ ہی لکھتا ہے۔اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوؤں کو ان ایام میں کس قدر آزادی حاصل تھی۔وہ مسلمان بادشاہوں کے عہد ہی میں اس قسم کے الفاظ لکھنے سے مسلمانوں کی دل آزاری کا خیال بھی نہ رکھتے تھے۔

۵) یاونوں سے مراد مسلمان ہیں۔

۶) یعنی تا عہد السلطان فتح شاہ بادشاہ کشمیر ۴۵۶۲ لوکک موافق ۱۴۸۶ء مطابق ۸۹۱ھ۔

۷) از بیاض بوسیدہ مملوک خواجہ محمد اسمٰعیل نامی تبت بقال سرینگر۔

۸) تاریخ بہاؤالدین متو۔

۹) از بیان واقعہ حالات مسجد جامع اردو مصنفہ مولوی محمد شاہ سعادت کاشمیری۔

۱۰) از تاریخ حسن قلمی صفحہ ۱۵۸۔

پچیسواں باب

بڈشاہ کے عام اخلاق وعادات

بڈشاہ اپنی فتوحات عظیمہ اور لشکر جرار اور اپنی مشہور بے تعصبی اور رواداری کی وجہ ہی سے عظیم الشان اور قابل احترام بادشاہ نہ تھا۔ بلکہ اپنے پاکیزہ اخلاق اور نیک عادات اور اپنے نیک چال چلن کے باعث بھی اپنی رعایا کی آنکھوں کا تارا تھا۔ مسلمان اور ہندو اس کے نام کی بجائے ہمیشہ اسے بڈشاہ اور بٹہ شاہ کہتے رہے اور یہ مقبولیت اسے اپنی زندگی ہی میں نصیب ہوگئی۔ آج بھی کم لوگ ہیں جو اس کے اصلی نام سے آگاہ ہیں۔

مال غیر اور زن بیگانہ سے نفرت

مال غیر اور زن بیگانہ دونوں کو وہ اپنے لئے حرام سمجھتا تھا۔ چنانچہ صاحب مختصر التواریخ لکھتے ہیں۔ ''بر روئے زن بیگانہ و مال مردم نظر بہ خیانت درنمے کرد۔'' ایک شہزادہ نے ایک برہمنی کے ساتھ جو نازیبا حرکت کی اس کیلئے یہ جلیل القدر بادشاہ

برہمن کے گھر ننگے پاؤں گیا اور اس سے معذرت طلب کی۔ راجہ راجور اپنی بیٹی اس کے حضور میں بطور تحفہ بھیجتا ہے اور یہ اسے ماں کہہ کر پکارتا ہے اور جب تک وہ زندہ رہتی ہے۔ بطور ماں کے اس کا ادب واحترام کرتا ہے۔

اس موقعہ پر زونراج ایک لطیف فقرہ بادشاہ کے متعلق چسپاں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بیشک بادشاہ نے اس بات کے لئے قسم کھائی ہوئی تھی کہ میں کبھی کسی غیر عورت کی طرف نظر بھر کے نہ دیکھوں گا اور نہ اس کو اپنی شہوانی خواہشوں کا شکار بناؤں گا۔ لیکن اس کا یہ حلف بے اختیار ٹوٹ گیا۔ جب قسمت اور شہرت کی دیوی اس کے ساتھ آکر ہمکنار ہوگئی۔ یہ دیوی جو مقبولیت اور عظمت کا پیش خیمہ تھی۔ اس بادشاہ سے پہلے کسی اور کے قبضہ میں تھی۔ لیکن اب ہمارے بادشاہ نے اس کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

تاریخ کشمیر کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کرتی کہ اس بادشاہ نے دوسروں کے زرومال پر دست بُرد کی ہو۔ اس نے اپنے باپ اور بھائی کے زمانہ کے ٹیکس بھی رعایا کو معاف کر دیئے۔ زونراج لکھتا ہے کہ رعایا پر جو ٹیکس عاید تھے اور جن کی وجہ سے رعایا دبی جا رہی تھی۔ وہ سب بادشاہ نے موقوف کر دیئے۔

عتاب میں الطاف

یہ بادشاہ ایسا نیک دل اور نیک نیت تھا اور اس کے اخلاق ایسے اعلیٰ تھے کہ جس کسی پر اس کا عتاب بھی نازل ہوتا تھا۔ اس کو اُس وقت درگزر کر کے کسی اور موقع

پر ایسی آسانی اور خوبی کے ساتھ اپنے ملک سے مدد کر دیتا تھا کہ وہ بادشاہ کی ناراضگی سے قطعی لاعلم و بے خبر رہتا تھا (۱)۔ اور اپنی جلاوطنی کو بھی بادشاہ کی عنایت ہی سمجھتا تھا۔ اس کی پالیسی ایسی گہری ہوتی کہ عقلمند سے عقلمند بھی اس کی دوستی و دشمنی میں تمیز نہ کر سکتا تھا (۲)۔

ملک گیری و پیش قدمی کا حامی نہ تھا

بڈشاہ پر اس کی رعایا کا ایک ایک فرد جان دیتا تھا۔ اس کی باقاعدہ پیدل اور سوار فوج بھی کافی تعداد میں تھی اور ملک کی لاج قائم رکھنے کے لئے مرمٹنا معمولی بات سمجھتی تھی۔ کشمیر سے باہر ہندوستان، خراسان، عراق و عرب تک اس کی فیاضی و سیر چشمی اور اس کے اعلیٰ اوصاف کی شہرت تھی۔ اگر وہ ملک گیری و پیش قدمی کا حامی ہوتا تو اندرونی و بیرونی ہر دلعزیزیوں کی وجہ سے یقیناً ہر جگہ کامیاب ہوتا اور جہاں تک چاہتا اپنی مملکت کو درست دے سکتا تھا۔

لیکن ناحق خلق خدا کا خون بہانا اس نے کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ ایسا رحمدل تھا کہ اس نے شکار تک کی ممانعت کر دی تھی۔ پھر وہ انسانوں کا خون کس طرح جائز رکھ سکتا تھا۔ تاریخ جس قدر اس کے حملوں کا پتہ دیتی ہے۔ وہ مدافعتی حملے تھے۔

زونراج بادشاہ کی فوجی پالیسی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ بادشاہ نے خود بخود کبھی کسی ملک پر چڑھائی نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ مدافعانہ حملے کرتا رہا۔ اس کو کشت و خون کرنے سے طبعاً نفرت تھی۔ اس کو ملک گیری اور دولت جمع کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔

پہاڑی علاقوں میں جو رئیس تھے وہ خود بخود بادشاہ کے ماتحت ہوتے چلے گئے۔ تاریخ بہاؤالدین متو کی سطور ذیل سے بھی اس کی فوجی پالیسی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ''اگر کسے از سلاطین اجانب و اطراف تغلب و استیلا برایں نواحے مے نمود۔ سلطان زین العابدین سپہ داران و امرائے لشکرِ خود کشیدہ بہ ایشان جنگ ہائے کرد۔ حدود ولایت خود را از استیلائے ایشاں نگاہ مے داشت''۔

دشمنوں سے سلوک

جو متمرد اور سرکش ہوتے تھے۔ ان کی گوشمالی بھی کرتا تھا۔ جیسا کہ پانڈو چک کو اس نے اس کی بدکرداریوں کی سزا دی اور جو ان میں اصلاح کر لیتے تھے۔ ان کی عزت افزائی بھی کر لیتا تھا (۲)۔ اس موقعہ پر پانڈو چک کے بیٹے حسین چک کو یاد رکھنا چاہیے۔ جو باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا اور ترقی کرتے کرتے دربار شاہی میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں اس نے خدمات شاہی کے باعث بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

سادگی اور انکساری

باوجود اس قدر شان و شوکت اور جاہ و جلال کے یہ بادشاہ ہمیشہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ البتہ تاج کے اندر وہ کلاہ مبارک ضرور رکھتا تھا جو امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ نے اس کے دادا سلطان قطب الدین کو عطا فرمایا تھا اور جو اس کے خاندان میں سلطان

ابوالفتح یعنی فتح شاہ تک (جو بڈشاہ کا پوتا تھا) برابر سر پر پہنا جاتا رہا۔ ابوالفتح کے مرنے کے بعد جب وہ کلاہ اس کے کفن کے ساتھ دفن کردیا گیا تھا۔ تو اسی زمانہ سے ان کی دولت وسلطنت کو زوال آنا شروع ہوگیا تھا۔ (۴۳)

اس کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ علماء فضلاء کو زادراہ بھیج کر مختلف ممالک سے بلواتا اور مناصب جلیلہ عطا کرتا تھا اور پھر ان کے مکانوں پر جاکر ان کی عزت افزائی کرتا اور ان کی صحبتوں سے مستفیض ہوتا تھا۔ اور بعض علماء فضلا وصوفیاء جب حریت صادقہ سے کام لے کر اس کی باتوں سے اختلاف یا ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ تو برا نہیں مانتا تھا اور اگر کبھی ناراض بھی ہوتا تھا تو بہت جلد اپنی پشیمانیوں کا اظہار کرتا تھا۔

خزانہ شاہی پبلک امانت ہے

اس نے سرکاری خزانہ کو ہمیشہ رعایا کی امانت تصور کیا اور جب کبھی اسے خرچ کیا فلاح عامہ اور آسائش رعایا کے خیال کو سب سے مقدم رکھا۔ اس نے شاہی خزانہ کو علوم وفنون کی سرپرستی، زراعتی ترقی اور نہروں کے احداث کے لئے وقف کیا۔ اور بقول صاحب اسلامک کلچران کشمیر بڈشاہ ایسا بادشاہ تھا جو صنعت وحرفت کا معاون، مزارعین کا دوست، علوم وفنون کا مربی، ہندوؤں کا محسن اور اپنی رعایا کا بہی خواہ تھا۔

بادشاہ کے ذاتی اخراجات

سرکاری خزانہ اور شاہی دفائن جب رعایا کے سود بہبود کے کام آتے تھے۔تو بادشاہ اپنے ذاتی اخراجات کہاں سے پورے کرتا تھا؟ اس کے جواب میں صاحب طبقات لکھتے ہیں۔سلطان (۳) کے اپنے روزمرہ کے اخراجات کی کفیل سلطنت نہیں ہوتی تھی۔نہ اس نے خزانے سے کوئی اپنی تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ بلکہ کان مس سے جو اس نے خود دریافت کی تھی اور جہاں صدہا مزدور بیگار پر نہیں بلکہ کام پر لگے رہتے تھے ۔وہ اپنے اخراجات ادا کیا کرتا تھا۔اسی مس کی کان سے سرکاری سکہ جات تیار ہوتے تھے۔

چونکہ بادشاہ علم کیمیا وسیمیا میں بھی بخوبی ماہر تھا۔کان مس کے علاوہ کان جواہر بھی اس نے دریافت کی تھی۔چنانچہ جواہرات زینہ رتن اسی کے نام پر اور اسی کے عہد سے مشہور چلے آتے ہیں۔ان دونوں کانوں کی آمدنیوں سے وہ سیر وتفریح کرتا اور مطربوں اور مغنیوں کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ البتہ علماء وفضلا کی قدر دانیاں، درس گاہوں کے اخراجات، علمی و صنعتی وظائف، غربا وضعفاء کی پرورش اور دیگر امور جن کا تعلق ملک کی خدمت وفلاح سے تھا وہ خزانہ شاہی سے ادا کرتا تھا۔

بادشاہ کی بے تعصبی

بڈشاہ کی بے تعصبی بلکہ مندروں اور بت خانوں کی تعمیر و مرمت کی وجہ سے

اکثر مورخوں نے اس پر بت پرستی کا الزام بھی لگایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خالص اسلامی اخلاق و تعلیم کا پابند تھا۔ جس میں لکھا ہے کہ تم غیر اقوام کی عبادت گاہوں کو مسمار نہ کرو اور ان کے بتوں کو گالیاں نہ دو۔ تاکہ وہ تمہارے سچے خدا کو گالیاں نہ دیں۔ بڈشاہ اپنی عمر کے آخری لمحے تک اس پر قائم رہا۔ بلکہ مرنے سے پیشتر اس نے مندر شنکراچارج کی نہ صرف حفاظت کی۔ بلکہ اس کی مرمت و تعمیر کرا کے اس کو از سر نو زندہ کر دیا۔

تبدیل لباس اور حالات رعایا

بڈشاہ اپنے اوقات عزیز کا بڑا حصہ سیر و سیاحت اور دارالخلافہ کے علاوہ دیگر مقامات کی تعمیرات پر بھی صرف کرتا تھا۔ دیہات و پرگنہ جات میں بھی اس کی آمدورفت رہتی تھی اور ہر چند اس کے فرمان کا بھی عمال پر بڑا اثر تھا کہ کوئی اہلکار کسی شخص سے نذرانہ قبول نہ کرے۔ لیکن اس کے اپنے دورے اور آمدورفت کی وجہ سے بھی افسران مالی و ملکی خوفزدہ رہتے تھے اور اس طرح غریب دیہاتی اور عوام ماتحت حکام کی استبداد کا تختہ مشق بننے سے محفوظ رہتے تھے۔

لیکن اس کی رعایا پروری یہیں ختم نہ ہو جاتی تھی۔ وہ راتوں کو لباس تبدیل کر کے اِدھر اُدھر نکل جاتا اور عام لوگوں میں شامل ہو کر ان کے حقیقی خیالات و جذبات، ان کے مطالبات اور ان کی شکایات سے آگاہی حاصل کرتا اور اپنی ذات کے متعلق لوگوں کے خیالات سنتا۔ لوگ اس کی تعریف کرتے تو یہ خدا کا شکر ادا کرتا اور

زیادہ خدمات کی توفیق رفیق ہونے کے لئے دست بہ دعا ہوتا۔ اگر اپنی کوئی برائی سنتا تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر کسی حاکم کی زیادتی سے اس کے کان آشنا ہوجاتے تو اس کی سرزنش کرتا۔

بادشاہ کی اس نیک عادت کو تاریخ خواجہ اعظمی (۴) اور تاریخ حسن (۵) کے مصنفوں نے نہایت مختصر مگر جامع طور پر مندرجہ ذیل الفاظ میں ادا کیا ہے۔

''بادشاہ رعیت پروری بسیار مے نمود تغیر لباس کردہ سب ہائے برمے آید۔ تا حسن وقبح عمال وعمل خود بشنود۔

بادشاہ کا زہد واتقاء

جس بادشاہ کی نظر میں زن بیگانہ اور مال غیر حرام ہو، جو بادشاہ ہونے اور ہر قسم کی استطاعت رکھنے کے باوجود بیگمات اور کنیزوں کی کثرت سے بے نیاز ہو۔ اس کے زہد واتقاء میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

مشائخ عظام اور علمائے کرام کی خاکپا کو وہ طوطیائے چشم تصور کرتا تھا۔ مساجد ومزارات کی تعمیر میں اس نے فراخ دلی سے کام لیا۔ زینہ لنک میں جو عالی شان محل اس نے تعمیر کرایا، اس میں عبادت خانہ بنائے بغیر نہ رہ سکا۔ جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ ''وبر یک طرف آں از صفحہ عمارتے بہ اتمام رسانیدہ عبادت کدہ بہ جہت پرستش پروردگار خود ترتیب دادہ کہ ازاں نقش برجائے نمے باشد''۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا اس قدر احترام ہے کہ وہ اس کو ولی سمجھ کر اس کے خوارق عادات بیان کرتے ہیں۔

حواشی:

۱) طبقات اکبری سے۔

۲) طبقات اکبری۔

۳) طبقات اکبری۔

۴) ایڈیشن اول صفحہ ۵۰ طبع ۱۳۰۳ھ مطبع محمدی لاہور۔

۵) صفحہ ۱۵ قلمی نقل ۱۳۰۱ھ۔

چھبیسواں باب

دربار بڈشاہی کے ارکان

بادشاہ کے دربار میں ہندو اور مسلمان دونوں مذہبوں کے نمائیندے موجود رہتے تھے۔ جس طرح اکبری دربار کے ارکان ''نورتن اکبری'' کہلاتے ہیں۔ اسی طرح زین العابدین کے ارکان سلطنت ''زینہ رتن'' کے نام سے موسوم کئے جا سکتے ہیں۔ جن کی ایک مختصر فہرست ذیل میں درج ہے۔

نمبر شمار	نام	عہدہ یا خطاب	نمبر شمار	نام	عہدہ یا خطاب
۱	شہزادہ محمد خاں	نائب السلطنت	۱۳	خواجہ بدیع الدین بانڈے	رئیس الملک
۲	شری بٹ	چیف جسٹس	۱۴	احمد رینہ	امیر الجیش
۳	شیو بٹ	افسر الاطبا	۱۵	سید نصیر الدین خانیاری	سفیر
۵	ملک جلال الدین ٹھاکر	مشیر السلطنت	۱۷	گوپال کول	صدر قانونگو قلمرو

۶	مادھوکول	قانوں گوکامراج	۱۸	گنیش کول	قانون گوکامراج
۷	ملک ون ٹھاکر	معتمد درباری	۱۹	حسین چک	امیرالملک
۸	میر علی بخاری	قاضی شہر وصدر مدرس	۲۰	ملا جمال الدین	قاضی القضاۃ
۹	ملا کبیر	شیخ الاسلام	۲۱	میر علی گنائی	مصاحب
۱۰	نتو گنائی	امیر الامراء	۲۲	سداشیو بایو	جوتشی ومنجم
۱۱	سید حسین قمی		۲۳	ملا پارسا	صاحب ومدرس
۱۲	سید محمد بیہقی	مصاحب	۲۴	سید ناصرالدین	مصاحب اعلیٰ

متذکرہ صدر درباریوں میں سے چند ایک کے حالات طبقہ علماء میں درج ہونگے بعض کا ذکر بادشاہ کی ملکی مہمات میں آچکا ہے۔ چند ایک کا ذکر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

افسر الاطبا حکیم شیوبٹ

سلطان کے نامی طبیبوں، ندیموں اور مقربوں میں شیوبٹ کا بہت بڑا درجہ تھا۔ وہ طبابت میں منتخب روزگار تھا اور سلطان اس پر انواع واقسام کی نوازشیں کیا کرتا تھا۔ یہ حکیم شیوبٹ ہی تھا جس کی تحریک وسفارش سے بادشاہ نے حکم دیدیا کہ سلطان سکندر کے زمانے سے جو لوگ جلاوطن ہو کر ممالک غیر میں چلے گئے ہیں۔ وہ وطن میں واپس آسکتے ہیں اور جہاں جہاں ان کی جائیداد ہے۔ وہ اس پر قابض ہو سکتے ہیں اور جہاں جہاں ان کے معابد ہیں وہ ان میں عبادت کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی

بہت سی رعائتیں دیں جن کا ذکر اپنے موقعہ پر ہو چکا ہے۔

یہی شیو بٹ تھا۔ جس نے اس زمانہ میں جبکہ لوگ حب وطن اور قوم پرستی کے جذبات سے محروم اور ایثار وقربانی کے احساسات سے بے بہرہ تھے۔ وہ کام کر دکھایا۔ جس کی مثال اس کے قریباً دوسو سال بعد شاہجہاں کے زمانہ میں جا کر ملی ۔جبکہ بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم کا کامیاب علاج کرنے کے بعد ایک انگریز انعام واکرام کے بدلے اپنی قوم کی تجارت پر سرکاری محصول کا معافی کا خواستگار رہوا۔

شیو بٹ کو بھی بادشاہ کے علاج میں کامیابی حاصل ہوئی اور جب بادشاہ نے اس کو انعام دینا چاہا تو اس نے ذاتی انعام کی بجائے اپنی تمام قوم کے لئے انعام کی درخواست کی اور جزیہ کی معافی طلب کی۔ چنانچہ بادشاہ نے تمام ہندوؤں پر سے جزیہ معاف کر دیا۔

شیو بٹ کے مکانات بھی نوشہرہ راجدھانی ہی میں تھے۔ چنانچہ نوشہرہ سے راجدھانی کے کھنڈروں کو جاتے ہوئے سر راہ محلّہ مدین صاحب آتا ہے۔ اس سے ذرا آگے بائیں طرف ایک مقام ''شری بٹ کی دوکان'' کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ''شری بٹ'' کا دواخانہ تھا۔

شری بٹ تو بادشاہ کا چیف جسٹس تھا۔ اس کو دواخانے سے کیا تعلق؟ معلوم ہوتا ہے۔ شیو بٹ شاہی طبیب اور شری بٹ کے ملتے جلتے ناموں کی وجہ سے یہ مغالطہ عوام میں اب تک چلا آتا ہے اور اگر یہ مقام دواخانہ ہی تھا۔ تو شیو بٹ کا ہوگا نہ کہ شری بٹ کا۔

زونراج شیو بٹ کے متعلق لکھتا ہے۔ وہ بادشاہ کا درباری طبیب اور

سرکاری سرجن تھا۔ بادشاہ کی عنایتوں نے اسے امیر کبیر بنا رکھا تھا اور رفاہ عام کے کاموں میں اپنے محبوب بادشاہ کی طرح پوری دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے بھی شہر میں بڑے بڑے مٹھ تعمیر کرائے۔ جہاں طلبا تعلیم پایا کرتے تھے۔ بادشاہ کی تقلید میں اور بھی کئی وزراء اور اہل دربار رفاہِ عام تعمیرات میں عوام کی دعائیں لیا کرتے اور اپنی نیکیوں میں اضافہ کیا کرتے تھے۔

شیو بٹ ایسا کامل طبیب ہو جس کو اکبری عہد کا نامور مورخ صاحب طبقات اکبری اس فن میں منتخب روزگار لکھتا ہے اور پھر علم طب میں اس کی کوئی تصنیف کشمیر میں نہ مل سکے۔ تعجب ہے۔ ہمارے خیال میں اس نے ضرور اس فن پر کوئی کتاب بلکہ کئی کتابیں لکھی ہونگی۔ جو آج ہماری بدقسمتی سے ناپید و معدوم ہیں۔

شری بٹ وزیر انصاف

شری بٹ کو زینہ ترنگنی میں زونراج ادب واحترام کے ساتھ ''شری شریہ بٹ'' لکھتا ہے۔ بعض مورخوں (۱) نے اس کو بادشاہ کا شاہی طبیب لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ شاہی طبیب اعلیٰ کا نام شیو بٹ تھا۔ شری بٹ وزیر انصاف تھا اور ملک کی تمام عدالتیں اس کے ماتحت تھیں۔ گویا وہ عہد بڈشاہی کا چیف جسٹس تھا۔ زونراج اپنی زینہ ترنگنی میں لکھتا ہے کہ بادشاہ نے مجھے زینہ ترنگنی کی تصنیف کا جو حکم دیا۔ وہ مجھے شریہ بٹ کی معرفت ہی ملا۔ جو تمام عدالتوں کا افسر اعلیٰ تھا۔

زونراج دوسری جگہ شہزادہ محمد خان نائب السلطنت کی موت کے بعد شری بٹ کی وفات کا ذکر بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ انہی ایام میں شری بٹ جو ہماری

عدالتوں کا چیف جسٹس تھا۔ انتقال کر گیا۔ بادشاہ کو اس کی وفات اور اپنے دیگر مقربین کی وفات سے بہت ملال ہوا۔ یہ واقعہ ۱۴۵۹ء سے پیشتر کا ہے۔

طبقات اکبری میں اس کی وفات کے موقعہ پر مصنف لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اس کے اہل وعیال کے لئے ایک کروڑ زر کشمیر جو اکبری سکہ کے مطابق چار سو اشرفیوں کے برابر ہے مقرر کیا۔ طبقات کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ''شری بٹ کہ وزیر سلطان بود چوں از عالم رفت سلطان یک کروڑ زر کشمیر کہ چار صد اشرفی باشد بہ جہت او بہ اطفال تصدیق نمود''۔

سید ناصر الدین بیہقی

سید ناصر سلطان زین العابدین کے مقربان خاص میں تھے۔ سلطان اپنی مجلس میں ان کو (ان کے علم وفضل اور ان کے مشیر با تدبیر ہونے کی وجہ سے) ہمیشہ اپنے آپ پر سبقت وفوقیت دیتا تھا۔ ان کی پوتی یعنی سید حسن کی بیٹی حیات خاتون سے زین العابدین کے پوتے سلطان حسن شاہ نے شادی کی تھی۔ جس سے دو بیٹے محمد اور حسین پیدا ہوئے۔ محمد محمد شاہ کے نام سے تخت کشمیر کا مالک بنا۔

سلطان حسن شاہ کے زمانہ تک سید ناصر زندہ تھے اور وہ چونکہ بڈشاہ جیسے جلیل القدر بادشاہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور سلطنتوں کے بگڑے اور بننے کے وجوہ واسباب سے کما حقہ آگاہی رکھتے تھے۔ انہوں نے حسن شاہ کو اس کی بعض بے اعتدالیوں سے منع کیا۔ لیکن اس نے راہ راست اختیار کرنے کی بجائے آپ کی حریت وحق گوئی سے ناراض ہوکر آپ کو کشمیر سے نکلوا دیا۔ آپ سیدھے دہلی چلے گئے اور وہیں رہ پڑے۔ جب ان کے بعد باہمی خانہ جنگیوں سے کشمیر میں ابتری پھیلنی شروع

ہوئی تو حسن شاہ نے آپ کو یاد کیا۔ آپ اس وقت ضعیف العمر تھے اور سفر کے ناقابل لیکن ملک کی تباہی کی خبریں سن کر آنسو نکل آئے۔ چنانچہ آپ کشمیر کو روانہ ہو گئے اور جب تمام مراحل طے کر کے درہ پیر پنچال کی سر بفلک بلندی پر پہنچے۔ تو طبیعت زیادہ کمزور ہو گئی اور وہیں ٹھہر گئے۔

حسرت یہ اس غریب مسافر کی رویئے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

لیکن قدرت اس وقفہ وقیام ہی کو دم واپسیں بنا رہی تھیں۔ چنانچہ آپ نے اس عالم مجبوری میں جان جان آفرین کو سونپ دی۔

ہائے اے ولولہ خواہش اصلاح وطن
تجھ سا پُر حسرت داراں نہ دیکھا نہ سُنا

ملک مسعود ٹھاکر

ملک کشمیر میں ٹھاکر خاندان (۳) کا بڑا مرتبہ ہے۔ ملک مسعود ملک جلال اسی خاندان کے نونہال تھے۔ بابا داؤد مشکواتیؒ مصنف اسرار الابرار جو خود بھی اسی خاندان سے ہیں۔ شیخ اوتر ٹھکور کے حالات میں اپنا خاندانی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ہم ضحاک بادشاہ کی نسل سے ہیں۔ جب فریدوں ضحاک پر غالب آیا۔ تو ضحاک کی اولاد کوہ غور میں چلی آئی۔ اس خاندان میں سب سے پہلے شبیب نے مذہب اسلام قبول کیا۔ جب غوریوں پر غزنی ودہلی میں زوال آیا۔ تو حوادث روزگر کے باعث ان کا ایک نامور فرد حسن غوری ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ کشمیر چلا آیا

۔شاہان کشمیر نے ان کی نجابت وشجاعت سے آگاہ ہو کر حسن غوری کو عمدۃ الملک کا خطاب دیا۔ لیکن عوام میں وہ صرف ملک کے نام سے مشہور رہے۔ چنانچہ ملک حسن، ملک قاضی ٹھکور، ملک فیروز ٹھکور، ملک جلال سب اسی نام سے شہرت پذیر ہوئے۔ ملک مسعود بڈشاہ کے عہد حکومت میں سپہ سالاری اور وزارت تک کے عہدوں پر رہا ہے۔ اس کے تدبیر وانتظام کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ بادشاہ ہمیشہ اس مدبر جرنیل کا مداح رہا ہے۔ باوجود اس عہدہ اوران سرکاری مصروفیتوں کے اس کو بابا اسمٰعیل زاہد کبردی سے بیعت بھی تھی۔ اخیر عمر میں مجاہدہ وگوشہ عزلت سے زیادہ سروکار رہا۔

مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ ملک مسعود بادشاہ کی وفات کے ۱۳ سال بعد ۹۱۰ھ میں انتقال کر گیا اور اپنے باغ فتح کدل کے قرب وجوار میں دفن ہوا۔ لیکن عہد بڈشاہی کا نامور مورخ جونراج زینہ ترنگنی میں لکھتا ہے کہ ملک مسعود ٹھاکور کو بادشاہ کی زندگی ہی میں بادشاہ کے رضاعی بھائیوں نے حسد وعداوت کی وجہ سے قتل کر دیا تھا اور اس واقعہ کا ذکر اسی کتاب میں کہیں پہلے بھی آچکا ہے۔

ملک ون ٹھاکور

اپنے بھائی ملک مسعود ٹھاکور کی طرح دن ٹھاکور بھی بادشاہ کے مقربوں اور معتمدوں میں تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے بادشاہ سے اجازت طلب کی۔ قاتل ہر چند بادشا کے رضاعی بھائی تھے۔ تاہم اس نے ازراہِ انصاف وعدل ون ٹھاکور کو بدلہ لینے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ ون نے بادشاہ کے ایک رضاعی

بھائی شورنامی کو اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا۔

ون ٹھاکور کے متعلق زونراج لکھتا ہے۔ اس نے بہت سے متبرک استھانوں کی زیارت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ شاید وہ کشمیر سے باہر بھی بزرگان دین کے آستانوں کی زیارت کے لئے گیا ہو۔ آخر جب وہ اس مقام پر آیا جہاں سیندھیا نمک کا محصول لیا جاتا تھا تو وہاں وہ بیمار ہو گیا اور چند دنوں کے بعد وہیں انتقال کر گیا۔

ملک جلال ٹھاکور

یہ ملک مسعود ٹھاکور کا فرزند، ون ٹھاکور کا بھتیجا، ملک سیف الدین وزیر سلطان سکندر بت شکن کا داماد اور بچھی خاتون کا خاوند تھا۔ بچھی خاتون اپنے علم و فضل اور اپنے نیک کاموں کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ اس کا نام نہر بچھی کوہل کی وجہ سے جو جامع مسجد تک پانی پہنچانے کے لئے اس نے جاری کی تھی۔ اب تک کشمیر میں زندہ ہے۔ یہ نہر نوشہرہ کے محلات شاہی کی نہر سے نکالی گئی تھی۔ اس نے اس پر ایک مضبوط بند تعمیر کرایا تھا۔ نہر کی رسم افتتاح کے موقعہ پر جب پانی چھوڑا گیا اور جامع مسجد تک پہنچ گیا تو بچھی خاتون کی طرف سے اسی ہزار آدمیوں کو دعوت طعام دی گئی۔

ملک جلال کے اور بھی کئی بھائی تھے۔ بادشاہ نے ان کی ذاتی خدمات اور ان کے خاندانی لحاظ سے پرگنہ شاورا میں ان کو چند دیہات عطا کئے تھے۔

بادشاہ کی وفات کے بعد سب بھائیوں نے سرکاری ملازمتیں ترک کر کے زہد و خلوت کی زندگی اختیار کر لی۔ ملک جلال نے محلّہ گوجوارہ میں خانقاہ تعمیر کی اور آخر

وہیں دفن ہوئے۔ شیخ سلطان کاشمیریؒ۔ شیخ بہاؤالدین گنج بخشؒ اور شیخ نورالدین ولی کے صحبت یافتوں میں تھے۔

حواشی:

۱) مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم میں راقم بھی شری بٹ کو طبیب شاہی لکھ چکا ہے۔ جو بعد کے مطالعہ وتحقیقات سے غلط ثابت ہوا ہے۔

۲) ٹھاکور یا ٹھکور کی صحیح وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہوسکی۔ بابا داؤد مشکواتیؒ جو اسی خاندان سے شاہجہاں کے زمانہ میں ایک عارف کامل بزرگ ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ٹھکور ہم غوریوں کا نام ہندوستان میں ہی رکھا گیا تھا۔ جس کے معنی پیشوا کے ہیں۔ مولوی سعادت مفتی گلشن کشمیر میں لکھتے ہیں۔ ٹھکور کے معنی پہلوان اور شہ زور کے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں لکھتا کہ ٹھکور ہے کس زبان کا لفظ اور اس خاندان کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا۔ لیکن اس معمہ کا کچھ حل زونراج کی زینہ ترنگی کے مطالعہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ وہاں زونراج بادشاہ کے بھائی شہزادہ محمد خاں کے متعلق لکھتا ہے کہ شہزادہ بہت اچھا ٹھکور تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ ہندو عہد قدیم کا لفظ ہے۔ جو وزراء امراء کو بطور خطاب ملا کرتا تھا۔ بادشاہ نے بھی اسی لفظ کو برقرار رکھا ہوگا۔ چنانچہ اس کے حقیقی بھائی نائب السلطنت کے نام کے ساتھ ہی ہم ٹھاکور کا لفظ دیکھتے ہیں۔ چونکہ ملک مسعود بادشاہ کا مقرب اور رئیس تھا۔ اس کو بھی خطاب ملا ہوگا۔ زونراج نے اس کے نام کے ساتھ ٹھاکور کا لفظ لکھا ہے۔ اس قول کے مطابق کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جموں وکشمیر کے موجودہ فرمانروا مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر نے بھی دو مسلمان رؤسا کو جاگیروں کے علاوہ ٹھاکور کا لفظ عطا کیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک سید ہے اور ایک افغان ہے۔ ٹھاکور اور ٹھاکر ایک ہی لفظ ہے اور اس زمانہ میں اس کو عموماً راجپوت ہی استعمال کیا کرتے ہیں۔

ستائیسواں باب

عہد بڈشاہی کے مورخ وشاعر

شریور نے اپنی تاریخ میں اکثر جگہ بادشاہ کی شاعری اور شعرنوازی کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔ جب مانڈو کے فرمانروا کھلشا کو اس کے تحائف وہدایا کے جواب میں بادشاہ نے اپنے ملک کی بعض قیمتی اشیا ارسال کیں۔ تو اپنی ایک نظم بھی اپنے ایلچیوں کے ہاتھ اسے بھیجی۔ جو کشمیری زبان میں تھی۔

بادشاہ کے چند اشعار کشمیر کی قدیم بیاضوں سے فارسی زبان میں بھی ملتے ہیں لیکن جن دو نظموں کا ذکر کشمیر کے اسلامی مورخوں نے اپنی تاریخوں میں کیا ہے ان کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ مثلاً کشمیر میں ایک مناجات بزبان عربی بطور وظیفہ پڑھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڈشاہ کی تصنیف سے ہے۔ لیکن کسی تاریخ دان وتاریخ نویس کو اس پر وثوق واعتبار نہیں ہے۔ پھر سب سے پہلے حیدر ملک چاڈورہ کی تاریخ میں بادشاہ کی فارسی شاعری کے متعلق ہمیں یہ چند سطور نظر آتی ہیں۔

''خود ہم سلطان سخنور بورو قطبی تخلص داشت۔ چنانچہ ایں دوبیت رنگین از نتیجہ طبع وقار سلطان است کہ ابراو مے یابد''۔

اے بگر وشمع رویت عالمے پروانہ   وزلب شیرین تو شور لیت در ہر خانہ

سن بہ چندیں آشنائی مے خورم خون جگر آشنارا حال این است وائے ہر بیگانہ

ان کے علاوہ ایک قدیم بیاض میں جو پیر شمس الدین صاحب حیرت پاندانی سرینگر (کشمیر) کے پاس محفوظ ہے۔ چند دیگر شعراء کی غزلوں کے ساتھ جو اسی زمین اور اسی قافیہ میں ہیں۔ پہلے اشعار کے بعد یہ دو شعر بھی بڈشاہ کے نام درج ہیں ۔

منزل غمہائے تو شد سینہ نالان من لاجرم شد ہمنشیں گنجے وہم ویرانہ

ماہ من گر میتوانی رحم کُن بر بید لاں کرز تو ماند ایں حکایت در جہاں افسانہ

مگر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں خواجہ محمد اعظم نے جو تاریخ ''واقعات کشمیر'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے پہلے دو شعروں کو سلطان قطب الدین یعنی بڈشاہ کے دادا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بلکہ ان دو کے علاوہ ایک اور شعر لکھا ہے جس میں قطب تخلص بھی ہے اور وہ یہ ہے ۔

قطب مسکیں گر گنا ہے میکند عیش مکن

عیب نہ بود گر گنا ہے میکند دیوانہ

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد کا مصنف و مورخ پنڈت بیر بل کاچرو بھی مندرجہ صدر شعر نقل کر کے لکھتا ہے۔ ''اکثرے میل خاطر بہ شعر وسخن مے نمود و قطب تخلص خود مے خواند و دیوان قطبی از زادہ طبع او مشہور است''۔ لیکن تعجب ہے وہ دیوان مشہور بھی ہے۔ لیکن اس مشہور دیوان میں سے جو مورخ اس کے اشعار کا حوالہ دیتا ہے۔ صرف یہی دو تین شعر لکھتا ہے۔ اس لئے یہ اشعار بڈشاہ کے نہیں بلکہ سلطان قطب الدین ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ شاعر بھی تھا اور صاحب دیوان بھی۔ مورخ اس کے دیوان کا نام بھی دیوان قطبی بتاتے ہیں اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

البتہ فارسی میں بڈشاہ کا ایک مصدقہ شعر ملک الشعراء ملا احمد کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔ چند شعر بیاض نامی (غیر مطبوعہ) میں نظر سے گزرے ہیں۔ جن کو بڈشاہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حسب ذیل ہے۔

جہاں نتواں ستر دن نقش عشق سر شکن ہرگز
حکایت ہا زبانِ تیشہ، فرہادے گردد

سو سال کے بعد حضرت یعقوب صرفی کاشمیریؒ (اکبر کے زمانہ میں) اس کی تضمین اس طرح کرتے ہیں ۔

نگردد کم نوائے بلبل از شور زغن ہرگز
نہ ساز و محو ہنگامہ خزانہ حرف چمن ہرگز
غم دنیا نہ ساز و تلخ فکر عیش من ہرگز
جہاں نتواں ستر دن نقش عشق سر شکن ہرگز
حکایت ہا زبانِ تیشہٗ فرہادے گردد

بیاض سرخوش میں جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ ایک رباعی درج ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے۔ یہ رباعی سلطان کی ہے اور وہ رباعی حسب ذیل ہے۔

تاشام حساب ملک گیری کردم — برتخت بلند قدر میری کردم
چوں بست جہاں بہ خواب غفلت عہدے — من رفتم و فکر عہد پیری کردم

کشمیر میں اکثر شعراء کے تذکرے بھی ہیں اور بیاضیں بھی۔ راقم نے بھی کئی ایک بیاضیں دیکھیں۔ مگر افسوس ہے کہ دور بڈشاہی کے شعراء کے اشعار و حالات حسب خواہش نہ مل سکے۔

قاضی حمید

حمید الدین نام تھا۔ ان کے بزرگ قضا کے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس لئے قاضی کہلاتے تھے۔ ان کا ذکر کسی دوسری جگہ تفصیل سے نظر نہیں آیا۔ تاریخ حسن (غیر مطبوعہ) میں صرف ایک سطر درج ہے۔ ''قاضی حمید درزمان بڈشاہ تاریخ تصنیف کردہ است نقل آں نایاب''۔ قاضی حمید دنیا میں نہیں ہے بلکہ اس کی کتاب بھی نایاب ہے۔ لیکن صاحب کتاب یعنی مورخ ہونے کی حیثیت سے تاریخوں میں اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔ سچ ہے۔

رہتا ہے ذوق نام سخن سے ابد تلک — اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

نظر بند کاشغری شہزادہ

بیاض سرخوش میں ایک واقعہ قدر دانی شعرا کا درج ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنگ تبت و کاشغر کے بعد بادشاہ جب واپس آیا۔ تو بطور یرغمال ایک شہزادہ بھی ساتھ لایا۔ وہ شہزادہ شاعر تھا۔ ایک دن بادشاہ کی مجلس آراستہ تھی اور شہزادہ بھی اس میں موجود تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا اپنی حکومت کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک تم نے کیا دیکھا اور کیا تجربہ حاصل کیا ہے۔ شہزادے نے اس کے جواب میں فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے۔

کجکول گداؤ تاج شاہی دیدم — مسکینی و نیز کج کلاہی دیدم

ارغون ندانست کہ دنیا فانی است — زیں جملہ بدست روسیاہی دیدم

بادشاہ شہزادہ کے فی البدیہہ اور منظوم جواب سے بہت خوش ہوا اور اسے رہا کردیا۔ بیاض سرخوش کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ''سلطان یکے راازسر برآوردگان سرحد چین یرغمال آوردہ بود مدتے درشہر کشمیر بند ماند طبیعت موزون داشت ۔روزے درخدمت سلطان نشتہ بود ۔سلطان فرمود۔ اززمان حکومت خود تابہ ایں زماں چہ یافتی۔آں فی البدیہہ بعرض رسانید (اس کے آگے وہ رباعی درج ہے۔ جواوپر درج ہوچکی ہے)''۔

''زمان حکومت خود'' کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ شہزادہ کسی علاقہ کا خودمختار حاکم بھی تھا۔ بہرحال وہ کشمیر میں اتنی دیر تک رہ چکا اور اس ملک سے اتنا مانوس ہوچکا تھا اور بادشاہ کی قدر افزائیوں اور علم نوازیوں نے اس کے دل میں اس قدر اثر کرلیا تھا کہ آزاد ہونے کے بعد مرتے دم تک وہ کشمیر میں ہی رہا ۔

صیاد اب چمن سے کیا کیجئے کنارا　　جینا اسی چمن میں مرنا اسی چمن میں (ا)

علاقہ پھاگ میں جو ہارون سے اوپر گاندربل کے متصل ہے۔ایک قبرارگن صاحب کے نام سے مشہور ہے۔وہ اسی ارغون شہزادے کی قبر ہے۔اس کا سنگ مزار بڈشاہی عہد کے مزارات سے ملتا ہے۔

پنڈت زونراج

دارالترجمہ میں تاریخ نویسی کے عہدے پرممتاز اور بادشاہ کے معزز درباریوں میں تھا۔تاریخ نویسی میں اس کو ملک احمد علامہ کا ہم پلہ بتایا گیا ہے۔زونراج نے کلہن کے مابعد

زمانے سے لیکر سلطان زین العابدین کے وقت کے حالات بزبان سنسکرت نظم میں قلمبند کئے ہیں۔ جس پر سلطان نے بذریعہ انعام واکرام اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ زونراج کی تاریخ کا نام اس کے اپنے اور بادشاہ زین العابدین کے نام پر زینہ ترنگنی مشہور ہے۔

سٹین صاحب نے اپنے ترجمہ اور نوٹوں میں زینہ ترنگنی کے اکثر حوالہ جات دیئے ہیں اور زونراج کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ زونراج نے اپنی زینہ ترنگنی میں ہندوؤں کے آخری عہد سے لیکر سلطان زین العابدین کے زمانہ تک کے حالات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

زونراج بڑا عالم وفاضل تھا اور کشمیر کے تاریخی حالات پر اسے کامل عبور تھا۔ بادشاہ کی وفات سے پندرہ سال پیشتر ۱۴۵۹ھ (۲) میں کہ ابھی زینہ ترنگنی اختتام تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ زونراج ع کاردنیا کسے تمام نہ کرد کے مطابق اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اس عالم فانی سے رخصت ہوگیا۔

بادشاہ کی زندگی میں صرف زونراج ہی نے سفر آخرت اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس کی طویل حکومت میں اس کے کئی مصاحب اور وزیر ومشیر بھی ایک ایک کر کے چل بسے اور بالآخر اس کے حال پر استاد داغ کا یہ شعر صادق آنے لگا۔

ہوش وحواس وعقل وخرد جا چکے ہیں سب
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

زونراج کی زینہ ترنگنی کا ترجمہ کلکتہ میں اجے سی دت نے ۱۸۹۸ء میں کیا ہے۔ اس تاریخ میں ۱۱۴۹ء سے ۱۴۵۹ء تک یعنی تین سو دس سال کے حالات درج ہیں۔ اسی سال زونراج کی موت کے باعث یہ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے یہ تاریخ

شروع کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی تاریخ کے دیباچہ میں اس کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔

ابتدائے کشمیر سے لیکر جے سنگھ کے زمانہ تک کے حالات کلہن نے لکھے ہیں۔ لیکن یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ اس کے بعد کسی مصنف نے حالات کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے اس طرف توجہ نہ کی اور نہ کسی شاعر اور نہ کسی فرمانروا کو اپنے ملک کی تاریخ مکمل کرنے کا خیال آیا۔ اب جبکہ شری زین العابدین کشمیر کا بادشاہ ہے۔ زونراج جو اس زمانہ کا مصنف ہے۔ تاریخ قلمبند کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ جے سنگھ سے لیکر شری زین العابدین اور مصنف کے زمانے تک جس قدر راجے اور بادشاہ اس ملک میں گزرے ہے وہ فراموشی کے سمندر میں غرق ہو چکے تھے۔ اگر شری زین العابدین غواصی سے کام نہ لیتا تو ان غرق شدہ فرمانرواؤں کو فراموشی اور گمنامی کے سمندر سے باہر نکالنے کی کس کو جراءت ہوتی۔ چنانچہ بادشاہ نے اس غرض کے لئے ملک کے شریف الطبع نامور شخص شری شریہ بٹ کی وساطت سے جو تمام عدالتوں کا حاکم اعلیٰ ہے مجھے تاریخ لکھنے اور گزشتہ سلسلہ قائم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

سوم پنڈت

دارالترجمہ کے معزز وسربرآوردہ ارکان میں تھا۔ کشمیر کی تاریخوں کے علاوہ اس کا ذکر صاحب طبقات نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ سوم پنڈت سلطان کے دانشمند درباریوں میں تھا۔ وہ کشمیری زبان میں اعلیٰ شعر کہتا تھا اور ہندی علوم (سنسکرت) کے علاوہ فارسی، عربی اور تبّتی زبانوں میں اسے بڑی مہارت تھی۔ اس نے زین چرت نام ایک کتاب بادشاہ کے نام پر لکھی۔ جس میں اس کے عہد کے تمام

واقعات بالتفصیل درج کیئے۔

شریوراس کے متعلق لکھتا ہے۔زینہ چرت جس میں بادشاہ کی زندگی کے واقعات تھے۔کشمیری زبان میں تھی اور مصنف نے اپنے عہد تک کے حالات لکھ کر اس کتاب کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔شریور سوم پنڈت کا نام اپنی تاریخ میں ات سوم لکھتا ہے۔

اسے علم موسیقی میں بھی دخل تھا اور اس علم میں مانک نام ایک کتاب اس نے لکھی تھی۔اس لئے وہ ہمیشہ مورد الطاف شاہی رہا۔عربی، فارسی کی کئی کتابوں کا اس نے بادشاہ کے حکم سے ہندی زبانوں میں ترجمہ کیا۔

سوم پنڈت کی زینہ چرت بھی آج صفحہ دنیا سے محو و معدوم ہے۔کشمیر کے یہ علمی وتاریخی جواہرات خدا جانے کسی کتب خانے کی زینت ہیں یا کسی سلطنت کے انقلاب کی نذر ہو چکے ہیں۔یا کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن گئے ہیں۔اگر یہ روشنی میں آجائیں تو دنیا کو معلوم ہو جائے کہ کشمیر کا یہ چھوٹا سا مگر خوبصورت ملک جو آج اپنی علمی واخلاقی اور سیاسی و مالی کم مائیگی کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں حقیر سمجھا جارہا ہے۔ ہمیشہ سے اسی طرح نہ تھا۔اس میں علم کے دریا بہتے تھے۔اخلاق کے چشمے اُبلتے تھے۔ اس کی سیاسیات کشمیر کی حدود سے باہر جا کر کہیں چین و تبت اور کاشغر کے ساتھ ٹکراتی تھیں اور کہیں پنجاب وسندھ کو عبور کر کے شاہان دہلی سے دو چار ہوتی تھیں۔اس کی اقتصادیات کا یہ عالم تھا کہ دور دراز ملکوں سے لوگ اس ملک کی قدر دانیاں اور فیاضیاں سنکر آتے تھے اور مالا مال ہوتے تھے۔لیکن آہ آج یہ سب باتیں ایک افسانہ سی معلوم ہوتی ہیں۔

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش   دنیا یہی ہے تو کیا یاد رہے گی

پنڈت شریور

یہ شاعر بھی تھا اور مورخ بھی اور بادشاہ کے مقربان خاص میں درجہ امتیاز بھی رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے آخری ایام میں اس کی تسکین خاطر کے لئے بعض روحانی کتب کی کتھائیں بھی اس کو سنایا کرتا تھا اور رات دن اسی کے پاس رہتا تھا۔ اس نے صرف بڈشاہ کا زمانہ ہی نہیں دیکھا۔ بلکہ اس کے بیٹوں اور پوتوں سے چار (۴) بادشاہوں کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ان سب بادشاہوں کے درباروں میں اس کا بڈشاہی اعزاز قائم رہا ہے۔ اس نے اپنی تاریخ کا نام زینہ راج ترنگنی رکھا۔ جس میں زونراج کی وفات ۱۴۵۹ء سے لیکر ۱۴۸۶ء یعنی سلطان فتح شاہ بادشاہ کشمیر کی تخت نشینی تک کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔

شریور کی نظم ونثر سب سنسکرت زبان میں تھی جیسا کہ سابقہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے طبع زاد اشعار بڈشاہی توپ پر بھی پیتل کے الفاظ میں کندہ کرائے گئے تھے۔ اس کی تاریخ کا انگریزی ترجمہ بھی جے سی دت (جگدیش چندر دت) نے کلکتہ میں کر دیا ہے۔ شریور اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔ "میں زونراج کا شاگرد ہوں۔ میرا نام شریور پنڈت ہے۔ زونراج کی وفات کے بعد بادشاہ کے جو قابل ذکر حالات ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے بعد اسی کی ذریات سے جن دوسرے بادشاہوں نے کشمیر پر حکومت کی ہے۔ ان کے حالات اپنی تاریخ میں لکھتا ہوں"۔

لکھتا ہے۔ بڈشاہ نے اپنے فرزندوں کی طرح میری پرورش کی ہے۔ اس نے مجھے جاگیر بھی عطا کی اور مجھ پر ایسی شاہانہ نوازشیں کین کہ بہت کم لوگوں کو نصیب

ہوسکیں۔ ایسے قدردان بادشاہ کے حالات میں نہ لکھوں تو اور کون لکھے۔ میری تاریخ ان بادشاہوں اور ان لوگوں کی شہرت و عظمت کی یاد اہل ملک کے دلوں میں تازہ کرے گی۔ جو آج اس دنیائے فانی میں موجود نہیں ہیں۔ میرا بادشاہ اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ بنگال، مالوہ،۔ انبیر (۴)، گوڑ (مغربی بنگال) اور کرناٹ (۵) تک نہ نمٹنے والی شہرت کا مالک ہے۔

شریور اپنی تاریخ میں جگہ جگہ بڈشاہ کی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے جو لوگ اہل ہنر تھے اور مختلف فنون سے آگاہ تھے اور دستکاری اور صنعت جانتے تھے۔ بادشاہ ان کا دلدادہ تھا اور ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس نے اپنی ذات شاعروں کی قدر افزائی اور اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

شریور بادشاہ کے حالات پر تبصرہ اور اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہوا لکھتا ہے۔ بادشاہ کے سر سے بچپن ہی میں اس کے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ کئی دفعہ وزراء کے ساتھ اس کو مقابلہ کرنا پڑا۔ پھر بھائی کے ساتھ اس کو جنگ آزمائی کرنی پڑی اور چند ایام اس نے اپنے ملک سے باہر بھی گزارے۔ رضاعی بھائیوں نے اس کو تکلیفیں دیں اور آخر میں اس کے فرزندوں نے اس کی نافرمانیاں کیں۔ جو اس کے مرتے دم تک جاری رہیں۔

مطلب یہ کہ اگر یہ واقعات اس کو پیش نہ آتے تو وہ عدل پروری اور رعایا نوازی اور سرپرستی علوم و فنون کے لحاظ سے دنیا کے اعظم ترین بادشاہوں میں ہوتا۔

ملک الشعراء ملا احمد بڈشاہی

ملا احمد کاشمیری بڈشاہ کے دارالترجمہ ودارالتصانیف کی روح رواں تھا۔ ملا احمد نے بادشاہ کے حکم سے رتنہ پوران اور راج ترنگنی جیسی قدیم سنسکرت تاریخوں کو فارسی کالباس پہنایا اور نام اپنی تاریخ کا ''وقائع کشمیر'' رکھا۔

ملا احمد کی قوت استدلال، مطافت طبع اور قادر الکلامی کا تمام مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ دربار شاہی کے علمی مباحثوں میں جونامور ادباوشعرا حصہ لیتے تھے۔ ملک الشعراملا احمد ان سب کا سرتاج تھا۔

ایک دن بزم آراستہ تھی۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ افروز تھے۔ ملا احمد دستار کا شملہ پیشانی پر شاخ دار لٹکا کر جھومتے جھامتے بلکہ ہانپتے دربار میں آئے۔ بادشاہ نے مسکرا نی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔ ؎

شاخ پیشانی ملا احمد کشمیر یہ ہیں
گرنہ دیدستی تو درآفاق انساں شاخوار

بادشاہ مذاق صحیح اور طبع سلیم رکھتا تھا۔ اس کے درباری مصاحب اور شعرا بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ملا احمد تو ملک الشعرا ہی تھا۔ فوراً بول اٹھا۔ ؎

شاخ پیشانی خدیو اکر گ دارے داشتم
تانیا یم درمیان مادہ گاواں درشمار

جواب کی برجستگی ملک الشعرا ملا احمد کے ذہن رسا کا پتہ دے رہی ہے۔

تاریخی اوراق میں ملا احمد کے استاد کا نام ملا محمد افضل بخاری ثم الکشمیری بتایا جاتا ہے۔ شاگرد نے اپنے استاد کی زندگی ہی میں ملک الشعرا کا خطاب اور بادشاہ کی

مصاحبت وقربت کا اعزاز حاصل کرلیا تھا۔لیکن اس منتہائے کمال پر بھی ملا احمد اپنے استاد کی خدمت گزاری اپنا فخر سمجھتا تھا۔

احسان یہی ہے فخر میرا شاگرد جلالؔ لکھنوی ہوں

مناظرہ ومباحثہ وبدیہہ گوئی میں فرد کامل تھا۔"وقائع کشمیر" کے علاوہ مہابھارت کا فارسی ترجمہ بھی اسی کی یادگار ہے۔مرنے کے بعد ملک پورہ یعنی مزار السلاطین میں جگہ پائی۔حسد اور حاسدوں سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔مولانا احمد بھی اس سے نہ بچ سکے۔جب دربار سے ملک الشعراء کا خطاب ملا۔حاسد اور بھی جل گئے۔آخر کہہ سنکر بادشاہ کو ملا احمد سے برافروختہ کرادیا۔یہانتک کو ملاّ بیچارہ پکھلی (ہزارہ) چلا گیا اور ایک مدت تک وہاں سرگرداں رہا۔آخر یہ رباعی لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں بجھوائی ؎

نے بہ منطق زجزوکل اثرے نے یہ نحوم زمتبدا خیرے

احمد ازغیر منصرف خوانند برمن این کسر وجر چرادانند

سلطان اس رباعی کے ملاحظہ ومطالعہ سے بہت خوش ہوا۔مولانا کو واپس بلایا اور بیش از بیش انعام عطا فرمایا۔(۶)

ایک دن ملا احمد (۷) نوشہرہ میں سلطان کی خدمت میں حاضر تھا۔ایک فقیر ہاتھ میں کاسہء گدائی یعنی کچکول لئے آیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ اسے بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔بادشاہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔طیش میں آکر فرمایا۔یہ کچکول تم کو کس نے دیا ہے؟ وہ تو خاموش ہو رہا۔ملا احمد اٹھا اور فی البدیہہ بولا۔

اسے آنکہ ترا تاجوری دادسری داد در دست گدا کوزہ دریوزہ گری داد

اس شعر کا سننا تھا کہ بادشاہ کا غصہ فرد ہو گیا۔

ملا احمد کے متفرق اشعار جو مختلف تاریخوں اور بیاضوں سے مل سکے ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

تا خبر سار شدم بے خبر خویشتنم (۸) نیستم نیستم ار در نظر خویشتنم
شکوہ واقعہ ہائے کہ ازل برماتست موئے. افتاد ملال وگہر خویشتنم
از کوئے کہ شد موج خیالم کہ کز انجام ہر کاوش دل گل بہ کنار است دریں باغ
مرہون رگ گل شدہ ہر نالہ بلبل زاں ساں کہ صدا در پئے خار است دریں باغ

معلوم ہوتا ہے اصل وطن کشمیر نہیں تھا۔ البتہ بادشاہ کی عنایات نے کشمیر کو وطن بنانے پر مجبور کر دیا تھا اور کمالات علمی بھی کشمیر سے باہر ہی حاصل کئے تھے۔ چنانچہ علماء ہدایت اللہ (۹) اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ ”بعد تحصیل کمالات علمی در عنفوان جوانی بہ کشمیر رسید“۔

ملک الشعراء ملا نادری

ملا نادری کی تاریخ کشمیر اور اس کی شاعری کا ذکر اکثر تاریخوں اور بیاضوں میں درج ہے۔ لیکن نہ اس کا دیوان کہیں ملتا ہے اور نہ اس کی تاریخ کا کوئی پتہ چلتا ہے۔

عہد جہانگیری کا مصنف حیدر ملک چاڈورہ اپنی تاریخ میں ملا نادری کا سرکاری خطاب ملک الشعراء لکھتا ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ ”مولانا نادری (۱۰) کے بعد از ملا احمد کاشمیری بہ منصب ملک الشعرای مفوض بود۔ در بعض مصنفات خود آوردہ۔ ان الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نادری نے تاریخ اور دیوان

کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔

ملا ہدایت اللہ جو ۱۱۷۵ھ سے ۱۲۰۶ھ تک عہدہ شیخ الاسلامی پر رہے ہیں مصاحبین بڈشاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا نادری کے حالات میں لکھتے ہیں۔ ''طبع موزون داشت اشعار آبدارمے گفت تاریخ کشمیر ازوے یادگار است''۔ لیکن وہ تاریخ ہے کہاں اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ ''مگر بہ نظر وقائع نگار نہ رسید''۔

صاحب تاریخ حسن بھی ملا نادری کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔''اسمش معلوم و جسمش معدوم''۔ صرف آپ کا ایک ہی شعر ملا ہے۔ وہی درج ہے۔

برقع نوراست بر رخسار آتش ناک تو
یا زتاب عارضت آتش فتادہ در نقاب (۱۱)

برقعہ کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ زمانہ بڈشاہی میں بھی اس کا رواج تھا۔ خواہ وہ کسی صورت میں تھا۔

سلطان محمد شاعر

صاحب طبقات اکبری بڈشاہ کے حالات میں ایک شاعر سلطان محمد کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ وہ اہل علم ہونے کے علاوہ نہایت زیرک ودانا تھا۔ ہر قسم کے بحر اور قافیہ میں بدیہہ اشعار کہتا تھا اور جب کبھی مشکل سے مشکل سوال اس سے کیا جاتا۔ وہ اسی وقت اور بے تامل اس کا حل کردیتا۔ افسوس ہے۔ صاحب طبقات نے اس کا کوئی شعر اور اس کی بدیہہ گوئی کا کوئی اور واقعہ درج نہیں کیا۔

یودہ بٹ

اس کا ذکر بادشاہ کے درباری موسیقی دانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ کشمیری زبان کا زبردست شاعر تھا۔ اس نے بڈشاہ کے ایک واقعہ کا ڈراما کشمیری زبان میں ہی زین پرکاش (جین پرکاش) کے نام سے لکھا ہے۔ جو بعض دیگر کتابوں کی طرح کشمیر میں معدوم ہے۔

بٹ اوتار یا اوتار بٹ

اس نے زینہ ولاس (جینہ ولاس) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جس میں بادشاہ کے فرامین وارشادات جو ملکی افسران اور ماتحت والیان ملک کے نام تھے اور وہ احکام جو کبھی کبھی اپنی عزیز رعایا کے نام جاری کیا کرتا تھا درج تھے۔ ملک کی بدقسمتی سے یہ کتاب بھی اب آش معلوم و جسمش معدوم کی طرح نابود ہے۔

منصور بن محمد حکیم و شاعر

کفایہ مجاہدہ جو فارسی میں علم طب کی ایک نادر کتاب ہے۔ اسی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب کفایہ منصوری کے نام سے مطبع نولکشور کانپور و لکھنو میں چھپ چکی ہے اور اسی مطبع نے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپ دیا ہے۔ مصنف نے اپنا پورا نام کتاب کے دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے "منصور بن محمد بن احمد بن یوسف بن قیصر الیاس"۔ یہ کتاب بڑی ضخیم اور طب کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ اہل کشمیر اس کتاب سے بالکل لاعلم ہیں۔ مصنف اعضائے مفردہ کے بیان میں بدن کی ایک ایک

ہڈی کا ذکر کرتا ہے۔ دماغ، جبڑے، گردن، پشت، سینہ، انگلیاں، پاؤں، پنڈلی، ٹخنہ، ایڑی، کلائی، ناک۔ غرض تمام اعضا کی اس نے ۲۴۸ ہڈیاں بتائی ہیں اور پھر معمہ کے طور پر یہ دلچسپ شعر لکھا ہے۔

عدد عظم چو خواہی کو بدانی بہ یقین   مے بروں آید ازاں جا کہ بروں مے آئی

یعنی اگر تو بدن کی ہڈیوں کو شمار کرنا چاہیے تو یقین جان کہ وہ اس لفظ کے عدد سے نکلتی ہیں۔ جس سے کہ تو باہر آیا ہے۔ مطلب یہ کہ آدمی رحم کے اندر سے نکلتا ہے۔ رحم کے عدد ۲۴۸ ہوتے ہیں۔ پس اسی کے موافق بدن کی تمام ہڈیاں سر سے پاؤں تک ۲۴۸ شمار کرنی چاہیں۔

منصور بن محمد نے حکمت وطب کی یہ کتاب بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے۔ ترجمہ: "بندہ نے بھی فتراک سعادت پر ہاتھ مار کر اس متاع قلیل کو ترقی کا وسیلہ جان کر بارگاہ کیوان میں نذر کیا۔ یہاں تک کہ صراف بازار حیرت اور نقاد ارباب سلطنت یعنی حضرت سلطنت پناہ کی نظر کیمیا خاصیت سے یہ کتاب مشرف ہوئی"۔

بادشاہ سے جواس کو عقیدت تھی۔ وہ اس کے الفاظ ذیل سے جواس کی کتاب کے دیباچہ میں مرقوم ہیں، معلوم ہوسکتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب کا نام کفایہ مجاہدہ رکھا اور دیباچہ کو ہمایوں حضرت کے القاب سے مزین کیا۔ جو سکندر ثانی ہے اور واضح احساس جہانبانی ہے اور حامی ہے قوانین ملک وملت کا اور مٹانے والا ہے قواعد ظلم وبدعت کا۔ **السلطان الاعظم الاعدل الاکرام، افتخار سلاطین العرب والعجم، المبعوث فی عالم**

الملکوت، یغوث الامم المویدمن السماء المنصور علی الاعدا، راعی بلاد مشرق والمغرب، والئے ممالک العزل والنصب، ظل اللہ تعالیٰ فی الارض، مالک ازمنہ السبط وقبض، مجاہد سلطنت والدین سلطان زین العابدین۔

پھر لکھا ہے۔ ''اطراف عالم میں اس کی بخشش کا آوازہ اورانصاف کا شہرہ اڑرہا ہے اوراس کی بارگاہ سلطنت پناہ اصحاب علم وفضل اوراہل عقل کی تقویت کے لئے وقف ہے۔ اس لئے ہر ادنیٰ واعلیٰ اور مطیع سرکش کی زبان اس بارگاہ کی دعا کے لئے کھلی ہوئی ہے اور فتح ونصرت کی مدداور بخت ودولت کی ترقی کا فیضان لحظہ بہ لحظہ خدائے پاک کی درگاہ سے اس کو پہنچ رہا ہے''۔

افسوس ہے ایسے نامور طبیب اورایسے جید عالم وشاعر کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ صرف چند شعر۔ وہ بھی بادشاہ ہی کی تعریف میں اوراسی کتاب کفایہ مجاہدہ سے ملے ہیں۔ جوذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

آنکہ از دور فلک اکنوں غرض دوران اوست
آیت اقبال نصرت واکماوشانِ اوست
کشف اسرار قضاموقوف برفرمان اوست
عقل کا فضل ومیرستانِ ابجدخوان اوست
جامِ جم رشتے ز ملکے خاطر رخشان اوست
گوئے دولت دائما اندر خم چوگان اوست

ستارہ جیش بہ ہیبت زحل اسہیل مکاں
شہاب درخ وسہا ناوک وہلال کماں
بزرگ ہمت و قد بلند افسر و تخت
خجستہ رایت ورائے گزندہ نام ونشاں

ترجمہ:

(۱) وہ ایسا بادشاہ ہے کہ دور فلک اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ اقبال اور فتحمندی کے الفاظ اس کی شان کے شایاں ہیں۔ قضا کے بھیدوں کا اظہار اس کے تابع فرمان ہے۔ عقل کل اس کی درسگاہ کا ایک ابجد خوان طفل ہے جمشید کا پیالہ اس کے روشن ضمیر کے عکس کی ایک شعاع ہے۔ دولت کی گیند ہمیشہ اس کی چوگان کے دائرہ کے اندر ہی رہتی ہے۔

(۲) اس کی سپاہ ستاروں کی طرح بے شمار ہے اور اس کی ہیبت وسطوت زحل سے ملتی ہے اور اس کا مقام سہیل ستارہ کی طرح ارفع و اعلےٰ ہے۔ اس کا تیر سہا کی طرح ہے اور اس کی کمان ہلال کی مانند ہے۔ وہ بادشاہ عالی ہمت ہے اور اس کے تاج وتخت کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس کی رائے اور اس کا جھنڈا مبارک ہے۔ اس کا نام برگزیدہ اور ممتاز ہے۔ (ان شعروں میں زحل، سہیل، شہاب، سہا ستاروں کے نام ہیں)۔

حواشی:

۱) ازاثر منظر اکبرآبادی ایڈیٹر رسالہ کنول آگرہ خلف اکبر علامہ سیماب وارثی اکبرآبادی۔

۲) ترجمہ ونوٹ راج ترنگنی سٹین صاحب۔

۳) حیدر شاہ، حسن شاہ، محمد شاہ، فتح شاہ۔

۴) انیر جے پور کا قدیم نام ہے۔

۵) کرناٹ سے مراد کرناٹک ہے۔

۶) ازمکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

۷۔۸) از بیاض خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب نامی سرینگر۔

۹) بہ عہد نورالدین خاں (ولد تبعہ خان الکوزئی ناظمان کشمیر۔ کشمیر میں نہایت عالم گزرے ہیں۔

۱۰) قلمی (غیر مطبوعہ) صفحہ ۳۲ مملوک پرتاپ پبلک لائبیری سرینگر کشمیر۔

۱۱) از بیاض محی الدین کاشمیری نوشتہ ۱۲۲۴ھ قلمی مملوکہ پیر شمس الدین حیرت پاندانی سرینگر۔

اٹھائیسواں باب

عہد بڈشاہی کے علماء ومشائخ

عہد بڈشاہی میں علماؤ مشائخ کی کثرت

یہ صحیح ہے کہ بڈشاہ نے ترویج اسلام وتائید سنت نبویؐ کے لئے وہ لائحہ عمل اختیار نہیں کیا جو اس کے پیشرو کے مدنظر رہا۔ اور بعض مورخین نے دبے الفاظ میں اس کی شکایت بھی کی ہے۔ جیسا کہ صاحب تاریخ حسن (غیر مطبوعہ۔ صفحہ ۵۰) پر لکھتے ہیں۔ ''درترویج اسلام وسنت نبوی علیہ الصلوۃ والسلام بہ مرتبہ پدرتوفیق نیافت''۔ لیکن باوجود۔ ''بہ مرتبہ پدرتوفیق نہ یافت'' کے بڈشاہ کے عہد میں کشمیر شریعت اسلامیہ کی پابندی کے لئے خاص طور پر مشہور رہا ہے۔ علماء مشائخ اور فضلاء وفصحا کی اس کے عہد میں وہ قدر دانی ہوئی ہے کہ اس نے کشمیر کو علمستان اور اسلامستان بنا رکھا تھا۔ جس قدر علماء ومشائخ کے نام اس عہد کی تاریخوں میں نظر آتے ہیں۔ اس سے قبل اور اس کے بعد کسی بادشاہ کشمیر کے عہد میں دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ کئی ایسے علماء بھی ہوں گے۔ جن کا نام بھی تاریخوں میں نہ آسکا ہوگا۔

نہ دانم زآغاز انجام شاں   مرا بر زباں بس بود نام شاں

بڈشاہی عہد کے تمام علماء ومشائخ کے حالات کے لئے ایک علیٰحدہ دفتر کی ضرورت ہے۔اس لئے چندنام یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) ملا باقر رومی (۲) سید برخوردار (۳) ملا احمد رومی (۴) سید محمد شیبانی (۵) سید محمد رشید (۶) سید محمد لورستانی (ایران) (۷) حافظ فتح اللہ خوشخواں (۸) مولا احمد مروی (ایرانی) (۹) مولانا نورالدین (۱۰) سید حسن رومی (۱۱) شیخ سلطان کبروی پکھلی (۱۲) شیخ شمس الدین زینہ پوری (۱۳) حضرت سید حبیب کاسانی (۱۴) سید ہلال (۱۵) میر سید حبیب اللہ (سرخابی) (۱۶) سید شہاب الدین (۱۷) سید حضوراللہ (۱۸) حضرت بابا بام الدین (۱۹) بابا نصرالدین (۲۰) بابا لطیف الدین (۲۱) بابا قیام الدین (۲۲) سید حسن وزد (۱۳) شیخ الاسلام مولانا کبیر (۲۴) ملا جمال الدین (۲۵) حافظ بغدادی (۲۶) علامہ سید شمس الدین اندرابی (۲۷) سید حسن قمی رضوی (۲۸) باباحاجی ادہم (۲۹) سید محمد مدنی (۳۰) سید محمد عالی مدنی (۳۱) میر سید حسن منطقی (۳۲) میر سید حسین منطقی (۳۳) سید جان بازولی (۳۴) بابازین الدین (۳۵) بابا عثمان گنائی (۳۶) شیخ بہاؤالدین گنج بخش (۳۷) شیخ نورالدین ولی رشی (۳۸) میر سید امین اویسی (۳۹) قاضی میر علی بخاری (۴۰) ملا پارسا (۴۱) میر سید محمد منطقی (۴۲) حضرت سید حاجی مراد (۴۳) سید بدرالدین (۴۴) سید جعفر (۴۵) باباپم رشی (۴۶) بابا شمس الدین رومی (۴۷) شیخ پرباز (۴۸) باباحیدر بٹ (۴۹) باباشکرالدین (۵۰) ریگی ریشی (۵۱) بابالولی حاجی (۵۲) شیخ لالی (۵۳) لچھم ریشی (۵۴) باباحنیف الدین (۵۵) حضرت شیخ اسماعیل۔علیہ الرحمۃ اللہ۔

یہ سب بزرگ آسمان تصوف وعلم کے درخشندہ ستارے تھے۔ان میں سے

کئی ایک کی خدمت میں بادشاہ خود حاضر ہوتا تھا۔ کئی ایسے تھے جن کے لئے بادشاہ نے خانقاہیں اور درسگاہیں تعمیر کرائیں اور وظائف اور جاگیریں تو قریباً سب کے لئے مقرر تھیں۔ یہی وہ عالی پایہ صالحین تھے۔ جن کے وجود مبارک کو بادشاہ ہمیشہ نزول رحمت و برکت کا باعث تصور کرتا رہا۔ یہی وہ صاحبان ولایت تھے

ذات سے جن کی زمیں پر آسمان کو ناز تھا
جن کے سنگ آستاں پر لوگ گھستے تھے جبیں

ان میں چند ایک کے مختصر سے حالات قلمبند کئے جاتے ہیں۔ جو بڈشاہ کی اس عقیدت وارادت پر بھی بالوضاحت روشنی ڈالتے ہیں۔ جو اس کو اس متبرک گروہ کے ساتھ تھی۔

شیخ الاسلام مولانا کبیر

کشمیری الاصل تھے۔ عنفوان جوانی ہی میں کہ سلطان سکندر کا زمانہ تھا۔ ہرات چلے گئے۔ فقہ وحدیث وتفسیر کے حصول میں وہ سعی کی کہ ان کا نام شہرت وعزت کے پر لگا کر اڑتا تھا اور تمام عالم اسلام سے ان کو روشناس کراتا تھا۔

بڈشاہ جب بادشاہ ہوئے تو بڑی منتوں اور آرزؤں سے ان کو بلوایا۔ محلّہ نوشہرہ میں شاہی محلات کے قریب ان کو جگہ دی۔ منصب شیخ الاسلام کہ اس سے پہلے اس ملک میں اس عہدہ کا دستور ورواج نہ تھا، عطا کیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد ان کی مزید بستگی ودلدہی کے لئے اعلےٰ پیمانے پر ایک بادشاہی مدرسہ راجدھانی میں قائم کیا۔ جس کا افسر اعلےٰ مولانا کبیر ہی کو مقرر کیا۔

مولانا کا مقبرہ محلّہ نوشہرہ ہی میں ہے۔ جس طرح اور طلباء و شائقین علوم کے لئے وظائف مقرر ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ان کے مدرسہ کے طلباء کے لئے بھی وظائف کی خاطر چند مواضعات وقف کر دیئے۔ صاحب تواریخ واقعات کشمیر لکھتے ہیں۔ "وتعین مواضع برائے وظائف طالبعالماں نمودہ"۔

قاضی القضاۃ ملا جمال الدین

تمام مورخوں نے لکھا ہے، ان کا وطن ہندوستان تھا۔ جب کشمیر آئے تو خانقاہ امیریہ (شاہ ہمدان) میں رہائش اختیار کی۔ درود وظائف کے بڑے پابند اور بڑے عالم و فاضل اور جید اہل قلم تھے۔ مگر عوام سے ہمیشہ اپنے علم کو پوشیدہ رکھا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے کسب حلال کے لئے عرائض نویسی کا کام شروع کیا۔ آپ اہل مقدمات کی طرف سے بادشاہ کے دربار میں عرضیاں لکھتے تھے اور جو لوگ کسی حاکم کے خلاف کوئی شکایات کرتے تو اس کے تدارک یا اس کی اصلاح کے لئے بھی آپ اہل شکایات کو عرضیاں لکھ کے دیا کرتے۔ بادشاہ ان عرضداشتوں کے مضامین پڑھ کر بڑا متاثر ہوتا اور عرائض نویس کے تجر علمی کا قائل ہو جاتا۔

بادشاہ نے کئی دفعہ چاہا کہ عرائض نویس کو اپنے دربار میں بلائے اور اس کے کمال فصاحت سے اور بھی زیادہ بہرہ اندوز ہو۔ لیکن کوئی نہ کوئی امر مانع ہوتا رہا۔ آخر جب آپ نے ایک منظوم درخواست بادشاہ کی خدمت میں بھجوائی جس میں سلطان سکندر کی وفات پر بھی اشک بہائے گئے تھے اور جس کا ایک شعر یہ ہے۔

شہ کہ بُود مرادش بجائے مسکیناں

بجان و دل طلبد دعائے مسکیناں

تو بادشاہ کو زیادہ انتظار کی تاب نہ رہی۔ اپنا ایک درباری آپ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ جب آپ بادشاہ کے حضور میں گئے تو وہ قدردانی و مردم شناسی کا پتلا ایک گوشہ نشین درویش کے ساتھ جو ایک خانقاہ میں تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ادب واحترام کے ساتھ پیش آیا۔ اٹھ کر تعظیم (۱) کی اور اپنے پہلو میں بٹھایا (۲)۔ آپ نے بادشاہ کی خدمت ایک تصنیف ہدیۃً پیش کی۔ بادشاہ اس کے مطالعہ سے بے حد مسرور ہوا اور آپ کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو مسحور کر لیا۔

عرائض نویسی میں جو دلائل و براہین آپ لکھا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کو نہایت پسند کرتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ اگر ایسا شخص جو انشاء پردازی کے ساتھ دماغ بھی مقنن رکھتا ہے۔ میرے قلمرو کی عدالت اعلیٰ کا جج ہو جائے تو انصاف اس سے بڑا نیک نام ہو سکتا ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے عہدہ قاضی القضاۃ ان کے سپرد کیا۔ جو اس زمانہ کی چیف ججی کے برابر ہے۔ قاضی جمال علوم دنیویہ و دینیہ سے آراستہ تھے اور احکام کے فیصلے بلا کسی لحاظ و مروت کے بلا ورعایت دیانت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کے فیصلوں سے خوش ہو کر ہمیشہ ان پر نوازشوں اور شاہی عنایتوں کا اظہار کرتا تھا۔

قاضی میر علی بخاری

صاحب گلزار خلیل (۳) لکھتے ہیں۔ ''چوں ۸۰۲ھ رسید شاہی خاں المعروف بہ سلطان زین العابدین ابن سلطان سکندر بُت شکن بہ رفاقت صاحب قرآن امیر تیمور گورگاں بہ سمرقند رسید بہ تقریبے باقاضی میر بخاری آشنا شدہ چوں

خدمت میر در ہمہ علوم وفنون نادرہ روزگار وعجوبہ امصار بود۔ بادشاہزادہ آں قدر صحبتش برآرآمد کہ بے یکدیگر ساعتے صبر نمے تواں نشتند''۔ پھر لکھا ہے کہ جب تیمور کا انتقال ہوگیا تو شہزادہ کی تحریک سے قاضی معہ اہل وعیال ان کے ہمراہ کشمیر چلا آیا۔ سلطان نے محلّہ گوجوارہ میں ان کو ایک عالیشان مکان رہنے کو دیا اور ان کو منصب اور جاگیر سے سرفراز فرمایا۔

زین العابدین کے سمرقند جانے کی تصدیق جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے نہ اس کے کسی ہمعصر مورخ نے اور نہ طبقات اکبری کے مصنف اور نہ تیمور نے اور نہ صاحب ظفرنامہ تیموری نے کی ہے۔ اس لئے شاہی خاں اور قاضی میر علی بخاری کی ملاقات سمرقند کا ذکر صرف تاریخ خواجہ اعظمی کی بنیاد پر ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ قاضی میر علی بخاری بڈشاہ کے عہد میں سرفراز تھے اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں ممتاز اور بحث ومناظرہ میں سرافراز تھے۔ اور علوم تصوف وتوحید میں بہرہ وافی رکھتے تھے۔ بادشاہ نے منصب وجاگیر کے علاوہ فضائل وکمالات دیکھ کر ان کو کشمیر کا قاضی القضاۃ نامزد کیا۔

قاضی میر علی بخاری ارغوں خاں کی نسل سے تھے۔ جو چنگیز کی پانچویں اور ہلاکو کی تیسری پشت میں تھا۔ ارغون کو شاہ خوارزم (سلطان محمود غازون) نے پہلے مسلمان کیا اور پھر اپنی لڑکی قتلق نگار خانم کے ساتھ اس کا عقد کر دیا۔ ارغون کی تیسری پشت میں حسین آقا اپنے بھائیوں کے ساتھ موروثی ملک حاصل کرنے کے لئے لڑائی میں قتل ہوگیا۔ اس وقت اس کا بیٹا علی شاہ صرف دو سال کا تھا۔ اس کی ماں دشمنوں کے خوف سے اس کو جگہ جگہ لئے پھری۔ آخر اس کو ایک مدرسہ میں دینی ودنیوی وتربیت

کے لئے داخل کردیا کہ نہ کسی کو اس کے شہزادہ ہونے کا شبہ ہوگا اور نہ اس کی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

علی شاہ نے علم وادب اور تزکیہ قلب میں اپنے مرشد حضرت شیخ علی مزوقانی کے فیض صحبت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو وہ بخارا چلے آئے۔ یہاں قاضی میر محمد خلف صدر جہاں نے ان کے علم سے آگاہ ہوکر ان کو اپنا داماد بنالیا۔ علی شاہ کا ایک ہی فرزند تھا محمود نام۔ اس نے اپنے نانا سے جو اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ تحصیل علم کی برکت حاصل کی اور اس کی وفات کے بعد وہی قاضی میر محمود کے نام سے اس کا جانشین ہوا۔ میر محمود کا شغل ساری عمر تدریس وفتویٰ ہی رہا۔ اس کے دو فرزند تھے۔ قاضی میر علی بخاری اور دوسرے میر حیدر۔ یہ سنہ ۸۰۲ھ کا زمانہ تھا۔

قاضی میر علی بخاری جن کے آباؤ اجداد مغل شاہزادے اور مغل بادشاہ تھے۔ اب کشمیر میں بادشاہ کی عنایت سے محکمہ قضا کے حاکم اعلےٰ تھے۔ علم وفضل کے علاوہ طبع موزون رکھتے تھے۔ چنانچہ ذکر ہے کہ ایک دفعہ مولانا اسمٰعیل ماژندرانی نے تحریصاً ایک شعر آپ کے لئے لکھا ۔

تبردار فکرم بہ بیں چوں تبرزد
کہ باغ بخاری بہ خارے نیرزد

قاضی میر علی نے اس کے جواب میں حسب ذیل شعر لکھا ۔

تہمتین چوگرز گراں رائیگرد
دل دیود ماژندانی بہ لرزو

صاحب گلزار خلیل لکھتے ہیں۔ "بعد وفات در محلّہ گوجوارہ درمقبرہ سنگین

ومکلّف کہ پرائے ہمیں کار احداث یافتہ بود۔ مدفون شد ہنوز آں۔ مقبرہ باقی ست''۔

ان کے دو فرزند تھے۔ میر سکندر و میر محمد یونس۔ ان میں میر سکندر کی اولاد سے قاضی میر ابراہیم مرزا حیدر کاشغری اور سلطان نازک شاہ کے عہد میں خدمت قضاء پر مامور تھے۔ انہی کے فتوے سے میر شمس عراقی کا فرزند میر دانیال قتل کیا گیا تھا۔ انہی میر اابراہیم سے مغلوں کی شاخ بچھ نکلی۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے منہ سے رطوبت و بلغم کثرت سے خارج ہوا کرتی تھی اور آب دہن کی روک تھام اور اصلاح ذائقہ کے لئے اور بیخ بچ (ایک قسم کی گھاس) کو اکثر منہ میں رکھا کرتے تھے۔ اس سے ان کا نام میر ابراہیم بچ مشہور ہو گیا۔

قاضی موسےٰ شہید اور عالمگیری عہد کے نواب ابوالبرکات خاں، نواب بلند خاں، حافظہ مریم بیگم استاد زیب النسا بیگم، نواب مشرف خاں، نواب میر عنایت اللہ خاں اور شاہجہانی عہد کے محمد مراد زریں رقم اور محمد محسن شیریں رقم سب قاضی میر علی بخاری کی ذریات سے تھے۔ کشمیر اور بیرون کشمیر کے کشمیری مسلمانوں کی قوم میر قاضی میر علی بخاری کو اپنا جدّ اعلےٰ تصور کرتی ہے۔

ملا پارسا

بڈشاہ کے زمانے میں بخارا سے آئے۔ بادشاہ ان کا حد سے زیادہ احترام کرتا تھا۔ مدرسہ سلطانیہ واقعہ نوشہرہ میں ان کو مدرس مقرر فرمایا۔ اپنے مدرسہ کے متصل ہی ایک مسجد بھی تعمیر کی۔ جو اب تک مسجد پارسا کے نام سے موجود ہے۔ بادشاہ نے آپ کو جاگیر بھی عطا کر رکھی تھی۔ مدفن محلّہ نوشہرہ میں ہے۔

حافظ بغدادی

اصل وطن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بغداد تھا۔ سلطان کی شہرت سنکر ترک وطن کیا اور ہزار ہا کوس کا فاصلہ طے کر کے کشمیر میں پہنچے۔ بادشاہ نے جو نہایت جوہر شناس اور مسافر نواز تھا۔ مصاحبوں میں داخل کر کے اس کی قدر افزائی فرمائی۔ حافظ بغدادی سے بہت سے لوگوں کو علم و عمل کا فیض حاصل ہوا۔ آپ کبھی کبھی جامع مسجد میں وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے عمر عزیز کا بہت سا حصہ سلطان کی مصاحبت و مجالست میں بسر کیا۔ آپ ملا کبیر کے مقبرہ میں مدفون ہیں۔

ملا سید شمس الدین اندرابی

کشمیر میں خاندان سادات اندرابیہ (۴) کا وجود امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے زمانے ہی سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ حضرت امیر کی مراجعت کے بعد سید احمد اندرابی نے جو حضرت امیر کے ہمشیر زادہ بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ اپنے اہل و عیال کے ہمراہ کشمیر ہی میں اقامت اختیار کر لی۔

سلطان سکندر نے محلات شاہی کے قریب آپ کے لئے ایک عالیشان خانقاہ تعمیر کر دی۔ جو اس وقت سرینگر کے محلّہ ملارٹہ (۵) میں خانقاہ اندرابیہ کے نام سے مشہور ہے۔ لنگر کے مصارف کے لئے چند مواضعات جن میں موضع ویڈر، چیرہ ہار اور اچھن وغیرہ بھی شامل تھے، بطور جاگیر عطا کئے۔ ۸۰۴ھ میں آپ نے وفات پائی اور سطان سکندر نے مزار السلاطین کی صف اول میں آپ کو جگہ دی۔

کشمیر کا مشہور مورخ شائقؔ اپنی تاریخ میں آپ کے متعلق لکھتا ہے۔

حسینی نسب سید احمد بنام | کہ بودہ است از اولیائے کرام
زیارانِ میر کبیر است او | بہ زہد وورع بے نظیر است او

سید شمس الدین اندرابی آپ سے تیسری (٦) پشت میں ہیں۔آپ نے اپنے والد ماجد سید ابراہیم اندرابی سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل کر کے فقہ، حدیث اور تفسیر میں امتیازی شہرت حاصل کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بیس سال ہی کی عمر میں علوم ظاہریہ کی تکمیل سے آپ فارغ ہو گئے تھے۔

آپ نے سلسلہ درس وتدریس جاری کر کے اپنی خاندانی روایات کو از سر نو زندہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ تزکیہ نفس کرتے ہوئے مدارج سلوک ومقامات عرفان طے کرتے رہے اور آخر آپ نے اپنے علم وعمل سے ثابت کردیا۔ ع

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

آپ جیسے صاحبان علوم باطنیہ کے لئے ہی موزون ہے۔ یہ فاضل ترین ہستی بڈشاہ کی نگاہوں سے زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رہ سکی۔ چنانچہ اس جوہری نے اس نگینہ کی قدر وقیمت سے آگاہی حاصل کر کے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ بلکہ آپ کی شادی بھی منطقی سیدوں کے خاندان میں ہوئی۔ جن کے ایک لڑکے محمد امین اویسی کو بڈشاہ نے اپنا لے پالک بنا رکھا تھا۔

شاہی خاندان میں منسلک ہونے کی وجہ سے ان کا ظاہری ٹھاٹھ بھی شاہانہ تھا۔ بادشاہ نے بھی اپنے الطاف وکرم کے اظہار سے ہمیشہ اپنی عقیدت کا ثبوت دیا۔ سلطان سکندر کی بنا کردہ خانقاہ کے باوجود اسی خانقاہ کے متصل ایک عالیشان مسجد معہ

حمام ان کے لئے تعمیر کرائی۔ایک پختہ کنواں کھدوادیا۔لنگر کا انتظام بھی کیا۔جس سے آپ کے طالبان علوم ومعارف کو دونوں وقت کھانا ملتا تھا۔

سکندر اور بڈشاہ کی دونوں عمارتیں اب تک موجود ہیں۔پہلی عمارت کو گرمیوں میں اور بڈشاہ کی بنائی ہوئی مسجد کو سردیوں میں نماز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔بڈشاہی عمارت کے اختتام کی تاریخ ''عبادت گاہ نکوکاراں'' کے فقرہ سے نکلتی ہے۔اگر یہ صحیح ہے تو سمجھنا چاہیے کہ بڈشاہ نے یہ مسجد ۸۵۰ھ میں تعمیر کرائی۔

اس قدر سازوسامان کے باوجود سید شمس الدین پرزہدو درویشی کا رنگ غالب رہا۔آخری عمر میں کوہ ماراں (ہری پربت) کے جنوب میں عزلت وتنہائی کے ساتھ عبادت کرنے کے لئے آپ نے ایک عبادت گاہ بنوائی۔یہیں آپ نے ۱۷ رجب ۹۳۲ھ کو انتقال کیا اور یہیں دفن کئے گئے۔(۷)

سید حسین قمی رضوی

آپ بڈشاہ کے عہد میں اپنے وطن قم (ایران) سے تشریف لائے۔بادشاہ کو جو مردم شناسی میں فرد یگانہ ہونے کی حیثیت سے قیافہ دیکھ کر اندرونی کیفیت پرکھ لیتا اور لفافہ دیکھ کر خطوں کا مضمون بھانپ لیتا تھا۔جب آپ کے بے مثال علم وفضل زہدواتقاء، عظمت وفضیلت اور کشف وکرامات کا علم ہوا تو زینہ گیر کی آبادی وبرکت کے لئے باغ زینہ گیر ہی میں سب آپ کی اقامت کا انتظام کیا۔

سید صاحب بھی ایسے ملک (ایران) سے آئے تھے۔جس کو کوہساروں

،مرغزاروں اور چشمہ ساروں کے مناظر نے بہشت ارضی بنا رکھا تھا۔ یہاں آ کے بھی یہی کیفیت دیکھی۔ خصوصاً قرب وُلر کو آپ نے بہت پسند کیا۔ بادشاہ نے بھی آپ کی سیر و تفریح کے لئے چاکواری (ہوس بوٹ) پرندہ اور شکارے بنوا دیئے۔

کشمیر میں سادات تو پہلے سے بھی موجود تھے اور بڈشاہ کے زمانہ میں بھی آئے لیکن کشمیر میں خاندان سادات رضویہ کا سلسلہ آپ ہی سے چلا ہے۔ جو امام علی الرضا کی طرف منسوب ہے۔ جن کا روضہ مشہد مقدس میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

آپ کے فرزند کلاں کا نام حاجی محمد سید ہے۔ جن کا روضہ احمد پور ماگام (بارہ مولا) میں واقعہ ہے۔ جس کے ساتھ ایک مسجد اور ایک امام باڑہ بھی ہے۔ آپ کی اولاد زیادہ تر اسی موضع میں آباد ہے۔ یہ سب لوگ سادات احمد پورہ کہلاتے ہیں۔ علامہ سید حسین قمی کے دوسرے فرزند کا نام آغا سید احمد تھا۔ جن کی اولاد کشمیر کے علاوہ مرشد آباد، عظیم آباد پٹنہ، لاہور اور دیگر مقامات کے علاوہ عراق میں بھی پائی جاتی ہے۔ آپ کے خاندان کے کئی افراد کربلائے معلےٰ میں تحصیل علوم کے لئے گئے ۔جنہوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ان میں آغا سید حسن کاشمیری مجتہد عراق کے نام سے مشہور رہے ہیں۔

غرض بڈشاہ ابھی زندہ ہی تھا کہ سید صاحب ۷ شعبان ۸۷۱ھ کو انتقال فرما گئے اور زینہ گیر ہی میں جہاں آپ کے نام پر موضع سید پورہ آباد ہو گیا تھا۔ آپ دفن کئے گئے۔ آپ کے مزار مبارک کے حالات زینہ گیر کے بیان میں لکھے جا چکے ہیں۔

بڈشاہ اور سید صاحب کے تعلقات کے سلسلہ میں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ بڈشاہ سنی المذہب تھا اور سید صاحب شیعہ تھے۔ لیکن بڈشاہ نے کبھی اس بات کا خیال

نہ کیا کہ میں ایک شیعہ بزرگ کی کیوں عزت افزائی اور ارادت مندی کر رہا ہوں اور سید صاحب نے کبھی اس بات کو وقعت نہ دی کہ وہ شیعہ مذہب کے بزرگ ہو کر ایک سنی بادشاہ کے پاس کیوں پناہ گزیں ہیں۔ اگر ان کے بعد بھی عالمان دین اور حکام دینوی انہی خیالات وجذبات کے مالک ہوتے۔ ان کے دل بھی فرقہ بندیوں کے جھگڑوں اور باہمی تکفیر ونفرت سے ایسے ہی آزاد ہوتے۔ تو نہ کبھی سنی بلخ بدنام ہوتا نہ شیعہ کشمیر مورد طعن سمجھا جاتا۔

بابا حاجی ادہم

سلطان ابراہیم کے خاندان سے منسوب ہونے کی وجہ سے ادہمی کہلاتے تھے۔ جامع علوم ظاہر وباطن تھے۔ ترک وطن کے بعد پہلے حج کیا پھر کشمیر آئے۔ شیخ بہاؤالدین گنج بخش اور شیخ نورالدین ولی کے صحبت داروں میں تھے۔ مقام میرواری میں جس کو شاعرواری بھی کہتے ہیں اور میر اویسی کے باغ کا نام ہے اور فی الحال (جدو وقلعہ اکبری) سے باہر ہے مدفون ہیں۔ میر محمد اویسی کی تعلیم وتربیت بادشاہ نے آپ ہی کے سپرد کر رکھی تھی۔ میر سید حسن منطقی، میر سید محمد اور مولانا حسام الدین غزنوی اور بڑے بڑے صوفیانہ بزرگ اہل اللہ حضرت بابا صاحب کے صحبت یافتہ اور مرید تھے۔

سید محمد اویسی جو بڈشاہ کی بھتیجی بیگم کے لے پالک فرزند تھے۔ آپ سے ظاہری علوم حاصل کرتے رہے ہیں۔ بابا جی ادہم بلخی کا مزار شاعرواری عرف شہید

واری میں ہے۔ سید محمد امین اویسی آپ کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر بھی حاضر ہوتے رہے۔ سید حسین منطقی بھی جو سید حسن منطقی اور سید محمد امین اویسی کے والد تھے ۔حاجی بابا ادہم سے روحانی تعلیمات حاصل کرتے رہے۔ آپ صاحب تصانیف بھی تھے۔ مقالات اولیائے کشمیر (۸) آپ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

سید محمد عالی بلخی

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ بلخ کے بادشاہ (۹) تھے۔ دو سال کی حکومت کے بعد کہ ابھی شباب ہی کا عالم تھا۔ تخت و تاج پر لاتِ مار کر خدا کی یاد اختیار کی۔ اشارہ غیبی سے کشمیر آئے۔ وہ زمانہ سلطان سکندر بُت شکن کا تھا اور شیخ العالم شیخ نورالدین ولی نے مقام روپہ ون سے بابا نصرالدین کو استقبال کے لئے بھیجا۔ سلطان زین العابدین بھی آپ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ پرگنہ ماگام آپ کے اخراجات کے لئے وقف تھا۔

سید محمد مدنی

سید مدین صاحب کے نام سے بھی آپ مشہور ہیں۔ کشمیر کے اکثر تذکروں میں آپ کا حال درج ہے۔ اصل وطن مدینہ تھا۔ وہاں سے مکّہ آئے پھر خراساں اور ترکستان وغیرہ ممالک میں پہنچے۔ امیر تیمور سے ملے۔ حملہ ہند میں اس کے ہمراہ تھے۔ اس نے ان کا علم و فضل، ان کی اصابت رائے اور سیاست دانی دیکھ کر دہلی سے واپسی پر اپنے سفیروں کے ہمراہ انہیں کشمیر

بھیجا۔ چنانچہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری بہ سلسلہ حالات سید محمد مدنی اپنی تاریخ واقعات کشمیر میں لکھتا ہے۔ "بہ اتفاق ایلچی امیر تیمور در عہد سلطان سکندر بہ کشمیر آمدہ"۔ کشمیر کی آب وہوا ایسی پسند آئی کہ واپس جانے کو جی نہ چاہا۔ مگر بہ سلسلہ سفارت واپس جانے کے لئے مجبور تھے۔ چنانچہ بقول خواجہ اعظم "برائے ادائے بعض عہود باز توجہ بہ ولایت ماوراالنہر فرمود"۔ لیکن اہل وعیال کو ہمراہ لے کر بہت جلد واپس آ گئے۔

ابتدا میں محلّہ زینہ واری میں اقامت اختیار کی۔ جب سکندر کو آپ کے تبحر علم اور آپ کی روحانی ترقیوں کا علم ہوا تو خود زیارت کے لئے آیا اور جب تک زندہ رہا آپ کا احترام کرتا رہا۔

جب بڈشاہ نے اپنے دور میں زینہ نگر یعنی نوشہرہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا تو باصرار انہیں نوشہرہ میں لے آیا۔ جہاں ان کے لئے لنگر خانہ، مسجد، خانقاہ اور مدرسہ (۱۰) ہر چیز کا انتظام کر دیا اور ان کے اخراجات کے لئے چند دیہات وقف کر دیئے۔

آپ کے سال وفات میں مورخین کو اختلاف ہے۔ تاہم اس بات پر سب متفق ہیں کہ آپ کی تجہیز و تکفین کے فرائض آپ کی وصیت کے مطابق قطب العالم شیخ بہاوالدین گنج بخش نے ادا کئے۔ اس وقت بڈشاہ زندہ تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ کا یوم وفات ۱۱ رجب سب نے لکھا ہے۔ لیکن سال وفات کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ اسی تاریخ کو آپ کا عرس بھی ہوتا ہے۔ دو سال تک آپ کا مزار مرجع خلائق رہا ہے۔ اب بھی لوگ آتے ہیں۔ لیکن وہ رونق نہیں ہے۔

میر سید حسین منطقی

اصل وطن شہر بیہق ملک خراسان تھا۔ چونکہ علم منطق میں کمال رکھتے تھے۔

اس لئے منطقی کے نام سے مشہور ہیں۔ سید حسین منطقی کے جدامجد سید تاج الدین بیہقی ملک خراسان کے رہنے والے تھے۔ سید حسین منطقی کی اولاد ان کے منطقی ہونے سے منطقی کہلائی۔ دوسری شاخ بیہق کی نسبت سے بیہقی مشہور ہوئی۔ دراصل منطقی اور بیہقی یک جدی ہیں۔

اونتی پورہ اس زمانہ میں بادشاہ کی توجہ سے روز بروز رونق حاصل کر رہا تھا اور بادشاہ نے اپنا باغ بھی وہاں تعمیر کرایا تھا۔ میر سید حسین نے بھی اسی باغ کو اقامت گاہ بنایا۔ آپ کا مزار بھی وانتی پورہ ہی میں ہے۔

آپ کے دو لڑکے تھے۔ ایک کا نام سید حسن منطقی اور دوسرے کا نام سید محمد امین اویسی تھا۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک دن میر سید حسین منطقی سے تبرک مانگا۔ آپ نے دوسرے دن کا وعدہ کیا اور حسب وعدہ جب دوسرے دن کوئی چیز زیر آستین چھپائے ہوئے سلطان کے پاس آئے تو فرمایا تمہارے لئے تبرک لایا ہوں۔ بادشاہ نے ہاتھ بڑھایا تو آپ نے ایک نوزائیدہ بچہ نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا کہ میں تم کو اپنا لخت جگر بطور تبرک بخشا ہوں۔ اس کا نام محمد امین رکھنا۔ بادشاہ اس عجیب تبرک سے خوش بھی ہوا اور حیران بھی لیکن آگے چل کر اس نوزائیدہ بچہ نے پالٹیکس کی بجائے دنیائے تصوف وسلوک میں وہ نام پیدا کیا کہ آپ کے مناقب وفضائل میں کئی کتابیں لکھی گئیں اور آپ کے مزار فائض انوار کے متعلق کہا گیا۔

گلشن نوراست یارب یا ہمہ بیت السرور

یا چو بیت اللہ بہر طائفاں دارالاماں

سید جان باز ولی

خضر راہ اہل نیاز حضرت سید جانباز کا اصل نام محمد وطن اصفہان اور طریقہ رفاعیہ تھا۔ حضرت سید جلال الدین بخاری کے مرید اور علوم ظاہری و باطنی میں صاحب کمال تھے۔ سلطان زین العابدین کے زمانے میں کشمیر آئے۔ پہلے سید رفاعی کے نام سے مشہور رہے۔ پھر ریاضت کاملہ کی وجہ سے سید جانباز مشہور ہوئے۔

بادشاہ کے اصرار سے دارالخلافہ (نوشہرہ) کو اپنا وطن بنایا۔ لیکن جب لوگوں کی کثرت عبادت و ریاضت میں ہارج ہونے لگی تو بادشاہ کو مجبور کر کے اپنی قیام گاہ بدل لی اور بارہ مولا میں آرہے۔

بادشاہ آپ کے ساتھ کشتی میں سوپور تک آیا۔ بلکہ جزیرہ زینہ لنک کی تعمیر کے لئے حضرت سے دعا کرائی۔

آپ کا قیام عین دامن کوہ میں دریا کے کنارے اس جگہ تھا۔ جہاں آج موضع خانپورہ آباد ہے۔ بادشاہ نے حضرت کے خدام اور لنگر کے اخراجات کے لئے تین گاؤں جاگیر میں دیئے اور ایک وسیع چراگاہ ان کے خدام کے گھوڑوں کے لئے عطا فرمائی۔ اسی چراگاہ کے مقام پر آج جانباز پورہ ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔

۲۴ ربیع الاول ۸۴۳ھ کو آپ کا وصال ہو گیا۔ خانپورہ میں آپ کا مزار مبارک مرجع خاص و عام ہے۔

جو جاگیر خاندان شہمیری اور چکوں کی حکومت اور مغلوں کے دور اور افغانوں کے عہد میں عہد میں اس زیارت کے ساتھ وقف تھی۔ سکھوں نے اپنے زمانہ حکومت میں ضبط کر لی۔

بابا زین الدّین

شیخ نورالدین ولی کے نامور خلفاء میں تھے۔ اصل وطن کشتوار تھا اور راجگان کشتوار کی اولاد سے تھے۔ ابھی بچہ ہی تھے کہ دشمنوں نے ان کے باپ کو قتل کر کے یتیم بنا دیا۔ ان کی بیوہ ماں نے ان کو دُرِ یتیم بنا کر رکھا۔ ایک خواب کے مطابق ان کی والدہ ان کو کشمیر لے آئی اور شیخ بابا بام الدین کے پاس جو شیخ نورالدین کے خلیفہ تھے، پہنچی۔ اتنے میں شیخ نورالدین ولی بھی آ گئے۔ ان کی ماں نے کہا۔ بس یہی بزرگ تھے۔ یہی شکل اور یہی صورت تھی۔ جو عالم خواب میں میرے پاس تشریف لائے تھے۔ آ کر ماں بیٹا حضرت شیخ نورالدین ولی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے اور نام آپ کا زین الدین (۱۱) رکھا گیا۔

آپ عیش مقام میں برسوں تک عبادت وزہد میں مصروف رہے اور یہیں آپ کا مزار مبارک بھی بنا۔ لیکن آپ شمالی کشمیر میں بھی مختلف مقامات میں سیر وسیاحت کرتے رہے۔

ایک مرتبہ شیخ بابا زین الدین علاقہ زینہ گیر میں تھے۔ موضع ہردوشیوہ میں ان کا قیام تھا۔ سلطان زین العابدین بھی زینہ گیر کی آبادی اور نہر کی کھدائی اور تیاری کے سلسلہ میں اسی علاقہ میں تھا۔ بادشاہ ایک دن موضع ہردوشیوہ میں ان سے ملنے کو گیا۔ شیخ عبادت (۱۲) میں مصروف تھے۔ بادشاہ کی تعظیم وتکریم جیسی کہ چاہئے نہ کر سکے (۱۳)۔ بادشاہ سجادہ پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ جب حضرت نے کوئی توجہ نہ کی تو ملول خاطر ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔

بادشاہ کے جانے کے بعد جب حضرت بابا صاحب عبادت سے فارغ ہوئے۔ حکم دیا سجادہ آلودہ ہو گیا ہے۔ اس کو دھو ڈالو۔ بادشاہ کو ملاقات اور زیارت سے محروم ہونے کا بہت رنج تھا۔ بعض لوگوں نے نمک مرچ لگا کر سجادہ دھلوانے کا

واقعہ بھی بیان کیا۔ جب یہ سنا کہ میرے بیٹھنے سے وہ جگہ بھی ناپاک سمجھی جانے لگی ہے۔تو اور بھی برافروختہ ہوا۔ حکم دیا کہ اگر میں ایسا ہی ناپاک ہوں۔تو میرے ملک سے کیوں نہیں چلے جاتے۔ بلکہ بعض تذکروں میں تو لکھا ہے کہ ملک سے نکل جانے کا حکم ہی دیدیا۔ باوجود شدت زمستاں کے آپ مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ کوہستان تبت کی طرف چلے گئے۔

چونکہ یہ زمانہ نالہ پوہرو کی کھدائی اور تعمیر کا تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۸۵۹ھ یا اس سے ایک دوسال پہلے کا ہے۔ کیونکہ نہر کی تعمیر کی وجہ سے ان ایام میں بادشاہ اس طرف اکثر آیا کرتا تھا۔

حضرت کے ملک بدر ہونے یا ترک وطن کرنے کے بعد جو واقعہ زین العابدین کو پیش آتا ہے۔اس میں تذکروں کا بہت کچھ اختلاف ہے۔صاحب خوارق السالکین (۱۴) لکھتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد بادشاہ کا بیٹا پاؤں کے درد میں مبتلا ہوگیا۔ جب علاج معالجہ بے سود ثابت ہوا تو بادشاہ کو خود ہی خیال آیا کہ یہ سزا بابا زین الدین کو ملک بدر کرنے کے نتیجہ میں مل رہی ہے۔ ادھر بابا زین الدین بھی تھوڑے عرصہ کے بعد خود بخود ہی مراجعت وطن پر آمادہ ہوگئے۔ بادشاہ نے ان کے آنے کی خبر سُنی تو بیمار بیٹے کو استقبال کے لئے بھیجا۔ جس کو رستہ ہی میں اس شدت درد سے نجات مل گئی۔

صاحب اسرار الابرار لکھتے ہیں۔ بادشاہ اس واقعہ کے بعد خود درد پا میں بیمار ہوگیا۔ جب حکماء واطباء اس کے علاج سے عاجز آگئے تو اہل دربار سے فرمایا۔ میرے درد کا علاج صرف اس درویش کی رضا ہے۔ جس کو زمستان اور برف باراں کے شدید

موسم میں میں نے محض شاہانہ غرور کی وجہ سے جلاوطن کیا ہے۔ جب تک وہ بزرگ واپس تشریف نہ لائیں گے۔ مجھے شفا کی امید نہیں ہے۔ چنانچہ اپنے ایک فرزند اور بقول صاحب فتحیات الکبرویہ (۱۵) (شہزادہ حیدر خاں) کو کوہستان تبت کی طرف بھیجا کہ سمجھا بجھا کر اور عذر معذرت کر کے ان کو ہمراہ لے آئیں۔ چنانچہ شیخ نے شہزادہ کی التجا قبول کی اور کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ بادشاہ باوجود اس درد عظیم کے معہ امراء وزراء استقبال کو نکلا۔ لکھا ہے کہ جوں جوں شیخ نزدیک آتے تھے بادشاہ صحت یاب ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بالکل تندرست ہو گیا۔

عیش مقام میں انتقال فرمایا۔ رحلت کے وقت وصیت کی کہ مجھ پر غسل دیکر کفن پہنا دو اور تابوت رکھ دو اور دیکھو پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ جب تابوت دیکھا گیا تو اندر کچھ بھی نہ تھا۔ آخر تابوت ہی کی جگہ قبر بنائی گئی۔ (۱۶)

فانی زخود و بہ دوست باقی   ایں طرفہ کہ نیستند و ہستند

آپ کے مریدوں اور خلیفوں میں بابا دریا دین، بابا شکر الدین، بابا پم رشی اور بابا حنیف الدین اور چند اور بزرگ بہت مشہور گزرے ہیں۔ بابا شکر الدین کا مزار وُلر کے عین کنارے ایک پہاڑی پر زینہ گیر کے علاقہ میں واقعہ ہے۔ اس مزار سے وُلر اور گردونواح کا دلفریب نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ بابا پم رشی علاقہ لار کے امیر زادے تھے۔ ایک دن شکار کو جا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک چیونٹی منہ میں دانہ لئے جا رہی ہے اور زمستان کے لئے ذخیرہ جمع کر رہی ہے۔ معاً دل میں خیال آیا کہ مور ضعیف کو تو آئندہ کے توشہ کی یہ فکر اور میں صاحب ثروت اور اہل منصب ہو کر توشہ آخرت سے غافل۔ چنانچہ منصب شاہی کے ساتھ ہی دنیا کو بھی ترک کر دیا اور آخر شیخ زین الدین

کی نظر صاحب اثر سے صاحب کمال ہو گئے۔ پرگنہ بانگل میں آپ کا مدفن ہے۔

بابا عثمان گنائی

آپ خاص سرینگر کے رہنے والے تھے۔ اس زمانہ میں جب معمولی سفر دشوار گزار تھے۔ آپ پنجاب و ہند کی سیر کرتے ہوئے حریمین الشریفین تک پہنچے۔

فراز و شیب رہ از رہروان گرم سپرس
کہ پیش مرغ ہوا کوہ و دشت یکسان است،

وہاں خواجہ اسحاق ختلانی (۱۷) سے ملاقات ہوئی اور ان سے ارادت و بیعت کی خواہش کی۔ خواجہ نے فرمایا۔ تمہارے گھر میں گنگا بہہ رہی ہے۔ زیارت حرمین سے فارغ ہو کر سیدھے اپنے وطن جاؤ اور شیخ بہاؤالدین گنج بخش کی خدمت واطاعت سے مقاصد دلی حاصل کرو۔

چنانچہ آپ واپس تشریف لائے اور ان سے فیوضات باطنیہ حاصل کئے۔ حضرت شیخ نورالدین ولیؒ اور حضرت باباحاجی آدم (۱۸) اور دیگر اولیائے کرام کی صحبتوں میں بھی رہے۔

تاریخ اعظمی میں لکھا ہے۔ ''بابا صاحب کمال بود بعد تحصیل علوم بہ ذوق خدا پرستی راہ حرمین گرفت۔ حق تعالیٰ در علم تقویٰ اور ابرکت داد۔ اکثر احفاد و ذریافت ایشاں را کار با فضیلت و علم اُفتاد''۔ بابا رجب گنائی، بابا زینی گنائی، ملا فیروز گنائی، نتو گنائی بڈشاہی، ملا نونی گنائی، بایزید عاصمی وغیرہم جو کشمیر کے نکوکاروں، تقوی

شعاروں اور صاحبان علم وفضل میں درجہ امتیاز رکھتے تھے۔ آپ ہی کے اولاد واحفاد سے تھے۔

صاحب تاریخ اعظمی لکھتے ہیں۔ "گنائی درعرف آنوقت نویسندہ راے گفتند ازمعنی تابہ پتواری ہمیں لقب بود"۔ مصنف تذکرۃ الحفرات اور کشمیر کے دیگر مصنفوں نے بھی اس کی تائید کی ہے اور بابا عثمان گنائی کے متعلق لکھا ہے خوش نویسی وحساب دانی میں دیگر علوم وفنون کے علاوہ شہرہ آفاق اور بخبائے شہر میں ممتاز تھے۔

آپ کی تاریخ ولادت صرف تذکرہ الحفرات میں ۷۷۱ھ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڈشاہ کے اوائل عہد میں پچاس سال سے زیادہ عمر کے تھے۔

کشمیر کے تذکروں میں آپ کی بہت سی کرامتوں کا ذکر ہے۔ صاحب خوراق السالکین نے لکھا ہے کہ بڈشاہ نے بھی آپ سے ملاقات کرکے آپ کے کمالات وکرامات کا اعتراف کیا ہے اور اپنے حق میں مخدوم بابا سے دعائے خیر بھی کرائی ہے۔ صاحب تذکرہ الحفرات نے آپ کی وفات ۸۲۱ھ لکھی ہے۔ مدفن آپ کا مقبرہ سلاطین میں پیش روئے مقبرہ مرزا حیدر کاشغری بیان کیا جاتا ہے۔ عمر آپ کی نوے سال تھی۔

شیخ بہاؤالدین گنج بخش

شاہ اسحاق ختلانی (خلیفہ امیر کبیر علی ثانی) کے تربیت یافتوں اور مریدوں میں تھے۔ ابتداء میں بڑے سیاح تھے۔ چنانچہ شاہ اسحق کے پاس خود ختلان گئے اور ان سے فیوضات حاصل کیے۔ ان کے جذب وسلوک کی حکایات بے شمار ہیں۔

اصل نام بہاؤ الدین ہے۔ گنج بخش ان کا لقب ہے۔ شیخ سلطان کشمیری، سید محمد مدنی اور حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے صحبت یافتوں میں تھے۔ بادشاہ ان کی ایک بشارت کے علمی ظہور کی وجہ سے جس کا ذکر بادشاہ کے بچپن کے بیان میں ہو چکا ہے۔ ان کا بڑا ادب کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کو محلات شاہی میں آنے اور دریا کی سیر کرنے کی دعوت دی گئی۔ آپ نے شکریہ کے ساتھ قبولیت دعوت سے انکار کر دیا۔

ایک دن حضرت شیخ بہاؤ الدین موضع کرشہ بل میں لب دریا ایک درخت کے نیچے سربہ زانو بیٹھے تھے۔ نصف شب کے قریب چوروں کی ایک جماعت شہر سے مال متاع لیکر اس طرف آئی اور چوری کا مال باہم تقسیم کرنے لگی۔ مال تقسیم کرنے کے بعد ان کی نظر اس تاریکی میں آپ پر پڑی۔ ان ظالموں نے اس خوف سے کہ یہ شخص ضرور ہمارا راز فاش کر دے گا۔ آپ کو شہید کر دیا۔

بادشاہ کو اس المناک واقعہ کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا۔ شیخ نے اپنے ہم صحبتوں اور ارادتمندوں کو وصیت کر رکھی تھی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرا جنازہ کندھوں پر لیجانے کی بجائے یہ کام کرو کہ میرے پاؤں میں رسہ باندھ کر کشاں کشاں لئے پھرا اور یہانتک کہ قبرستان میں پہنچا دو۔ لوگ اس وصیت کی تکمیل کے لئے بڑے متردد و مضطر تھے۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا۔ حضرت شیخ کی وصیت ضرور پوری ہونی چاہیئے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک گھوارہ بنایا گیا۔ اس میں آپ کی لاش رکھی گئی۔ گھوارے کے نیچے پہیئے لگائے گئے اور اس کے ساتھ رسہ باندھ کر قبرستان تک پہنچایا گیا۔ بادشاہ حضرت بابا عثمان گنائی اور بہت سے بزرگان شہر اور اعیان مملکت کے ساتھ آپ کے جنازے میں شامل ہوا۔ کوہ ماراں کے دامن میں قلعہ کے باہر

جہاں ایک وسیع قبرستان ہے۔آپ دفن کئے گئے ۔مزار(۱۹) آپ کا اور احاطہ قبرستان بڈشاہ کی بیہقی بیگم نے اپنا زیور فروخت کرکے تعمیر ومرمت کرایا تھا۔

۸۴۹ھ مطابق ۱۴۴۵ء میں آپ نے درجہ شہادت حاصل کیا۔تاریخوں میں لکھا ہے کہ شہادت کے وقت آپ کی عمر بہت بڑی تھی۔

آپ کے مزار مبارک کے دروازے پر ہی شمس چک کی قبر ہے۔جو ۸۹۳ھ میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان حسن شاہ کشمیر کا حاکم اور مدار المہام گزرا ہے۔

شیخ نورالدین ولیؒ

اوائل عمر میں اپنے بھائیوں کے اصرار وجبر سے ان کے ساتھ چوری ورہزنی کیا کرتے تھے اور چونکہ جذبہ الٰہی کے لامتناہی شعلے بطن مادر ہی سے لے کے آئے تھے۔اس لئے ان کے بھائی ہمیشہ ان پر ناراض رہتے تھے۔آخر تیس سال کی عمر میں بھائیوں کا ساتھ بالکل ترک کردیا۔ بلکہ وہ کام بھی جو طبیعت پر گراں گزرتا تھا۔چھوڑ دیا اور ایسی توبہ کی کہ ریاضت وجانبازی کا اور زہد وعبادت میں قدم رکھ کر یادگار متقدمین اور افتخار متاخرین ثابت ہوئے اور جب محبوب ذوالجلال سے لو لگائی تو تعلقات زن وفرزند کو بھی حجاب تصور کرکے قطع کردیا۔

آں کس کہ ترا اشناخت جاں براچہ کند فرزند وعیال وخانماں راچہ کند
دیوانہ کنی وہردو جہانش بخش دیوانہ تو ہردو جہاں راچہ کند

بارہ سال تک آپ پہاڑوں کی غاروں میں صرف کاسنی کے پتے کھاکر

گزارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۲ سال تک کاسنی کو ترک کر کے دودھ کے ایک پیالہ پر گزر کی۔ پھر اسے بھی لذت نفس جان کر ترک کیا اور دو اڑھائی سال تک قدرے آب جو پر گزارہ کیا۔ غرض گوشہ نشینی وتنہائی اختیار کرنے کے بعد بقول صاحب تاریخ اعظمی "بست وشش سال نان وغلہ نخوذ"۔

قوت جبرئیل از مطبخ نہ بود بوداز دیدار خلاق ودود

حضرت میر محمد ہمدانی، میر سید حسن سامانی، شیخ بہاؤالدین گنج بخش، شیخ سلطان پکھلی، بابا حاجی ادہم اور کئی بزرگ آپ کے ہم مرتبہ وہم سال بیان کیے جاتے ہیں۔

آپ کی ولادت قریباً تمام مورخین نے بالاتفاق ۷۵۷ھ بیان کی ہے۔ لیکن تاریخ وفات میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے سال وفات ۸۰۸ھ اور بعض نے ۸۴۲ھ لکھا ہے اور عمر آپ کی ۲۳ یا ۲۴ سال بتائی ہے اور یہ بھی مورخین نے لکھا ہے کہ بڈشاہ کے زمانے میں وہ فوت ہوئے اور بادشاہ آپ کے جنازہ پر گیا۔

صاحب تاریخ اعظمی کے حساب سے ۲۶ سال وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں رہے۔ ۳۰ سال کی عمر میں انہوں نے رہزنی ترک کی۔ چھپن سال تو اسی طرح ہو گئے۔ ادھر ۷۵۷ھ کی پیدائش اور ۸۰۸ھ کی وفات کے مطابق ان کی عمر صرف اکیاون سال ہوتی ہے۔

البتہ اگر ۸۴۲ھ کو سال وفات صحیح تسلیم کیا جائے اور اسی کو صاحب اعظمی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ تو آپ کی عمر ۷۵۷ھ کی پیدائش کے مطابق پچاسی سال ہوتی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ بڈشاہ بھی آپ کے سال وفات میں زندہ وموجود تھا اور اس حساب سے اس کا حضرت کی ذات سے فیوض حاصل کرنا اوران کے جنازہ میں شامل

ہونا قرین قیاس بھی ہے۔ ذیل کے قطعہ تاریخ سے بھی ان کا سال وفات ۸۴۲ھ معلوم ہوتا ہے ؎

زہجرت ہشصد و چہل و دو بودہ — کہ شیخ نوردیں رحلت نمودہ

بڈشاہ سے آپ کا تعارف کس طرح ہو۔ اس کو ہم معارف الحقانی کے طویل مضمون سے مختصر طور پر یہاں درج کرتے ہیں۔ صاحب معارف لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ بادشاہ بیمار ہوگیا۔ جب علاج سے تمام حکماء عاجز آ گئے۔ تو بادشاہ نے نجومیوں کی طرف رخ کیا۔ نجومیوں نے کہا بیماری کی وجہ یہ ہے کہ ملک رانی و عدالت گستری میں کوئی کمی ہوگئی ہے اور حاکموں اور افسروں پر سستی و کاہلی نے عمل دخل کرلیا ہے۔ اور بطور مثال یہ واقعہ بیان کیا کہ گزشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں ایک بڑھیا کا اکلوتا بیٹا سخت بیمار ہوگیا۔ وہ دربار میں آ کر شور و فغاں کرنے لگی۔ بادشاہ نے سبب پوچھا تو کہا میرا بیٹا سخت بیمار ہے اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہی اہلکاروں نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو عدالت وآئین فرمانروائی کے خلاف ہے۔

بادشاہ نے نجومیوں سے کہا۔ تم اپنی کتابوں میں دیکھو کہ پیرزال کا فرزند کیوں بیمار ہوگیا ہے۔ منجموں نے متفق ہوکر کہا کہ ہمارا علم ہم کو یہی کہتا ہے کہ بادشاہ کے ملک میں کسی بے انصافی کا واقعہ ظہور میں آیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ایک قصاب نے اپنا پیشہ ترک کر کے دنیا کمانے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔ لازم یہ ہے کہ قصاب کو غار سے نکال کر شہر میں لایا جائے اور سزا دی جائے تاکہ کوئی اور شخص آرام طلبی اختیار کر کے مکر و فریب سے دنیا کو لوٹنے اور کاروباری دنیا کو ضعف پہنچا کر گوشہ گیری اختیار کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ چنانچہ جب اس کو پکڑ کر لائے اور بزرگی و ریاضت

میں لاف زنی کرنے پر تنبیہہ کر کے اس سے اس کا آبائی کاروبار شروع کرایا گیا تو اس بڑھیا کے بیٹے کو شفا حاصل ہو گئی۔

نجومیوں نے یہ واقعہ بیان کر کے بادشاہ سے کہا۔ اے بادشاہ جم جاہ تیرے عہد میں بھی اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ ایک شخص جس کا کاروبار رہزنی، چوری اور ڈاکہ زنی ہے جنگل میں جا بیٹھا ہے۔ زن و فرزند کو جواب دے چکا ہے اور اپنے آپ کو عابد و زاہد کہتا ہے۔ جب تک اس کو گرفتار کر کے قتل نہ کیا جائیگا۔ بادشاہ کو صحت کلی حاصل نہ ہوگی۔ بادشاہ نے حکم دیا ایسے شخص کو گرفتار کر کے حضور میں پیش کرو۔ بادشاہی آدمی دوڑے دوڑے اس جنگل میں گئے۔ جہاں حضرت شیخ نورالدین کا قیام تھا۔ حضرت ٹہل رہے تھے کہ بادشاہی پیادوں کو مضطرب الحال دیکھ کر پوچھا اے جوانو! یہ شتاب و اضطراب کیوں ہے اور کس کی تلاش میں سرگردانی ہے۔ پیادوں نے کہا۔ ہم شیخ نورالدین کی تلاش کر رہے ہیں۔ اسے بادشاہ کے حضور میں لے جانا ہے۔ شیخ نے کہا جس کی تلاش میں تم نے بیابانوں، ویرانوں اور کوہستانوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ فقیر میں ہی ہوں۔ چلو اسی حال میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔

جب شیخ بادشاہ کے پاس پہنچے تو اس کی بیماری میں افاقہ ہونا شروع ہوا۔ منجموں نے کہا کہ بادشاہ سلامت ہم نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔ یہ دزد و مکار کہ اس کے باپ دادا کا پیشہ ڈاکہ اور رہزنی ہے اب دعویٰ بزرگی کرتا ہے۔ جونہی حاضر دربار ہوا ہے۔ حضور کو بیماری سے نجات مل رہی ہے۔

بڈشاہ تو بڑا زیرک اور مصلحت اندیش بادشاہ تھا۔ اس نے کہا کہ اے نادانوں اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسی بزرگ کے دیدار برکت و فیض

آثار سے میری صحت بحال ہوگئی ہے۔ ایسا بزرگ میرے ملک میں ہو۔ جس کے دیدار ہی سے آثار نحوست وادبار دور ہو جائیں۔ اس سے زیادہ میری کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے۔ یادرکھوایک درویش کی ناراضگی اور پھر بلاوجہ ایک عالم کو درہم برہم کردیتی ہے۔

بادشاہ کے دل میں روز بروز شیخ کی عزت بڑھتی گئی۔ بہت عذرخواہی کی اور کہا میرے لئے بدرگاہِ رب العلاء دعائے نیک فرمایئے۔ حضرت شیخ نے کہا خدا تمہیں عدل وانصاف کی توفیق مزید دے کہ اس ملک کے ساتھ ملک آخرت بھی کہ باقی وپاپندہ ہے۔ تمہارے قبضہ میں ہو۔

۸۴۲ھ میں کہ بڈشاہ کی حکومت کا اٹھارہواں سال تھا۔ پچاسی سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ نماز جنازہ اور تجہیز وتکفین میں تمام علماء وصلحا اور بزرگان دین جمع ہوئے۔ بادشاہ خود فیل وحشم کے ساتھ چرار شریف پہنچا اور کہنے لگا۔ جسد مبارک شہر میں لے چلو۔ وہیں حضرت کا مرقد ومقبرہ بنایا جائیگا۔ شہر میں لوگوں کی آمدورفت زیادہ ہے۔ زیارت سے منور ومسرور ہوا کریں گے۔

اس موقعہ پر گردونواح کے قریباً دس ہزار آدمی جمع تھے۔ ان کا منشاء یہ تھا کہ مقبرہ خام پور میں ہو جو سر راہ ہے۔ حضرت کے جو درویش تھے۔ ان کی خواہش یہ بھی کہ اسی جنگل خارزار میں جہاں آپ نے اپنی عمر بسر کردی ہے روضہ مبارک بنایا جائے۔

حضرت بابا نصرالدین جو شیخ کے خلفائے اعظم میں سے تھے اور بادشاہ بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس اجتماع وکثرت اور بحث ومباحثہ سے بہت متردد تھے۔ آخر آپ کے فیصلہ کے مطابق مقبرہ چرار ہی میں بنایا جانا قرار پایا اور بادشاہ نے اس

فیصلہ کو قبول کرلیا۔

بادشاہ ابھی چرارشریف ہی میں تھا کہ اس کے حکم سے گل کار اور کارکن بلائے گئے اور روضہ کی تعمیر شروع ہوگئی۔ چنانچہ روضہ مبارک سب سے پہلے بڈشاہ نے تعمیر کرایا۔ انقلاب زمانہ کی وجہ سے بعد میں اس میں ترمیم وتعمیر بھی ہوتی رہی ہے۔

میر سید محمد امین اویسی

یہی وہ نورائیدہ بچہ ہے۔ جس کو اس کے باپ میر سید حسین منطقی نے بڈشاہ کو بطور تبرک عطا کیا تھا اور کہا تھا نام اس کا محمد امین (۲۰) رکھنا۔ اسی خاندان (بیہق) سے چونکہ بادشاہ کی ایک بیگم بھی تھی۔ جو اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ غمگین وملول رہتی تھی۔ بادشاہ نے وہ نوزائیدہ بچہ بیہقی بیگم کے سپرد کردیا۔ بادشاہ نے محمد امین کی ظاہری وباطنی تعلیم کا پورا پورا انتظام کیا۔ خواجہ ہلال اشم والے ان کے پیر طریقت تھے اور بابا حاجی ادہم کے سپرد ان کی ظاہری تعلیم ہوئی۔ چنانچہ تعلیم قرآن اور علوم دینیہ یعنی فقہ وحدیث وتفسیر اور معقول ومنقول آپ نے سب انہی سے حاصل کئے۔

بادشاہ اس کو اپنے بچوں کی طرح رکھتا تھا۔ ایک تو اس کی پیشانی سے ستارہ بلندی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ دوسرے وہ ایک بزرگ صاحب علم وفضل سید کا عطیہ متبرک تھا۔ اس لئے سفر وحضر میں اس کو ساتھ رکھتا اور کہتا ۔ع

سفر برائے تو جوئم وطن برائے تو خواہم (۲۱)

اویسی اس لئے مشہور تھے کہ حضرت اویس قرنی سے نسبت رکھتے تھے۔ بلکہ اپنا تخلص بھی اویس رکھ لیا تھا اور اپنے نام کی بجائے میر اویسی کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔

جب سن تمیز کو پہنچے تو بادشاہ نے آپ کی فراست وکیاست دیکھ کر بعض امور مملکت آپ کے سپرد کرنا چاہیے۔ ماں نے بھی بہت کچھ کہا سنا۔ حشمت وشوکت بادشاہی کی ترغیب دلائی اور بڑی بڑی امیدوں کا اظہار کیا۔ مگر جس کے سر میں قضائے عالم معنوی کی ہوا سے سیر کرنے کا سودا ہو وہ لذت مال وجاہ صوری سے ذائقہ حلاوت کی کیا تمنا رکھتا ہے۔ غرض آپ نے نہ بادشاہ کا مشورہ قبول کیا نہ بیگم کی بات پر کان دھرے بلکہ مندرجہ ذیل شعر

زماسوائے تو آنا نکہ فارغ البال اند

بہ عالمے نہ فروشند ذوق تنہائی

کے علاوہ ایک طویل ترجیع بند میں دنیا سے کنارہ کشی کا اظہار کر دیا۔ بادشاہ اور بیگم کو محمد امین کی ذات سے ملکی خدمات وفلاح کی بڑی بڑی تمنائیں تھیں۔ اس صوفیانہ طرز عمل اور اس کے اشعار کے مطالعہ سے سب خاک میں مل گئیں۔ لیکن باوجود ان باتوں کے بادشاہ کو آپ سے کمال محبت تھی۔ سال میں دو تین مرتبہ ان سے ضرور ملتے۔ کبھی کبھی میر اویسی خود بھی بادشاہ کے پاس چلے آیا کرتے تھے۔

زینہ لنک کے جشن شاہی کے واقعہ کے بعد جس میں میر اویسی ناراض ہو کر چلے آئے تھے اور جس کا ذکر زینہ لنک کی تعمیر کے دوران میں ہو چکا ہے۔ اپنے محلات رینچن شاہ میں جس کا نام محلّہ ملیچھمر (۲۲) بھی ہے رہنا اختیار کیا۔ کبھی کبھی موضع اشم میں بھی کئی کئی دن رہا کرتے تھے۔ جہاں آپ کے شیخ طریقت سید بلال کا قیام تھا۔ بادشاہ نے اشم میں بھی میر اویسی کے لئے کئی عمارات تیار کروا دیں۔

میر اویسی بادشاہ کے گھر میں تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے باوجود نہایت

درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔لطیف طبع تھے اور حسن ظاہری کے ساتھ حسن خلق بھی بے مثال تھا۔باوجود غلبہ حال وکمال اور علوم وافضال انکساری وہ نیاز مندی پر فخر تھا فرماتے ہیں ؎

گناہِ ماز عدم گر نیامدے بہ وجود
وجود عفو تو در عالم عدم نے بود

لیکن باوجود اس درویشی کے مکان پر دربان رہتا تھا۔ جب میر اویسی حالت خاص میں ہوتے تھے۔تو دربان اعلان کر دیتا تھا کہ میر با خداست۔ چنانچہ کوئی شخص ان کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔ جب وہ اعلان کرتا تھا کہ میر با خدا و خود است یعنی آپ مشاہدہ وحدت کثرت میں کرتے ہیں۔تو لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ہوتی تھی۔

جب حسن شاہ بادشاہ ہوا تو سادات بیہقی کے ایک سید حسین نام کو کہ سید میرک میر بھی ان کو کہتے تھے۔وزارت کا مرتبہ ملا۔امرائے ملک نے ایک غیر ملکی کی اطاعت سے انحراف کیا۔ چنانچہ ایک شورش عظیم برپا ہوئی۔سید میر اویسی بھی ہر چند بادشاہ کے گھر کے تربیت یافتہ تھے۔لیکن ان کے والدین بھی چونکہ سید تھے۔اس لئے مخالفوں نے ان پر بھی اہل فتنہ وفساد کو مشورے دینے کا الزام لگایا۔حالانکہ ان باتوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اس زمانہ میں سید میر اویسی سادات کی ایک جماعت کے ساتھ محلّہ نوشہرہ میں رہتے تھے۔اشرار کی جماعت رات کے وقت آپ کے حجرہ میں گھس آئی اور اپنی طرف سے ان کو شہید کر کے چلی گئی (۲۳) لیکن ان میں ابھی جان باقی تھی۔آپ نے اسی حال میں ایک شعر اور دو حسب ذیل رباعیاں کہیں ؎

منہم آں رند جہاں گرد مسیحا نفسے ‎ ‎ کہ من ایں ہر دو جہاں را نہ شمارم بہ خسے
اگر از عشق توام سر برود کر بزدو ‎ ‎ ہرگز ایں سرِ نہان تو نگویم بہ کسے
من فارغم ز مصلحت اہل روزگار ‎ ‎ مے واں یقین کہ کشتن من بود بیگناہ
اکنوں بیاؤ شعر بخواں برمزار من ‎ ‎ تاروئے ظالمان ستمگر شود تباہ

صورت قبرم زبعد مرگ ویراں خوشتر است
نامرادے ہمچومن باخاک یکساں خوشتر است

تاریخ وفات شہید کشمیر ۸۸۹ھ شہید شرع ۸۸۹ھ اور شہید عرش ۸۸۹ھ ہے۔ خوراق السالکین میں حسب ذیل شعر بھی درج ہے

رفت از زجہان فانی بیرون چوں میر ویسی
گفتند سال وصلش مخدوم واصلیں بود

مخدوم العرفا شیخ حمزہ کاشمیری اپنے ابتدائی زمانہ سلوک میں مدت تک اس آہستانہ پر حاضر ہوتے رہے ہیں۔ محلہ ریٹنجن شاہ میں جس کو اب بلبل لنگر کہتے ہیں اور جو عالی کدل میں واقع ہے۔ آپ کا مزار زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ بادشاہ کی زندگی میں جب آپ شہر میں ہوتے تھے تو یہیں آپ کا قیام ہوتا تھا۔ بادشاہ نے آپ کے لئے رباط بھی تیار کرادی تھی اور بادشاہ اور بیگم لیس رباط میں آکر آپ سے ملاقات کرتے تھے۔ آپ کا مزار آپ کی وصیت کے مطابق اسی رباط میں تعمیر ہوا۔ آپ کے مزار پر آپ کے آخری اشعار جو وصال کے وقت آپ نے فرمائے تھے۔ ابھی تک موجود ہیں۔

بابا رجب الدین

حضرت بابا بام الدین کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وطن کشمیر سے باہر تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دو بھائی بھی فخر الدین و شکر الدین نام آئے تھے۔ پرگنہ مارتنڈ کے کوہ ناگہ نارن کے دامن میں قیام فرمایا۔ کلام اللہ کی کتابت کر کے اپنی روزی پیدا کرتے تھے۔ ان کے مریدوں میں شیخ نوروز ریشی اور شیخ ہردے ریشی بہت بڑے مشہور تھے۔

شیخ پرباز

سلطان المجاہدین شیخ نورالدین ولی کے ارادت مندوں میں تھے۔ بارہ برس کی عمر تھی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پیرومرشد کے حکم سے چوتربال میں اقامت اختیار کی۔ مرشد کے حکم سے ان کے دوسرے پیر بھائی شیخ عبداللطیف اور شیخ شریف بھی وہیں قیام پذیر تھے۔ عموماً یہ تینوں بزرگ جنگل کا اُپل ساگ کھایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ سخت اور خشک سا اوپل ساگ لائے جس کا پکنا اور گلنا بہت مشکل تھا۔ شیخ عبداللطیف نے کہا آج کیا لے آئے؟ شیخ پرباز نے کہا سبز ساگ کو تسبیح (خدا کی عبادت) پڑھتے سُنا۔ اس لئے اکھاڑنے کی جرات نہ ہوئی ۔

ہر گیاہے کہ از زمیں روئید　　　وحدہ لاشریک لہ گوید

اگر میں اس کو اکھاڑتا تو اس سے خون جاری ہو جاتا۔ چنانچہ شیخ عبداللطیف و شریف نے بھی اس کے بعد سبز ساگ کھانا چھوڑ دیا۔

حافظ فتح اللہ خوش خواں وحضرت شیخ اسماعیل

حافظ فتح اللہ شیخ احمد خوش خواں کے فرزند تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں صاحب کمال تھے۔ اپنے زمانہ کے صاحب جمال وجلال تھے۔ ان کے فرزند شیخ اسماعیل بھی اپنے باپ اور دادا کی طرح عالم علوم ربانی تھے۔ شیخ اسماعیل بڈشاہ کے اواخر عہد میں موجود تھے۔ اپنے وقت کے شیخ الاسلام تھے۔ ان کی اقامت دوجگہ تھی۔ ایک ہری پربت کے دامن میں۔ دوسری جامع مسجد کے متصل۔ جہاں ان کے آباء اجداد کے مزار تھے۔ دونوں مقامات پر جوصوفی نے چارسو بتائی ہے۔ ان کے مدرسہ (خانقاہ) میں بعض طالبان علوم ماورالنہراور ہرات تک سے آتے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹا ایسے خوش الحان تھے کہ لوگ جب ان سے قرآن شریف اور مثنوی مولانا روم کا بیان سنتے تھے تو وجد میں آجاتے تھے۔

ان کی وصیت تھی کہ میری وفات کے بعد میرا کتب خانہ اور لنگر وقف عام رہے۔ خواجہ محمد اعظم تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ۱۰۹۰ھ تک ان کی خانقاہ موجود تھی۔ آتشزدگی نے اس کو مٹادیا۔ وہ لکھتے ہیں اکثر اہل دل اورصوفی منش بزرگ ان کے مزار پرآکر گوشہ نشینی کیا کرتے تھے۔

حضرت سید ہلال

بڈشاہ کے لے پالک فرزند سید محمد امین اویسی کے علوم ظاہری وتعلیم قرآن کے استاد تو حضرت بابا حاجی ادہم تھے۔ لیکن پیر صحبت اور استاد علوم باطنی حضرت

سید ہلال تھے۔ چونکہ سید ہلال بالعموم موضع اشم میں رہتے تھے اور ان سے فیوض وبرکات حاصل کرنے کے لئے سید امین اویسی منطقی بیہقی المعروف بابا میر اویسی کو بھی عموماً وہیں رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے ان کی خاطر اشم میں کئی حجرے، مسجد، لنگر خانے اور مکان رہائشی تعمیر کرادیئے تھے۔

سید ہلال سید محمد ہمدانی خلف امیر کبیر سید علی ہمدانی کے تربیت یافتہ تھے۔ صاحب تاریخ خواجہ اعظمی ان کے مقبرہ کی برکات کے عینی مشاہدات لکھتے ہیں۔ آپ کا مزار بھی موضع اشم ہی میں زیارت گاہ خلائق ہے۔

سید بدالدین زینہ کدلی وسید نورالدین زینہ کدلی

سید بدرالدین کشمیر کے سادات قدیم میں ایک ممتاز ہستی تھے۔ محلّہ زینہ کدل میں مدفون ہیں۔ خواجہ محمد اعظم اپنی تاریخ (۱۱۴۸ھ) میں لکھتے ہیں۔ ان کا مقبرہ میرے اوائل عمر میں موجود تھا۔ بعدازاں حوادث زمانہ کی نذر ہو گیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد بعض اصحاب کی کوشش سے پھر اس کا وجود ظاہر ہو گیا۔ سید نورالدین زینہ کدلی ان کے برادرزادہ تھے۔ چچا بھتیجا کی قبریں ایک ہی جگہ ہیں۔ زینہ کدل سے غربی جانب ۔ ان کی قبر بھی جب اہل کشف کی توجہ سے ظاہر ہوئی تو ان کی قبر کے تعویذ پر بہ خط قدیم یہ رباعی لکھی ہوئی نظر آئی۔

جائے است کہ عقل آفریں نیز ندش   صد بوسہ زشوق برجبیں مے زندش
آں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف   مے ساز وباز برزمیں مے زندش

خواجہ محمد اعظم ان دونوں بزرگوں کی قبروں کو مصدر فیوض وبرکات بتاتا ہے۔

حواشی:

۱) مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

۲) تاریخ خواجہ اعظمی۔

۳) مولانا ابو محمد حسن شعری قادری صاحب دیوان فارسی گلزار خلیل مطبوعہ مطبع مطلع نور لاہور ۱۲۹۱ھ۔

۴) یہ خاندان عرب سے نکل کر پہلے پہل اندراب (ایران) میں داخل ہوا۔ وہاں سے کچھ عرصہ کے بعد کوہ ہندوکش کے قریب اقامت اختیار کی۔ لیکن عجم کے وطن اول یعنی اندراب کی طرف منسوب ہو کر اندرابیہ کہلایا۔ جب یہ خاندان کشمیر آیا تو یہاں بھی سادات اندرابیہ کے نام سے ہی مشہور رہوا۔

۵) اس کا نام اصل میں ملا عراقی ہٹہ تھا۔ ملا عالم تجر کو کہتے ہیں۔ شاید کسی عراقی ملا کے نام پر ہو۔ اب اسی محلّہ کو ملا رٹہ کہتے ہیں۔

۶) سید احمد اندرابی کے فرزند سید محمد ان کے سید محمد ابراہیم اور ان کے فرزند سید شمس الدین اندرابی۔

۷) سید محمد میرک اندرابی آپ ہی کے اکلوتے فرزند تھے۔ جن کی ذریت سے کشمیر کا مشہور خاندان سادات اندرابیہ کشمیر و پنجاب میں اس کس مپرسی کے زمانہ میں بھی اپنا علمی روائتی وقار قائم رکھے ہوئے ہے۔ آپ کا مزار قلعہ ناگرنگر یعنی اکبری قلعہ ہری پربت کے اندر قلعہ مذکور اور اخون ملا شاہ کی مسجد و حمام کے درمیان واقعہ ہے۔

۸) بعض احباب سے جب سنا کہ اس کتاب میں اکثر مقامات پر بڈشاہ کا بھی ذکر ہے۔ تو اس کی بہت تلاش کی گئی۔ مولانا مولوی محمد عتیق اللہ صاحب جنرل سکرٹری انجمن نصرت الاسلام

سرینگراور مولوی محمد شاہ سعادت مفتی سرینگر کے پاس اس کا پتہ چلا۔ مگر وہاں سے بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ پھر معلوم ہوا کہ ایک نسخہ موجود ہے لیکن پیرزادہ نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ ان کے مکان پر ہی اس کا مطالعہ کرلیا جاتا۔

(۹ بلخ کی کوئی تاریخ ہی ان کے بادشاہ بلخ ہونے کی تصدیق وتکذیب کرسکتی ہے۔ ممکن ہے خاندان شاہی سے ہوں یا بلخ کے رئیس زادے ہوں۔

(۱۰ مزار اور مسجد کی سابقہ اور موجودہ حالت کے لئے دیکھو ضمیمہ ۷۔

(۱۱ اسرار الابرار غیر مطبوعہ تصنیف ۱۰۲۳ھ و مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم۔

(۱۲ اسرار الابرار مگر اصل پیدائشی نام جے سنگھ تھا۔ صاحب تاریخ اعظمی نے زیا (جیا) سنگھ لکھا ہے۔ زے جیم سے اور جیم زے سے بدل جاتی ہے۔ جیسے جونران سے زونراج۔ اس لئے نام ان کا جے سنگھ تھا۔

(۱۳ فتحیات کبرویہ صفحہ ۴۰۰ پر لکھا ہے۔ ''درآں وقت شیخ طہارت میکرد سلطان آمدہ بر مصلے بنشست واز شیخ التفاتے نہ یافت تا بہ تعظیم چہ رسد''۔ خوراق السالکین کے مصنف نے بھی صاحب فتحیات کی تائید میں طہارت ہی کا ذکر کیا ہے۔ اسی واقعہ کو ان دونوں کتابوں سے بہت عرصہ کے بعد بابا کمال الدین ریشی نے اپنی تصنیف نور الدین نامہ منظوم (۱۲۴۵ھ) میں بڑھا گھٹا کر بابا بام الدین کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ یہ کتاب بھی غیر مطبوعہ ہے اور ساڑھے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

(۱۴ اسرار الابرار سال تصنیف ۱۰۶۳ھ غیر مطبوعہ۔

(۱۵ صفحہ ۹۳۔۹۴۔۹۵ غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۱۰۹ھ ترجمہ۔

(۱۶ غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۰۶۳ھ ترجمہ۔

(۱۷ صاحب فتحیات نے بھی خود بادشاہ کے بیمار ہونے کی تائید کی ہے۔ لیکن اتنا اضافہ کیا ہے کہ بادشاہ عاجز ہونے کے بعد بابا لطیف الدین کی خدمت میں جو اس زمانے میں کامل واکمل بزرگ تھے آیا اور شفا کے لئے دعا کی التجا کی۔ آپ نے فرمایا بابا زین الدین ہی کی دعا کارگر ہوسکتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے بیٹے شہزادہ حیدر خاں (حاجی خاں) کو استدعائے مراجعت اور عذر تقصیرات کا پیغام دیکر بھیجا۔ ان کے تشریف لانے سے بادشاہ کو صحت کی ہوگئی۔

۱۸) مزار حضرت شاہ اسحاق در کابل در جہت شرقی قریب سواد شہر واقعہ است دوران جابہ "شہیداں" اشتہار رواز تاریخ اعظمی صفحہ ۱۵۲۔

۱۹) بابا جی ادہم بھی آپ ہی کا نام ہے۔

۲۰) مزار اور قبرستان بہاؤالدین گنج بخش کے مفصل حالات دیکھو ضمیمہ ۶۔

۲۱) عالی کدل میں جس مکان میں آپ پیدا ہوئے وہاں آج کل مفتی اعظم مولانا شریف الدین مرحوم کے فرزنداں رہتے ہیں۔ اکبر بادشاہ نے یہ مکان آپ کے ایک بزرگ خواجہ موسیٰ کو عنایت کیا تھا۔ جب آپ کے پردادا مولوی نظام الدین محمد شاہ مؤلف تاریخ نظام الوقائع بعہد جبار خاں سکھوں اور پٹھانوں کی لڑائی میں شہید ہو گے تو سکھوں نے جو علم وادب کی قدر و قیمت سے بے بہرہ تھے مکان کے ساتھ ہی آپ کے عظیم الشان کتب خانے کو بھی جلا دیا۔ مولانا شریف الدین مرحوم ابوالخیر مولوی خیر الدین کی جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتب کرنے والوں سے ایک تھے ساتویں پشت سے تھے۔

۲۲) فتحیات الکبرویہ صفحہ ۳۱۵۔

۲۳) جب رینچن شاہ نے اسلام قبول کر کے اپنا نام ملک صدرالدین بادشاہ کشمیر رکھا اور اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے اور بادشاہ اور سید بلبل (بلال) شاہ نے جن کے ہاتھ پر رینچن شاہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ اسی علاقہ میں اپنے محلات و مکانات بنوائے تو ہنود نے از راہ نفرت وحقارت اس محلّہ کا نام ملیچھ مر رکھا۔ ملیچھ اس زمانہ میں ہر غیر ہندو کا نام تھا اور مر بزبان کشمیری جگہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ محلّہ عالی کدل سے بجانب شمال ہے۔ بلندی پر واقعہ ہے۔ اس کو بلندی مر یعنی بلندی کی جگہ اور اب تھوڑے سے تغیر کے ساتھ بلدی مر بھی کہتے ہیں۔

۲۴) فتحیات کبرویہ اور خواجہ اعظمی میں لکھا ہے کہ آپ کے ساتھ چودہ اور سادات بھی شہید کئے گئے تھے۔

انیتسواں باب

متفرقات

دو ماہہ دم دار تارا

کشمیر کے اس دور امن وامان کو فلک پیر زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ ملک میں بظاہر تو فتنہ وفساد کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ لیکن لوگوں نے ایک دفعہ شام کو شمال کی طرف ایک دم دار تارا(۱) دیکھا۔ جو برابر دو ماہ تک آسمان پر نظر آتا رہا۔ بادشاہ اور اس کے نجومیوں اور عالم لوگوں نے اس تارہ کی بدشگونی کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ ملک میں کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔ کتے دن کو خود بخود اور لگاتار بھونکتے رہتے تھے۔ اسی دوران میں پندرہ دن کے اندر اندر سورج اور چاند دونوں کو گرہن لگا۔

آفتاب ایک نحس دن میں ایک برج سے دوسرے برج میں چلا گیا۔

شاہی محل کے اوپر ایک چتر تھا۔ انہی ایام میں ایک اُلو (۲) آکر اس پر بیٹھا کرتا اور اپنی کرخت آواز سے اپنی نحوست ظاہر کیا کرتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ غالباً زراعت کو نقصان پہنچے گا اور ملک پھر قحط کی آفت میں مبتلا ہوگا اور شاید بادشاہ پر بھی کوئی مصیبت نازل ہو۔ بادشاہ بھی ان واقعات سے بہت مضطرب رہتا تھا۔

اس دم دارتارا کے بعد ہی سوپور میں عظیم آتشزدگی ہوئی۔ جس میں شہر کے علاوہ سرکاری دفاتر اور دریا کا پل بھی نذر آتش ہو گئے۔ ملکہ کشمیر اور بادشاہ کے بھانجے قیام الدین اور چند اور مصاحبین کی موت بھی اسی واقعہ کے بعد ہوئی اور ان موتوں نے بادشاہ کو اور بھی غمزدہ اور نحیف کر دیا۔

خراسانی قحط زدگان کشمیر میں

خراسان کے کئی اہل ہنر لوگ کشمیر میں موجود تھے۔ ان کے ذریعے خراسان میں بادشاہ کی فیاضی ورحمدلی کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ نیز بادشاہ خراسان کے ساتھ اس کے تعلقات بھی اچھے تھے۔ ایک دفعہ خراسان میں اس شدت سے قحط پڑا کہ شیخ سعدی کا یہ شعر

چنیں قحط سالے شد اندر دمشق　　　　کہ یاراں فراموش کردند عشق

دمشق کی بجائے خراسان پر صادق آنے لگا۔

خراسانی قحط زدہ فوج درفوج کشمیر میں پناہ ڈھونڈنے کے لئے آنے لگے۔ بادشاہ نے ان سے کیفیت پوچھی۔ تو ان کے نمائیدوں نے عرض کیا۔ ہمارے ملک میں اور ملحقہ کئی ممالک میں سخت قحط پڑا ہے۔ لعل وجواہر کوڑیاں کے مول بک چکے ہیں اور بک رہے ہے۔ بڑے بڑے دولتمند اور خاندانی آدمی بھی ہماری طرح بھیک مانگنے اور ملک بدر ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آدمی کو آدمی کھا رہا ہے۔ ملک ویران ہو چکا ہے۔ بے شمار مر گئے اور لاتعداد زندہ درگور ہیں۔ مرزا ابوسعید بادشاہ خراسان بھی ایک

جمعیت لیکر خوراک کی تلاش میں اپنے ملک سے باہر نکلا اور مجبوراً اپنے دشمن بادشاہ عراق کے ملک میں داخل ہوگیا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ گرفتاری کے وقت بلکہ گرفتاری کے بعد بھی اس نے بڑی بہادری دکھائی۔ لیکن آخر کار وہ مارا گیا اور اس کے ساتھ بہت سے ترشک (ترک) بھی ہلاک ہوگئے۔ اے بادشاہ ہم نے آپ کی فیاضی، نیکی اور خوشحالی کا حال سُنا ہے اور ہم مصیبت کے مارے آپ کی پناہ میں آئے ہیں۔ شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ پر اس تقریر کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے مہاجرین خراسان کو خوراک اور رہائش کے اسباب مہیا کئے اور ہر طرح سے ان کی دلجوئی کی۔

اقوام جرائم پیشہ کے ساتھ سلوک

ملک میں ڈوم، چوپان اور چند دیگر ایسی اقوام تھیں۔ جنہوں نے ملک میں اودھم مچا رکھا تھا۔ یہ لوگ اکیلے دو کیلے مسافر کو لوٹ لیتے تھے اور موقعہ ملتا تو جان سے بھی مار دیتے تھے۔ چوری اور ڈکیتی ان کا پیشہ تھا۔ کہیں خانہ بدوشوں کی طرح رہتے تھے اور کسی جگہ کوئی مکان بھی بنا لیا کرتے تھے۔

بادشاہ نے سخت سزاؤں کے ذریعے ان کا تدارک کیا۔ ان میں جو نامی چور اور ڈاکو تھے۔ ان کو دائم الحبس کر کے بیڑیاں پہنا دیں۔

بادشاہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ آوارہ گرد اور پس اُفتادہ اقوام کے لوگ کچھ تو عادتاً، کچھ غربت کی وجہ سے جرائم کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان کی غربت دور کرنے کا علاج سوچا جائے اور وعظ و نصیحت سے ان کی عادت ثانیہ کو بتدریج تبدیل کیا جائے۔

تو ممکن ہے ان کی اصلاح بھی ہو جائے اور عوام کو بھی ان کی لوٹ مار سے نجات مل جائے۔

چنانچہ بادشاہ نے ان جرائم پیشہ اقوام کو اراضیات کاشت کے لئے مفت عطا کیں اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے بھی کچھ نقد و جنس عطا کیا۔

ہر چند شریور نے اپنی زینہ راج ترنگنی میں واضح طور پر اس بات کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے مذہبی عالموں کے ذریعے بھی ان کے اخلاق درست کئے ہوں۔ لیکن جو بادشاہ اپنی رعایا کے فلاح و بہبود اور امن عامہ اور درستی اخلاق کے لئے نیم سرکاری واعظوں کا تقرر منظور کرتا ہے۔ وہ مفسد اور لیٹری اقوام کے اخلاق کی درستی سے کب غافل رہ سکتا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ بادشاہ نے ان اقوام کے اخلاق واطوار کے لئے کچھ واعظ بھی مقرر کئے ہوں۔

صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ اس کے عہد میں جہاں کہیں چوری کا واقعہ ہوتا۔ مال اسباب کا نقصان اس موضع کے باشندوں سے وصول کرلیا جاتا۔ اس طریق سے اس کے زمانہ میں چوری عنقا ہوگئی تھی۔ صاحب وجیز التواریخ بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں جہاں کہیں چوری کی خبر سُنی جاتی شہر کے رئیس اور علاقے کے کوتوال سے مال مسروقہ کی قیمت وصول کی جاتی اور یہ رقم جو اس زمانہ میں تاوان کے نام سے موسوم تھی۔ اس شخص کو بہ اخذ رسید دی جاتی جس کا مال چوری ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات بادشاہ کے ذہن نشین ہوگئی تھی کہ علاقہ میں جو لوگ صاحب اثر ہوتے ہیں۔ چوریاں ان کے ایما سے ہوتی ہیں اور وہ ان میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے اس نے چوروں کو سزا دینے کے علاوہ دیہات کے ذمہ دار لوگوں پر بھی

مال مسروقہ کا تاوان ڈال رکھا تھا۔ شریور لکھتا ہے۔ اس بادشاہ کے عہد میں مسافر جنگلوں میں اس طرح پاؤں پسار کر سوتے تھے۔ جیسے وہ اپنے گھر کی چاردیواری کے اندر ہی سو رہے ہیں۔

جیل خانہ میں اصلاحات

اقوام جرائم پیشہ کے لئے تو بادشاہ نے مفت اراضیات کا انتظام کیا۔ لیکن جو عام قیدی زنداں خانوں میں آتے تھے اور جو چوری، مار پیٹ اور بعض دیگر جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کو بادشاہی تعمیرات میں مزدوری پر لگا دیا جاتا تھا۔ کشمیر میں بادشاہی تعمیرات کی جو کثرت ہے اور شہر کے علاوہ مزار و کمراز کے علاقہ میں بادشاہ کے حکم سے جو باغات بنائے گئے اور بستیاں آباد کی گئیں۔ نہروں کا اجراء کیا گیا اور دریا کے ستھو تعمیر کئے گئے۔ ان میں عام مزدوروں کے علاوہ قیدی مزدور بھی کام کیا کرتے تھے اور جب وہ جیل سے باہر نکلا کرتے تھے تو ان کے دل و دماغ بہت کچھ اصلاح یافتہ ہوتے تھے۔

مذہبی اپدیشکوں اور واعظوں کا امتحان

بادشاہ کے باپ شاہ سکندر بُت شکن اور بادشاہ کے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر کے عہد میں چونکہ نو مسلم وزیر ملک سیف الدین کو ہندوؤں سے اور ہندوؤں کو اس سے

نفرت تھی۔ اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے زمانے میں ہندو اطمینان کا کوئی سانس نہ لے سکے۔ مذہبی تکرار اور بحث مباحثہ کی وجہ سے ان میں اکثر بدمزگی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ بڈشاہ کے زمانے میں جب ہندوؤں کو از سر نو عروج حاصل ہوا اور بڈشاہ نے ملکی مصلحتوں اور اقلیت کے تالیف قلوب کے خیال سے جب ان کو ان تمام نیکیوں اور پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ جو گزشتہ بادشاہوں کے زمانہ میں ان کے لئے مصیبت کا باعث تھیں۔ تو معلوم ہوتا ہے مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ نہ کچھ پھر چپقلش ہونے لگی۔ شریور لکھتا ہے کہ جب بادشاہ نے ہندو مردوں کے جلائے جانے اور ان کے ماتمی مراسم کی ادائیگی کا ٹیکس معاف کر دیا تو مسلمانوں نے اس پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔ چونکہ مذہبی اشتعال اپدیشکوں اور واعظوں کے ذریعہ ہی کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ انہی باتوں سے متاثر ہو کر بادشاہ نے حکم دیا کہ کسی مذہب کا کوئی واعظ یا عالم اس وقت تک وعظ کرنے یا لیکچر دینے کا مجاز نہیں ہے۔ جب تک وہ وعظ خوانی کی سرکاری سند نہ حاصل کر لے۔ شریور لکھتا ہے۔ ان مذہبی عالموں کا باقاعدہ امتحان لیا جاتا تھا اور بعض اوقات بادشاہ خود بھی امتحان لیتا تھا جسے مذہبی تعلیم میں، صبر و ضبط میں اور مفاد امن عامہ میں کامل و ماہر دیکھتا تھا۔ اس کو وعظ خوانی کی اجازت دیتا تھا۔

جب مذہبی عالموں کا باقاعدہ امتحان ہوتا تھا۔ تو یقیناً ان کے لئے کوئی باقاعدہ درسگاہ بھی ہوگی۔ جہاں ہندو مسلمان علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مذاہب کی واقفیت حاصل کرتے ہونگے۔ بلکہ ممکن ہے ہندو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے اور مسلمان ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔

بادشاہ کا محکمہ خفیہ پولیس

حکومتوں اور سلطنتوں میں خفیہ پولیس کا رواج زمانہ دراز سے چلا آتا ہے۔ اس محکمہ کے ذریعے بادشاہوں کو اپنی رعایا کے صحیح صحیح حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ جو حاکم یا افسر رعایا پر ظلم کرتا ہے یا رشوت لینا ہے۔ اس کی اطلاع بادشاہ کو مل جاتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس محکمہ کے افسر اور اہلکار نہایت متدین، صادق اور خیر خواہ رئیس ورعیت ہونے چاہئیں ورنہ بصورت دیگر اس محکمہ کے ہاتھوں رعایا کی تباہی ہوجاتی ہے۔ اور مملکتوں کی طرح بڈشاہ نے بھی اپنی مملکت میں خفیہ پولیس کا ایک محکمہ قائم رکھا تھا۔ اس محکمہ کے اہلکار جو درحقیقت شاہی جاسوس اور پرچہ نویس تھے۔ تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس محکمہ کے فرائض ان ایام میں غالباً اس قسم کے تھے۔

(۱) سخت گیر حکام اور رشوت خوار افسروں کے متعلق رپورٹ کرنا۔

(۲) ملک میں بدامنی کی وجوہات صحیح طور پر دریافت کر کے اطلاع دینا۔

(۳) غافل، آرام طلب اور عیش پرست حکام کے حالات لکھنا۔

(۴) دورہ کے ایام میں حکام کا طرز عمل رعایا کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس کی نگرانی کرنا۔

(۵) زمینداروں کی واجب اور جائز شکایات معلوم کرنا۔

(۶) باغیوں اور سرکشوں کی حرکات سے مقامی حکام اور مرکزی حکومت کو اطلاع دینا وغیرہ وغیرہ۔

اس طریق سے بادشاہ کو اپنی رعایا اور اپنے ماتحت حکام کے حالات سے کامل واقفیت رہتی تھی اور وہ توجہ طلب امور کا تدارک بھی کرتا تھا۔

صلحاء علماء کا احترام

بادشاہ ہر چند ہندوؤں پر حد سے زیادہ مہربان تھا اور برہمنوں کی خاص طور پر قدر افزائی کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ اپنے مذہب کے صلحاء علماء اور صوفیائے عظام کے اعزاز ومناصب سے بھی غافل نہ تھا۔ ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ مذہبی معاملات میں ان سے مشورے لیتا تھا اور ان کی باتوں پر عمل بھی کرتا تھا۔ علمائے کرام کے لئے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کراتا تھا اور اکثر اوقات خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ زونراج لکھتا ہے۔ چونکہ بادشاہ اپنے صلحاء وعلماء سے تعظیم وتکریم کے ساتھ پیش آتا تھا۔ اس کی تقلید میں راجہ مدر دیش اور دوسرے کئی راجے اور رئیس کتوں (۲) کی طرح اولیاء صوفیاء کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے۔

جس طرح بادشاہ مسلمان صلحاء سے مذہبی معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ اسی طرح نیلہ مت پران اور دوسرے ہندو شاستروں کو پنڈتوں سے سُنا کرتا تھا۔

بادشاہ کی ایک خواہش

شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کی ایک خواہش بڑی زبردست تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جو باتیں بادشاہ اپنی رعایا کے لئے نہیں کر سکے۔ وہ میرے ہاتھوں سے پوری ہوں۔ بلکہ آئندہ بادشاہوں کے لئے میں جہانداری اور جہانگیری کے وہ آئین وقوانین بنا

جاؤں۔جن سے ان کے نام ہمیشہ رعایا کے لوح دل اور تاریخوں کے سنہری اوراق پر منقوش رہیں۔

ہر چند کہ اس کے ناخلف فرزندوں نے نت نئے لڑائی جھگڑوں سے اس کو ہمیشہ آزردہ اور پریشان رکھا اور اس کا بہت سا وقت اور خزانہ جو رعایا کی فلاح میں صرف ہوسکتا تھا۔خانہ جنگیوں کی روک تھام میں صرف ہوگیا۔تاہم بادشاہ نے اپنے عہد حکومت میں رعایا کے لئے ایک سبق اور نمونہ ہے۔

وہ گزشتہ بادشاہوں کے حالات بڑے شوق سے سنتا۔ان کی بری باتوں کو نظرانداز کردیتا اور ان میں جو اچھی باتیں ہوئیں وہ ذہن نشین کر کے آویزہ گوش بنالیتا اور خذما صفا ودع ما کدر پر صحیح عمل کرتا۔

ایک خاص لباس کا حُکم

کشمیر میں عام طور پر مشہور ہے کہ پھرن اور کانگڑی بڈشاہ کی ایجاد ہے اور یہ دونوں چیزیں اس نے اس لئے ایجاد کیں کہ رعایا جو باغی اور سرکش رہتی ہے وہ سست اور آرام طلب ہوجائے۔

بڈشاہ کے طویل عہد حکومت میں اس کی رعایا کے باغی یا سرکش ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔البتہ اس کے فرزند باغی اور سرکش ضرور ہوجایا کرتے تھے۔بلکہ رعایا کا کثیر حصہ اس کے فرزندوں کی حرکات سے نالاں رہتا تھا۔اس لئے رعایا کے

سرکش یا باغی ہونے اور پھرن اور کانگڑی کی ایجاد سے اس کے سست اور آرام طلب کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اہل کشمیر کا اصل لباس تنگ پاجامہ اور انگرکھا ہوتا تھا۔ بال لمبے لمبے ہوتے تھے۔ داڑھی منڈانے کا رواج نہ ہندوؤں میں تھا نہ مسلمانوں میں۔ جب سلطان قطب الدین کے زمانہ میں حضرت سید علی ہمدانی تشریف لائے تو انہوں نے مسلمانوں کے لئے عربی قسم کا جبہ وعمامہ پسند کیا۔ اور اسی کا رواج عام ہوگیا۔ جیسا کہ صاحب واقعات کشمیر خواجہ محمد اعظم لکھتے ہیں۔ ''احکام اسلام وشریعت ہنوز بخوبی شائع شدہ نہ بود۔ وسلطان ہم لباس قوم کفرہ مے پوشید آں را بہ امرو نہی حضرت سید ترک دادو اُمر امر آنحضرت را سلطان بہ دل و جان بجا آورد''۔ چونکہ بادشاہ نے بھی یہی لباس اختیار کرلیا تھا اس لئے الناس علی دین ملوکھم کے مطابق ہندوؤں نے بھی یہی لباس پہننا شروع کردیا۔ جس نے رفتہ رفتہ موجودہ پھرن (پیرامن) کی شکل اختیار کرلی۔

بڈشاہ کے زمانہ میں بھی یہی لباس تھا مگر شریور لکھتا ہے کہ بادشاہ نے ملک کے لئے ایک خاص لباس مقرر کیا۔ لیکن اس نے اس خاص لباس کی تشریح نہیں کی۔ یہ پھرن تو جبہ کی صورت میں اس سے پہلے ہی رائج ہوچکا تھا۔ پھر وہ خاص لباس کون سا لباس تھا۔ چونکہ اس کے ساتھ ہی شریور نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے فوج میں اس قسم کی سپرٹ پیدا کردی اور ایسا نظام قائم کردیا کہ بیرونی حملہ آوروں کے لئے کشمیر میں داخل ہونا ناممکن ہوگیا۔ ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے جو خاص لباس مقرر کیا تھا۔ وہ سارے ملک میں نہیں تھا بلکہ صرف فوج کے لئے تھا۔ اس لئے کہ پھرن

سے فوجی سپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔فوجی سپرٹ ہمیشہ چست اور تنگ لباس سے ہوا کرتی ہے۔

بازیگروں کا تماشہ

اس بادشاہ کے زمانے میں اترپت (uttarpatha) کے مقام سے کچھ بازیگر (۴) آئے۔ بادشاہ بیگمات سمیت ومیش پرست (vimshaprastha) مقام پران کے کمالات دیکھنے کے لیے آیا۔ بازیگروں نے ایک لمبی رسی کو لکڑی کے دو مضبوط ڈنڈوں کے ساتھ جن کا باہمی فاصلہ ایک سوکمان کے قریب تھا، باندھا اور ایک رسی کے ذریعہ جو لٹک رہی تھی۔ وہ ایک جانور کی طرح دوڑتا ہوا چڑھ گیا اور پھر اس لمبی رسی پر جو دو ڈنڈوں کے درمیان تھی اس طرح چلنے لگا۔ جس طرح کوئی زمین پر چلتا ہے۔

رشوت کا انسداد

ملک میں بہت عرصہ سے رشوت کی گرم بازاری تھی۔ عدالتوں کے لوگ کیا جج اور کیا اہلکار رشوت کو شیر مادر سمجھ کر بے ڈکار ہضم کیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے راشیوں کے لئے سخت سے سخت سزائیں مقرر کیں اور جس افسر کے متعلق رشوت گیری کا الزام پایہ ثبوت تک پہنچ گیا۔ اس کے عہدہ یا منصب کا لحاظ کئے بغیر اس کو پوری سزا دی۔

بادشاہ کی روحانیت

بادشاہ کی صفائی قلب اور اس کی روحانیت کا ذکر کرتے ہوئے شریور لکھتا ہے۔ جو خود غرض اور فتنہ پرداز وزاراء اور اہل اقتدار لوگ بادشاہ کے فرزندوں کو کبھی بادشاہ کے ساتھ لڑادیا کرتے تھے اور کبھی شہزادوں کی باہمی خانہ جنگیوں سے ذاتی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ کئی روحانی وجسمانی تکلیفوں کے بعد ایک ہی سال میں ختم ہوگئے۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ ایسے لوگوں کے متعلق صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ یہ وزراء اور درباری جو میرے فرزندوں کو میرا نافرمان بنا کر ملک کو بدامنی کے غار میں دھکیل رہے ہیں۔ وہ اپنی اندرانی خباثتوں کی وجہ سے اب زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے اور میں اپنی زندگی ہی میں ان کی موت کی خبر سنوں گا۔ شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کی دلی پاکیزگی اور روحانیت اور اس کی نیک نیتی ہی کا یہ اثر تھا کہ فتنہ پرداز ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں کے سامنے رخصت ہوگئے۔

جہانگیر نے اپنی توزک اور مولانا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری اور محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں اور کشمیر کے ہندو مسلمان مورخوں نے اپنی تصانیف میں اس کی بعض خوارق عادات کا بھی ذکر کیا ہے۔

حرمت ماہ رمضان

آج کتنے مسلمان ہیں جو رمضان کے مہینے میں گوشت سے قطعی پرہیز

کرتے اور ہر قسم کے عیش وعشرت سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں؟ بادشاہ اس مبارک مہینے کے احترام میں سارا مہینہ گوشت ترک کر دیتا تھا۔ اور ہر قسم کی لذات دنیوی سے پرہیز اختیار کر لیتا تھا۔ اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ حرمتِ ماہ رمضان کے لئے اور کیا کچھ نہ کرتا ہوگا۔ افطاری کا انتظام بادشاہ کی طرف سے کس اہتمام سے ہوتا ہوگا۔ نوشہرہ کی شاہی مسجد میں بادشاہ کس ذوق وشوق سے آتا ہوگا اور پھر عید کا جلوس کس شان شوکت اور کس جاہ وجلال سے نکلتا ہوگا۔ اس کا اندازہ پھولوں کے تہوار سے ہوسکتا ہے۔

شفاخانے اور دائیاں

شیو بٹ نہ صرف اعلےٰ درباری طبیعت ہی تھا بلکہ اس کو اس زمانہ کا ڈائرکٹر میڈیکل سروسز سمجھنا چاہئے۔ بادشاہ نے جو شفاخانے تیار کرائے تھے وہ سب اسی کی زیر نگرانی تھے۔ بادشاہ نے بہت سی طبی کتب بھی ہندی اور سنسکرت سے عربی اور فارسی میں ترجمہ کرائیں۔

اس زمانے میں جبکہ ہندوستان میں عام شفاخانوں اور رفاہ عام کے کاموں کا بادشاہوں کو بہت کم خیال تھا۔ بڈشاہ نے ہمدردی نسواں کا عملی ثبوت دیا اور گو زنانہ شفاخانوں کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس نے سرکاری طور پر سرکاری تربیت یافتہ دائیوں کا ضرور انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ خواجہ محمد اعظم تاریخ اعظمی میں لکھتے ہیں۔

"از ارباب صنائع رامثل کاغذگر وصحاف وقالین باف وزین ساز وقابلہ ہا که وقت وضع حمل خدمت عورت بکنند یا خود به کشمیر آورد۔ (۵)

زینہ جامہ

بادشاہ نے اپنے عہد میں زینہ گیر کو آبادی و آب پاشی و باغات وایوانات کی کثرت سے نمونہ خلد بنا رکھا تھا۔ اس زمانہ میں یہاں پٹو سازوں کی بھی کثرت تھی۔ اور تمام کشمیر میں زینہ گیری پٹو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔

زینہ گیری پٹو کو اس زمانہ میں زین العابدین کے نام کی رعایت سے زینہ جامہ (٦) کہتے تھے۔ خواجہ محمد اعظم اسی پٹو کے متعلق لکھتا ہے۔ ''آں را در عرف آں وقت زینہ جامہ مے گفتند''۔

کشمیر میں لباس کی تبدیلی ۷۵۸ھ سے شروع ہوئی۔ جبکہ امیر کبیر سید علی ہمدانی تیسری مرتبہ کشمیر آئے اور سلطان قطب الدین کو کشمیر کے قدیم لباس سے جو تنگ اور چُست ہوتا تھا منع کیا اور عرب کا لباس ایک لمبا کرتہ جس کو اب ہم پھرن کی شکل میں دیکھ رہے ہیں، پہننے کا مشورہ دیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ زینہ جامہ پھرن ہی تھا یا پھرن نما کوئی لباس تھا۔

پولیس چوکیاں

کشمیر کے پہاڑوں نے کشمیر کی وادی کو چاروں طرف سے محفوظ رکھنے میں بہت مدد دی ہے۔ لیکن ملک کی زیادہ حفاظت کے لئے کوہستانی دروں پر زمانہ قدیم ہی

سے چوکیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ یہ چوکیاں عموماً قلعہ یا گڑھی کی صورت میں ہوتی تھیں۔ جن میں فوج اور پولیس کی کچھ تعداد رہا کرتی تھی۔ جو اس بات کی ذمہ دار ہوتی تھی کہ کوئی شخص بلا اجازت یا بلا پروانہ راہداری نہ ملک سے باہر جاسکے نہ اندر آسکے۔ چنانچہ جب راجہ سسل کا قاتل ایتل ''پسیان ناڈ'' کی طرف سے جس کا موجودہ نام پشیان ہے کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کررہا تھا تو ہور پور (۷) کی چوکی کے محافظوں نے اس کو گرفتار کرلیا۔ پولیس اور فوج کی ذمہ داریاں علیحدہ علیحدہ بھی تھیں۔ پولیس تو انتظام کو برقرار رکھتی اور پروانہ رابداری دیکھتی تھی اور فوج پہاڑی شورہ پشتوں سے میدانی لوگوں کو محفوظ رکھتی تھی۔ قدیم ہندو زمانے میں ان تمام سرحدی مقامات کے اختیارات ایک اعلٰے سرکاری افسر کے سپرد ہوتے تھے جسے دوار پتی یا اسی قسم کے کسی اور نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

اس طریق کا حوالہ عہد بڈشاہی کے نامور مورخ پنڈت زونراج نے بھی دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ پروانہ راہداری کے سلسلہ میں بڈشاہ کے زمانہ میں بھی اس کے سخت احکام کے باوجود عہد قدیم کا جبر وتشدد قائم تھا اور پولیس لوگوں سے جبریہ رقمیں وصول کرکے ان کو ملک سے باہر جانے یا اندر آنے کی اجازت دیتی تھی۔

ہوپورہ کی چوکی میں لنگر خانہ اور حمالوں کی بستی

انقلاب حکومت ومذہب کی وجہ سے ہیرہ پور یا ہور پور کی چوکی کی پہلی شان قائم نہ رہی تھی۔ زین العابدین نے اس تجارتی راستہ کی اہمیت برقرار کرکے یہاں

مسافروں کے لئے ایک لنگر خانہ جاری کیا اور علاقہ ابھیار (موجودہ نام بھمبر) کی طرف سے حمال اور قلی لاکر یہاں آباد کیے۔ چنانچہ ہیرہ پور، پشیاں یا پشیانہ اور درہ پیر پنچال کے قریب اب بھی پیشہ ور حمال اور قلی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

گراں فروش غلہ داروں کے لئے بادشاہ کے احکام

سوداگروں کا قاعدہ تھا کہ جو مال دہ دیہات و مفصلات یا بیرون کشمیر سے لایا کرتے تھے۔ اس کو گراں قیمت پر بیچنے کے لئے چھپا رکھتے۔ تجارت کے متعلق اسلام نے جو احکام دے رکھے ہیں۔ بادشاہ ان سے بے علم نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص غلہ لاکر بہ نرخ حال بیچتا ہے خدا اس کی روزی میں برکت دیتا ہے اور جو شخص گرانی کی خاطر غلہ کو روکے رکھتا ہے وہ رضائے حق سے دور کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے بادشاہ نے نہایت سختی سے سوداگروں کے نام احکام جاری کئے کہ جو شخص اپنا مال گراں بیچنے کے لئے پوشیدہ رکھتا ہے اور زیادہ منافع لگا کر قحط اور گرانی کا موجب ہوتا ہے۔ وہ سرکار کا مجرم ہے۔ کوئی شخص اپنا فروختنی مال پوشیدہ نہ رکھے۔ بلکہ بہت کم منافع پر فروخت کیا کرے۔ (۸)

بادشاہ کی دریائی سیر و سیاحت

بادشاہ بالعموم سیر و سیاحت میں رہتا۔ میدانی سیر کی طرح وہ دریائی

تفریحات کا بھی ء ستق تھا اور بلند ورفیع پہاڑوں پر بھی جہاں وسیع وعمیق چشمے ہوتے تھے۔ وہ کشتی کی سیر کیا کرتا تھا۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس کے زمانہ میں کس قسم کی کشتیاں اس ملک میں رائج تھیں۔ ایک قسم لرہ ناؤ کہلاتی تھی۔ اس کو آجکل کا ہوس بوٹ سمجھنا چاہئے۔ اس کا طول ۳۰ سے ۴۰ گز اور عرض ۴ سے پانچ گز ہوتا تھا۔ اس کشتی کے درمیان اس کی نوکدار سمت جو سطح آپ سے بہت اونچی رہتی تھی۔ ایک قد آدم آشیانہ یعنی سقف بنایا جاتا تھا۔ جس کو حکام وسلاطین کے لئے سجایا جاتا۔ اس کے ہر دو جانب چالیس پچاس ملاح بیٹھتے اور اس ہوس بوٹ کو اس طرح چلاتے کہ وہ پانی پر چلتا نہیں بلکہ دوڑتا نظر آتا۔ اس قسم کی کشتی دریا، ڈل اور وُلر کے سوا اور کہیں استعمال نہ ہوسکتی تھی۔

کشتی کی دوسری قسم پرندہ کہلاتی تھی اس کا طول ۲۰ سے ۳۰ گز اور عرض چار گز تک ہوتا۔ اس کی نوک پر ایک مربع بنگلہ تیار کیا جاتا۔ جس میں حکام وسلاطین نشست فرماتے۔ لرہ ناؤ اور پرندہ یہ دونوں کشتیاں بادشاہ اور احکام کے لئے مخصوص تھیں۔

چشمہ کوثر ناگ میں بڈشاہی کشتی

شوپیاں کے بلند پہاز پر یہ مشہور ومعروف چشمہ واقع ہے۔ اس کا دور تین چار میل تک بتایا جاتا ہے اور شکل اس کی کفِ پا سے مشابہت رکھتی ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہاں وشن جی بیٹھے تھے۔ ان کے پاؤں سے یہ چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس کا پانی ہمیشہ نیلگوں رہتا ہے اور اس کے عین درمیان برف کے ٹکڑے نظر آتے ہیں۔ اس

کی بلندی سطح سمندر سے ۱۵۵۳۰ فٹ بیان کی جاتی ہے۔

بادشاہ نیرنگئی نظرت اور نظارہ ہائے قدرت کا عاشق تھا۔ وہ اس بلند مقام پر پہنچتا اور مرغزار و چشمہ سار کے لطف اٹھاتا تھا۔ کوثر ناگ میں سیر کے لئے اس نے چوب صندل کی ایک خوش نما کشتی بنا رکھی تھی۔ جو ہمیشہ اسی چشمہ پر رہا کرتی تھی۔

زونراج مصنف زینہ ترنگنی نے کوثر ناگ میں بڈ شاہی سیر کے ایک دن کی کیفیت لکھی ہے۔ وہ خود بھی اس سیر میں شامل تھا وہ لکھتا ہے۔ برہمہ، وشنو اور مہادیو کی پہاڑیوں سے پانی زور سے نکل رہا تھا۔ بادشاہ بج بہاڑہ (۹) سے کوثر ناک کی طرف بڑھا اور تین دن ''درمرگ'' تک پہنچا۔

اس سفر میں بادشاہ کے ہمراہ چھ ہانجیوں کے علاوہ شہزادہ حاجی خاں اور شہزادہ بہرام خاں اور میرے علاوہ سمہ بٹ بھی موجود تھا۔ جب ہم پہاڑ کے اوپر پہنچے تو ہم نے سارے پہاڑ کو کستوری کے پھولوں سے لہلہاتے دیکھا اور جہاں تک نظر جاتی تھی اس پہاڑ کر گلریز پایا۔ بادشاہ کشتی میں سوار ہوا۔ ہم سب اس کے ہمراہ تھے۔ ہم نے بادشاہ کو کشتی ہی میں گووند گیت سنا کر محظوظ کیا۔ ہمارے گانے کی آواز جھیل کے اس سنسان اور خاموش عالم میں گونج رہی تھی۔ ہم نے اس جھیل میں تین دفعہ چکر لگائے اور خوب لطف اٹھایا۔ آخر ہم نے کشتی کو نوبندن پہاڑی کے ساتھ لگا دیا اور بادشاہ نے کشتی سے اتر کر پہاڑی کی اس چھوٹی سی جھیل سے جو سکمار کے نام سے مشہور تھی۔ پانی پیا۔ ہم سب تھوڑی دیر تک جھیل کے کنارے بیٹھے رہے۔ پھر برفباری شروع ہوگئی اور جس راستہ ہم آئے تھے۔ اسی راستہ واپس چلے گئے۔

صاحب تاریخ حسن بھی بادشاہ کی سیر کوثر ناگ (۱۰) کا ذکر کرتے ہوئے

ہرمکھ گنگا میں بادشاہ کی دریائی سیر

کوہ ہرمکھ کے دامن میں بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر قریب ۱/۲ میل لمبا اور دوسو پچاس گز چوڑا چشمہ ہے۔ کشمیر کے ہندو اسے ہردوار کے برابر مقدس خیال کرتے ہیں۔ ہر سال ماہ اگست میں یہاں میلہ ہوتا ہے۔ جس میں بھی ہزاروں ہندو جمع ہوتے ہیں۔ دریائے گنگا کی طرح اس میں بھی مردوں کی سوختہ ہڈیاں یعنی پھول ڈالے جاتے ہیں۔ گرمیوں کے ایک دو مہینوں کے سوا یہاں بھی کوثر ناگ کی طرح ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔

اس وسیع و عریض چشمہ کو گنگا بل بھی کہتے ہیں۔ بادشاہی کشتیاں یہاں بھی موجود رہتی تھیں۔ جب کبھی بادشاہ آتا اور ہر تابستان میں ضرور آتا تو وہ اس آسمانی تالاب میں جو قلہ کوہ پر قدرت نے پیدا کر رکھا تھا، کشتیاں ڈالتا۔ اس کے قدیم مصاحب اس کے ہمراہ ہوتے۔ اور وہ سب دریائی تفریحات سے اپنے دلوں کو بہلاتے۔

ڈل اور وُلر کی سیر

ڈل میں سونہ لنک اور وُلر میں زینہ لنک اس کی یادگاریں اب تک کسی نہ کسی صورت میں موجود چلی آتی ہے۔ جب وہ دریا اور دریا سے ڈل اور وُلر کی طرف نکل

جاتا۔ تو اپنے لنکوں میں اقامت گزین ہوتا اور وہاں مختصر سے مصاحبوں کا جو اس کے ہمراہ ہوتے۔ ایک چھوٹا سا دربار منعقد کرتا۔ کبھی امور ملکی پر تبادلہ خیالات کرتا، کبھی مذہبی نکات کی موشگافیوں میں اپنا وقت صرف کرتا اور کبھی سیر وتفریح میں اپنا دل بہلاتا۔

حواشی:

۱) اس زمانہ میں دم دار ستارہ ہیلی صاحب کے نام سے موسوم ہے۔ اسی نے سب سے پہلے اس کو نحوست کے آثار بتایا تھا۔ ۱۴۵۶ء میں ہنری ششم بادشاہ انگلستان کے زمانے میں اس کی تحقیقات ماہران علم نجوم نے کی۔

۲) معلوم ہوتا ہے کہ کسی مکان پر اُلو کے بیٹھنے کی بدشگوفی عرصہ دراز سے چلی آتی ہے اور آج بھی جس مکان پر اُلو بیٹھتا ہے سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس مکان والے پر ضرور کوئی آفت آئیگی۔

۳) زینہ ترنگی مصنفہ زونراج کا رر جمہ از جے سی دت کلکتہ ۱۸۹۸ء صفحہ ۹۔ یہ الفاظ بہت سخت ہیں۔ شریوران سے بہتر الفاظ میں بھی اپنا مطلب ادا کر سکتا تھا۔

۴) جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں اپنے زمانہ کے بازیگروں کے تماشہ کا ذکر کیا ہے۔

۵) باخود آورد۔ اس لئے لکھا ہے کہ مصنف تاریخ اعظمی کے خیال میں بڈشاہ ان سب کو سمرقند سے کشمیر لایا تھا۔ حالانکہ واقعات سے ثابت ہے کہ وہ سمرقند گیا ہی نہیں۔ دایہ عورتوں کا انتظام کشمیر ہی میں ہوا۔

۶) صالحہ ماجی بیگم سلطان محمد شاہ نے خانقاہ معلیٰ کی مرمت و تعمیر کے اختتام پر معماروں نجاروں کو پنج ہزار کلہ پوش (ٹوپیاں) پٹو کے علاوہ بارہ سوزینہ جامہ بھی انعام میں دیئے تھے۔ تاریخ اعظمی صفحہ ۶۷۔

۷) اس کا قدیم نام شور پور ہے۔ راجہ اونتی ورمن کے وزیر شور نے اسے نانویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا۔ اکبر کے زمانے میں اس کا انام ہور پور یا ہیرہ اپور تھا۔ اب بھی یہی نام ہے۔

۸) راج ترنگی شریور ترنگ ۱۰ اشلوک ۴۰۸ بحوالہ اردو ترجمہ راج ترنگی کلہن۔

۹) طبقات اکبری مطبوعہ و وجیز التواریخ غیر مطبوعہ۔

۱۰) اس قسم کے پرندہ پر اب بھی مہاراجہ سرہری سنگھ بہادر کی سالگرہ کا جلوس نکلتا ہے۔ پرندہ کا رنگ عموماً زرد ہوتا ہے اور ہانجیوں (ملاحوں) کی وردی بھی زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ شاہی پرندہ کے تیس چالیس ہانجی پرندہ کو واقعی پرندہ بنا کر آب رواں کی چادر پر اڑائے لئے جاتے ہیں۔

۱۱) معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں کوثر ناگ تک جانے کے لئے نج بہاڑہ سے "درمرگ" کی طرف جاتے تھے۔ اب رستہ شوپیان سے جاتا ہے اور اس زمانہ کی نسبت بہت آسان ہے۔

۱۲) مصنف تاریخ حسن نے کوثر ناگ کے ایک ہولناک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جو اس کا چشم دید ہے اور چونکہ یہ واقعہ بھی اپنی نوعیت میں عجیب قسم کا ہے۔ اس لئے درج کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ میں ایک مرتبہ چند احباب کے ہمراہ اس چشمہ پر گیا۔ ایک ہمراہی نے اس میں نہانا شروع کیا۔ تھوڑا سا تیرنے کے بعد وہ باہر آنے لگا۔ ابھی وہ پانی کے اندر ہی تھا کہ اس نے شور مچانا شروع کیا۔ ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر کشاں کشاں اس کو ساحل پر لائے۔ دیکھا کہ ایک جانور نے جو دو گز لمبا اور سر کی جانب سے اٹھ گرہ چوڑا ہے۔ اس کے دونوں پاؤں کو منہ میں ڈالا ہوا ہے۔ ہم نے اپنے ساتھی کو اس خونخوار سے چھڑانے کے لئے سنگ و چوب و تبر (کلہاڑی) سے کچھ کام لیا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہمارا رفیق زانو تک اس کے منہ میں چلا گیا۔ جب ہم نے کوئی تدبیر اس سے چھٹکارے کی نہ پائی تو اس کے سر پر لکڑیاں رکھ کر ان کو جلانا شروع کر دیا۔ جب آگ زیادہ بھڑکی تو بندوق و توپ کی سی آواز نکلی اور ساتھ ہی وہ جانور ہمارے رفیق کو لئے ہوئے ہوا میں اچھلا اور دریا میں جا پڑا۔ "آں اجل رسیدہ طعمہ خود نمود"۔ مصنف مذکور لکھتے ہیں۔ اس جانور کا پوست دانہ دار تھا اور اس پر چوب و تبر کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس چشمہ کا پانی اپنے منبع سے نکل کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ جنوبی حصہ کا پانی دریائے چندر بھاگا (چناب) میں اور دوسرے حصہ کا پانی کشمیر کی طرف آ جاتا ہے۔ اس چشمہ کی گہرائی بحساب اوسط دو سو گز عمیق بتائی جاتی ہے۔

خاتمہ کتاب اور ضمیمہ

راقم نے تاریخ ہذا کے ''پیش لفظ'' میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ آج کی تحقیق کل کی ترقی اور زمانہ آیندہ کے علمی و تاریخی انکشافات کے معیار پر پوری نہیں اُتر سکتی۔ چنانچہ تاریخ ہذا میں کئی قصبوں اور گاؤں کے نام ایسے آ گئے ہیں۔ جن کے موجودہ ناموں یا محل وقوع کا علم نہیں ہو سکا۔ بعض اشخاص کے نام بھی ایسے آئے ہیں۔ جن کی کچھ وضاحت نہیں ہو سکی۔ اگر مزید مطالعہ سے ان امور کے متعلق کچھ علم ہو سکا یا کسی صاحب نے ان کے متعلق کچھ واقفیت بہم پہنچائی اور زندگی نے بھی اس وقت تک وفا کی تو اس تاریخ کا دوسرا ایڈیشن انشاءاللہ اس سے زیادہ مکمل ہوگا۔ تاہم ضمیمہ کے طور پر بعض حالات و واقعات کا جو تشریح طلب تھے ا۔ واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ تنقید اور نکتہ چینی اگر نیک نیتی سے ہو تو اس سے کوئی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ حاسدانہ، متعصّبانہ اور محض شہرت طلبی کی غرض سے ہو تو معترض کو اپنی غیر محمود نمائش کے سوا اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

محمد الدین فوقؔ

ضمیمہ ۱

سنہ لوکک اور کشمیری سنہ

لوکک سمت کو سپت ریشی سمت بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس کی ابتدا کشمیر سے ہوئی ہے، اس لئے اس کو کشمیری سمت بھی کہا جاتا ہے۔ گو پونچھ اور کشتواڑ آج بھی کشمیر کے ماتحت ہیں۔ لیکن چمبہ اور کانگڑہ کے بعض علاقے بھی کسی زمانہ میں کشمیر ہی کے زیر اقتدار تھے۔ اس لئے اس سمت کا رواج کشمیر کے علاوہ ان علاقوں میں بھی تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں کے بعض برہمنوں میں آج بھی یہ سمت رائج ہے۔

جب سنہ ۷۲۰ھ میں یہاں مسلمان حکمران ہوئے تو انہوں نے لوکک سمت کی بجائے ایک اور کشمیری سنہ ایجاد کیا۔ جس کا ذکر آگے آئیگا۔

لوکک سنہ کی ابتداء اس کے بانیوں اور موجدوں نے چیت شدی اکیم ۲۵ کلجگ سے رکھی ہے۔ یا یہ بالفاظ دیگر یہ سمت ۳۰۷۶ سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ کشمیر کے تمام سنسکرت مورخوں اور مصنفوں نے اپنی تصنیفات میں اسی سمت کو رواج دیا ہے۔ پنڈت کلہن نے جس سال اپنی مشہور تاریخ راج ترنگنی تصنیف کی۔ اس سال لوکک سمت ۴۲۲۵ تھا اور عیسوی سنہ اس کے مطابق سنہ ۱۱۵۰ء تھا۔ اب ان ایام میں جبکہ یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔ لوکک سمت ۵۰۱۸ ہے اور اس کے مطابق عیسوی سنہ سنہ ۱۹۴۱ء و سنہ ۱۹۴۲ء ہے۔

پنڈت کلہن کے تاریخی سلسلہ کو قائم رکھنے کے لئے جونراج مورخ نے بعہد

بڈشاہ بادشاہ کشمیر ۴۵۳۵ لوکک مطابق ۱۴۵۹ء میں دوسری راج ترنگنی لکھی۔ جس کا نام اس نے راجاولی یا زینہ ترنگنی رکھا۔ اسی طرح جونراج کے بعد اس کے شاگرد پنڈت شریور نے جونراج کے سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے ۴۵۶۲ لوکک مطابق ۱۴۸۶ء میں تیسری راج ترنگنی بنام زینہ راج ترنگنی قلمبند کی۔ اپنی تاریخوں میں جونراج اور شریور نے کشمیری مسلمان بادشاہوں کے جو سالہائے تخت نشینی لوکک سمت کے مطابق درج کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک ذیل درج کئے جاتے ہیں:

نام بادشاہ	مطابق لوکک سمت	مطابق سنہ ہجری	مطابق عیسوی
رتنچن شاہ عرف ملک صدرالدین	۴۳۹۶	۷۲۰	۱۳۲۰
شمس الدین شاہمیری	۴۴۱۵	۷۴۰	۱۳۳۹
سلطان شہاب الدین	۴۴۳۰	۷۵۵	۱۳۵۴
سلطان سکندر شاہ	۴۴۶۵	۷۹۱	۱۳۸۹
علی شاہ	۴۴۸۹	۸۱۶	۱۴۱۳
بڈشاہ	۴۴۹۶	۸۲۳	۱۴۲۰
حیدر شاہ	۴۵۴۶	۸۷۴	۱۴۷۰
حسن شاہ	۴۵۴۸	۸۷۶	۱۴۷۲
محمد شاہ باراول	۴۵۶۰	۸۸۹	۱۴۸۴

لوکک سنین کے ساتھ جو ہجری اور عیسوی سنین لکھے گئے ہیں۔ وہ راقم السطور نے لوکک سنین کی مطابقت کا حساب لگا کر خود درج کئے ہیں اور ان کی تصدیق ذیل کی سطور سے ہوسکتی ہے۔

طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں علی شاہ بادشاہ کشمیر کی گرفتاری کا سال جمادی الاول ۸۲۳ھ درج ہے اور اسی سال اس کا بھائی بڈشاہ تخت نشین ہوتا ہے۔ ۸۲۳ھ کے مطابق لوکک سال ۴۴۹۶ ہے۔ جونراج اور شریور نے بھی ۴۴۹۶ لوکک ہی کو بڈشاہ کی تخت نشینی کا سال لکھا ہے۔ کشمیر کے مابعد مورخوں نے بڈشاہ کی حکومت کا سال اول جو ۸۲۶ھ لکھا ہے وہ غلط ہے۔

بڈشاہ کے فرزند سلطان حیدر شاہ کا ایک سکہّ جو عجائب گھر سرینگر (۱) میں موجود ہے۔ ۸۷۴ھ کا ہے۔ اس سکہّ کے ایک طرف سلطان الاعظم حیدر شاہ اور دوسری طرف ضرب کشمیر فی شہور سنہ سعین ساتھ ہی ۸۷۴ھ کے اعداد درج ہیں۔ فارسی مورخوں نے بڈشاہ کا سال وفات ۸۷۹ھ لکھا ہے جو اس سکہّ کے رو سے قطعاً غلط ہے۔ اگر فارسی مورخین کے قول کے مطابق بڈشاہ کا سال وفات ۸۷۹ھ صحیح سمجھا جائے۔ تو اس کے فرزند کا سکہّ اس کی موت سے پانچ سال قبل ہی کس طرح کشمیر میں رائج ہوسکتا ہے۔ لوکک سنہ ۴۵۴۶ کی مطابقت ہجری سنہ ۸۷۴ کے ساتھ ہوتی ہے اور شریور نے یہی لوکک سنہ حیدر شاہ کی تخت نشینی کا لکھا ہے۔

مزار کلاں یعنی احاطہ قبرستان شیخ بہاؤالدین گنج بخش میں ایک پختہ قبر سعید خاں کی ہے۔ اس پر کچھ عبارت سنسکرت اور فارسی میں درج ہے۔ قبر کے کتبہ پر فارسی عبارت میں لکھا ہے۔ "بہ سال ہشت صد و ہفتاد و نو شہادت یافت" یعنی ۸۷۹ھ سعید خاں کا سال شہادت درج ہے۔ سنسکرت عبارت میں صرف ۶۰ لوکک اور بعہد محمد شاہ کے الفاظ درج ہیں۔ ساٹھ

لوکک سے مراد ۴۵۶۰ لوکک ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۸۸۹ھ میں محمد شاہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ مسلمان مورخوں نے محمد شاہ کا سال تخت نشینی جو ۸۹۳ھ لکھا ہے وہ غلط ہے۔

''بہارستان شاہی (۲)'' میں سلطان سکندر کی وفات ۸۱۶ھ درج ہے اور اس سنہ کے مطابق لوکک سنہ ۴۴۹۶ ہوتا ہے اور یہ لوکک ۸۱۶ھ کے مطابق ہے۔ غرض جونراج اور شریور نے جو لوکک سال درج کئے ہیں۔ وہ صحیح ہیں اور ان لوکک سالوں کے مطابق جو ہجری سنین قاعدہ کے رو سے نکلتے ہوں۔ وہ درست سمجھنے چاہیں۔

سلطان شمس الدین شہمیری بانی سلطنت شہمیر یہ (۱۳۲۹ء) نے کشمیر کا لوکک سنہ جو تین ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے کشمیر میں رائج تھا۔ ترک کر کے اس کی بجائے کشمیری سمت کے نام سے ایک نیا سنہ جاری کیا۔ جس کی ابتداء اس نے ۱۳۲۰ء سے رکھی جبکہ تبتی شہزادہ رینچن شاہ نے اسلام قبول کر کے کشمیر میں اسلامی حکومت کی بنا رکھی تھی۔

شاہ میر نے سال کے دنوں کا شمارہ ۳۶۵ کی بجائے قمری سال کے مطابق ۳۵۴ دنوں پر رکھا۔ مہینوں کے نام ہندی اور کشمیری دونوں زبانوں میں رکھے گئے۔ چونکہ قمری اور شمسی سال میں گیارہ دن کا فرق رہتا تھا۔ اس لیے مہینوں کو موسم کے مطابق رکھنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ ہر تیسرے سال میں ایک مہینہ زائد رکھا جانے لگا۔ جس سے کشمیری سال کا توازن تین سال کے بعد شمسی سال کے برابر ہو جاتا تھا۔

قمری مہینوں کے نام ہندوستان میں عرب سے آئے ہیں۔ نہایت قدیم

زمانہ جاہلیت میں وہاں مہینوں کے نام یہ تھے۔ سولمتر۔ ناجر۔ خوان۔ صوان۔ زبا۔ باید۔ اصم۔ واغل۔ ماطل۔ عادل۔ اہل عرب کے ہاں سال بارہ مہینوں اور ۳۵۴ دنوں کا ہوتا تھا۔ یعنی قمری اور شمسی سال کے درمیان گیارہ دن کا فرق تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی کوئی مہینہ جاڑوں میں آجاتا تھا کبھی گرمیوں میں۔ جب بعد کو ہر تیسرے سال لوند کا ایک مہینہ بڑھایا جانے لگا تو اس وقت گرمی سردی زمانہ بارش اور اوقات کاشت وغیرہ کے لحاظ سے مہینوں کے جدید نام رکھے گئے۔ جو حسب ذیل ہیں۔ محرم۔ صفر۔ ربیع الاول۔ ربیع الآخر۔ جمادی الاول۔ جمادی الآخر۔ رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔ ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ۔ ہر مہینہ کے نام کی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ بھی ہے۔

معلوم ہوتا ہے شمس الدین شہمیری یا تو خود قمری مہینوں کو موسموں کے مطابق کرنے کی ضرورت سے آگاہ تھا یا اس کے پاس کوئی ایسا واقفکار آدمی موجود تھا جو مہینوں کے متعلق اہل عرب کے رواج سے واقف تھا۔ اس لئے اہل عرب نے جو طریقہ مہینوں کو موسموں کے مطابق بنانے کے لئے اختیار کیا اور جس طریق سے انہوں نے گیارہ یوم کا فرق ہر تیسرے سال کے بعد نکالا۔ وہی طریق شمس الدین نے بھی کشمیر میں اختیار کیا۔

اب کشمیر میں کشمیری سنہ یا سمت کا رواج تو نہیں ہے۔ البتہ کشمیری مہینوں کا رواج دیہات میں بعض زمینداروں کی بول چال میں پایا جاتا ہے۔ کشمیری سمت سنہ ۱۳۲۰ء سے اگر اب تک جاری رہتا۔ تو آج (۱۹۴۱ء سنہ ۱۹۴۲ء) میں اس کو ۶۲۲ سال کا عرصہ گزر جاتا۔

کشمیری مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں جوں جوں فارسی کا زیادہ رواج

ہوتا گیا۔ کشمیری سمت کے ساتھ ہی سنہ ہجری بھی چلتا رہا۔ کشمیری سمت چک بادشاہوں کے زمانہ تک جاری رہا۔ ان ایام میں جو کتابیں مسلمان کشمیری مصنف لکھتے تھے۔ ان پر سال تصنیف کشمیری سمت کے ساتھ بلعموم ہجری سنہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن پنڈت مصنفوں نے کشمیری سمت کا بہت کم استعمال کیا ہے۔ انہوں نے یا تو لوکک سمت استعمال کیا ہے یا ہندی بکرمی اور ہجری۔

کشمیری سنہ شہمیری بادشاہوں کے زمانہ میں قبروں کے تعویذوں اور مختلف کتبوں پر بھی درج ہوتا تھا۔ جیسا کہ مندر شنکراچاریہ المشہور تخت سلیمان کی مرمت کا سال ''پچاہ و چہارم'' درج ہے۔ چونکہ پنجاہ و چہارم کے ساتھ ۱۵۴ یا ۱۰۵۴ یا اور کوئی ہندسہ درج نہیں ہے۔ اس لئے بعض اس کو لوکک کہتے ہیں۔ بعض کشمیری اور بعض ہجری۔ مصنف تاریخ حسن نے تو صاف لکھ دیا ہے۔ ''کہ سلطان زین العابدین در ۸۷۴ھ چہار ستِ سنگین وقایہ سقف آں استوار نمود''۔ پھر آگے لکھا ہے۔ ''چنانچہ بر یک ستون دو سطر منقوش است سطر اول۔ این ستون برداشت خواجہ اکم بن مرجان سال پنجاہ و چہار کشمیری۔

سطر دوم۔ معمار ایں ستون را۔ دوامی بہشتی زرگر پنجاہ و چہار۔

بڈشاہی عہد کے مصنف اور بعد کے قریب العہد مورخ اس بارہ میں بالکل خاموش ہیں۔ اس لئے اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ کیا در حقیقت بڈشاہ کے عہد میں مندر شنکراچاریہ کی مرمت ہوئی تھی۔

۸۷۴ھ بڈشاہ کا سال وفات ہے۔ اسی سال بقول تاریخ حسن مندر کے چہار ستون سنگین معہ سقف استوار ہوتے ہیں اور پھر ستون کی عبارت میں سطر اول

سے پنجاہ و چہار کشمیری اور دوسری سطر سے صرف پنجاہ و چہار کے الفاظ ظاہر ہوتے ہیں
۔اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کشمیری سمت جب ۸۶۰ھ شروع ہوتا ہے۔ تو ۸۷۴ھ میں
جب یہ ستون معہ سقف تیار ہو جاتے ہیں، کس منزل پر تھا۔ ۸۷۴ سے ۷۲۰ وضع
کرنے پر باقی ہمیں ۱۵۴ حاصل ہوتے ہیں۔اب مندر کے ستون پر ۵۴ درج ہے اور
یہاں ۱۵۴ نکلتے ہیں۔ اس کا حل اس طرح ہو سکتا ہے کہ نہ صرف اہل کشمیر بلکہ ہر ملک
کے لوگ بالعموم سنہ اور تاریخ لکھنے کے وقت احاد لکھتے ہیں۔

چنانچہ آج سمت بکرمی ۱۵۹۹ء ہے لیکن عموماً تحریروں میں صرف ۹۹ ہی لکھا
جاتا ہے۔اسی طرح عیسوی سنہ ۱۹۴۲ ہے مگر تحریروں میں صرف ۴۲ ہی لکھ دیتے ہیں۔
اسی طرح اُس زمانہ میں بھی احاد لکھنے کا دستور تھا اور ۱۵۴ کی بجائے ۵۴ ہی لکھ
دیا کرتے تھے۔ گویا پنجاہ و چہار سال سے مراد صرف ۵۴ نہیں بلکہ ۱۵۴ ہے۔ جو نہ
لوکک ہے نہ ہجری نہ بکرمی بلکہ کشمیری سمت ہے۔

۸۷۴ھ مطابق کشمیری سمت ۱۵۴ میں بڈشاہ انتقال کر جاتا ہے اور یہی سال
شنکر اچاریہ کے مندر کی مرمت کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرمت ۸۷۳ھ یا
اوائل ۸۷۴ھ میں شروع ہو چکی تھی اور چونکہ وہ مرمت کچھ بہت زیادہ نہ تھی۔ اس لئے
اس سال اس کی موت سے پیشتر ہی ختم ہو چکی تھی۔

اسی طرح مزار سلاطین میں ایک پختہ قبر دروازہ کے قریب ہی ہے۔ صاحب
قبر کا نام اڑ گیا ہے۔ صرف یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔ "بہ سال شصت و شش از
حساب کشمیری کہ ہشتم صدی ذی الحجہ المبارک بہ ہجری۔ یہاں ہشتم صدی ہجری کے
ساتھ سمت کشمیری ۶۶ بھی درج ہے۔ یہ زمانہ سلطان قطب الدین شہمیری کا تھا۔

کشمیری مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ وہیک ۔ جیٹھ ۔ ہار۔ شراوَن ۔ بادرت ۔ آشت کارتک۔ منجہور۔ پوہ۔ ماگ۔ پھاگن۔ چیتر۔ کشمیری سال کا پہلا دن یعنی کشمیریوں کا نوروز ماہِ وہیک کی یکم کو مقرر کیا گیا۔ جو پھاگن سمت بکرمی تین تاریخ کو ہوتا ہے۔

حواشی:

۱) عجائب گھر میں گزشتہ ہندو اور مسلمان والیان کشمیر کے جو سکے موجود ہیں ان کے فوٹو زکتاب "ہینڈ بک آف آرکیولوجکل اینڈ نیوبس میٹک" میں طبع ہو چکے ہیں ۔اس سکہ کا فوٹو ۱۵۴ صفحہ پراوراس سکہ کی کیفیت کتاب ہذا کے ۱۵۹ صفحہ پر درج ہے۔

۲) یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ ایک واقف کار دوست نے اس کا ذکر کیا تھا۔

ضمیمہ ۲

اُڈبانڈپوریاہند

جائے وقوع

سٹائن صاحب (۱) نے کلہن کی راج ترنگنی کے ترجمہ میں، جرنیل کننگھم نے اپنے جغرافیہ قدیم کشمیر میں، ایلیٹ صاحب نے اپنی ہسٹری آف انڈیا میں اور کئی دوسرے محقق یورپین اصحاب نے اپنے مختلف مضامین میں اُڈبانڈپور کے متعلق جو کیفیت لکھی ہے۔ اس کا مختصر ساذکر یہاں مناسب سمجھا جاتا ہے۔ (۲)

سٹائن صاحب نے ایک جرمن رسالہ میں اُڈبانڈپور کو جہاں شاہی خاندان کے راجاؤں کی حکومت تھی۔ گندھارا یعنی قدیم قندھار کی سلطنت سے تعبیر کیا ہے۔ اس مقام کو البیرونی نے (بزمانہ محمود غزنوی) دی ہند لکھا ہے اور اس وقت یہی موضع اُند! ہند دریائے سندھ کے دائیں کنارے اٹک سے اوپر کوئی پندرہ میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے۔ جو کسی زمانہ میں قندھار کا دارالحکومت تھا۔

زونراج نے زینہ ترنگنی کے شلوک ۳۷۲ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلطان شہاب الدین ''بادشاہ کشمیر'' نے جب اس کا محاصرہ کیا تو اس زمانہ میں گووند خاں والی اُڈبانڈپور، سندھوپ (سندھ) اور گندھارا (قندھار) کا فرمانروا تھا۔

ڈی سینٹ مارٹن نام ایک یورپین مصنف نے اپنی کتاب بنام

میمائدانیاٹک (مطبوعہ ۱۸۵۸ء) میں وی ہند کے متعلق لکھا ہے۔ یہ وہی موضع ہے جس کو آجکل اُند۔ ہند۔ او ہند۔ اُہند کہتے ہیں۔ محمود غزنوی سے بھی چارسو سال پیشتر چینی سیاح ہیونگ سانگ نے گندھارا کی سلطنت میں ایک عظیم الشان اور دولتمند شہر کا ذکر کرتے ہوئے اسکا نام اُو۔تو۔کیا۔ہن۔ چہ لکھا ہے۔ ڈی سینٹ مارٹن کے خیال میں یہ وہی شہر ہے جس کا نام البیرونی وی ہند لکھتا ہے۔ اس لئے کہ دونوں نے اس کا محل وقوع ایک ہی مقام کو بتایا ہے۔

سٹائن صاحب ۱۸۹۱ء میں خود س موقع پر گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس موضع میں مجھے ایک کتبہ نہایت تباہ حالت میں ملا۔ جو ایک خستہ حال مسجد کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کی سطور نا قابل مطالعہ تھیں۔ میں نے اس کو لاہور کے عجائب گھر میں بھجوادیا۔

الیگزینڈر را اپنی کتاب کابل میں لکھتے ہیں۔ میں ''وی ہند'' سے شاردہ حروف میں کندہ کی ہوئی سنسکرت کتبوں والی سنگ مرمر کی سلوں کو لے آیا اور کلکتہ میں میں نے ان کو امپیریل میوزیم میں رکھوادیا۔

جرنل کننگھم نے اُڈ بانڈ کے بگڑے ہوئے ناموں اوند، اُوہند اور ہند پر کافی بحث کی ہے۔ چینی سیاح ہیونگ سانگ کے تلفظ۔ اُو۔ تو۔ کیا۔ ہن۔ چہ کو مٹا نلے جولیٹن صاحب نے اُت کھانڈ اور بعض نے اس کا تلفظ اوک ہانڈ لکھا ہے اور اوک ہانڈی کو وی ہند کا ماخذ بتایا جاتا ہے۔ مگر کلہن اور زونراج نے اس کو اُو بھانڈ پور لکھا ہے۔ سنسکرت میں او بھانڈ کے معنی پانی کی ٹھلیا کے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ جس کو ۱۹۲۸ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ اس

میں کئی جگہ دی ہند کا ذکر آتا ہے۔ صفحہ ۷۶ پر بیت المقدس کے ایک مسلمان عالم بشاری مقدسی کے حالات میں لکھا ہے کہ ۳۷۵ء کے گردوپیش سیاحت ہند کے بعد وہ اپنا سفرنامہ ترتیب دیتا ہے اور لکھتا ہے۔ وی ہند۔ منصورہ (۳) سے بڑا شہر ہے۔ نہایت پاک وصاف، نہایت اچھے پھل، بڑے بڑے درخت، ارزاں نرخ، شہد ایک درہم (۴) کا نین من روٹی اور ارزانی کا حال مت پوچھو۔ اخروٹ اور بادام کے درخت بکثرت ہیں۔

پھر ۳۵۵ صفحہ پر بشاری مقدسی کے حوالہ سے لکھا ہے۔ ''ہندوستان اور درہ خیبر پار کے ملکوں کے درمیان ہمیشہ سے صلح وجنگ کے متواتر تعلقات قائم تھے۔ اسلام سے پہلے ان ملکوں کی کیفیت یہ تھی کہ جب کبھی کابل کے بادشاہ کو قوت حاصل ہوئی۔ اس نے پشاور اور وی ہند تک قبضہ کرلیا اور جب رائے لوہارو (راجہ لاہور) کو موقع ملا۔ اس نے کابل وقندھار تک اپنی سرحد قائم کرلی۔ یہی حال سندھ کی طرف تھا''۔

پھر اسی کتاب کے ۳۹۶ و ۳۹۷ صفحوں پر وی ہند کا ذکر اور بھی تفصیل سے ہے۔ لکھا ہے۔ ''یہ ہندوستان کا مشہور پرانا شہر ہے۔ غزنوی فتوحات کے سلسلہ میں اس کا بھی نام آتا ہے ۳۹۳ء پشاور کے بعد محمود نے اس پر قبضہ کیا۔ اس شہر میں محمود سے پہلے ہی مسلمانوں کی کچھ آبادی موجود تھی۔ بیرونی نے اپنی کتاب قانون مسعودی میں اس کے ذکر میں لکھا ہے۔ کہ ''یہ گندھار کا پایہ تخت ہے اور یہ وادئے سندھ میں واقع ہے۔ وسنٹ اے سمتھ صاحب ''دی ارلی ہسٹری آف انڈیا'' میں اوہدن نام شہر کو دریائے سندھ پر جگہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ۲۵۶ھ میں مسلمانوں کے کابل فتح

کر لینے کے بعد وہاں کا دارالسلطنت اوہند کو منتقل ہوگیا۔ جو دریائے سندھ پر واقع تھا اور ہندوشاہیہ خاندن کا پایہ تخت تھا۔ بشاری مقدسی نے پھر ایک جگہ اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یوہند پایہ تخت کا نام ہے اور اس کے ماتحت شہر ودہان، بیتر، نوج توار اور سان کوج وغیرہ ہیں۔

راقم السطور خود بھی ۱۹۳۶ء میں زیدہ میں چند دنوں کے لئے مقیم تھا۔ اس مقام سے اُندیا ہند صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ زیدہ اور ہند کے درمیان ایک قدیم نالہ بہتا ہے جس کو بھدری کہتے ہیں۔ ہند پشتو زبان کا لفظ ہے۔ وی انداور ہند بھی اسی کا نام ہے اور فی الواقع یہ وہی مقام ہے جس جگہ یہاں کے شاہیہ خاندان نے شکست کھا کر محمود غزنوی کے لئے پنجاب کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ہند کے معمر لوگ بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ آج سے سوانوسو سال قبل محمود غزنوی اسی رستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔

ہند میں قریباً بارہ سونفوس آباد ہیں۔ تمام آبادی ایک فصیل کے اندر ہے۔ یہ گاؤں ایک قلعہ کی صورت میں ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں اور یہاں کے باشندے انہی دروازوں کے ذریعہ آمد و رفت رکھتے ہیں۔ اکثر انگریز محققین موسم گرما میں اس مقام پر آتے اور قلعہ ہند کے کھنڈر دیکھتے رہتے ہیں۔ ہند سے دریائے اٹک قریباً ڈیڑھ دوسو گز کے فاصلے پر شمال کی طرف بہتا ہے اور دریا اور قلعہ ہند کے درمیان پرانے زمانے کی انیٹوں کا پختہ فرش اب تک اپنی بری بھلی حالت میں موجود ہے۔ جہانگیرہ ریلوے سے سٹیشن سے جو دریائے اٹک کے کنارے آباد ہے۔ ہند پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔

لاہور کے عجائب گھر میں اس کمرے کے سرے پر جہاں پشاور اور صوبہ سرحد سے دستیاب شدہ بدھ کی مورتیاں موجود ہیں اور جو گندھارا گیلری کے نام سے موسوم ہے۔ ایک نقشہ دیوار پر آویزاں ہے۔ اس میں قندھار کی قدیم سلطنت کے دریا پہاڑ اور شہروں اور قصبوں کے نام واضح حروف میں لکھے گئے ہیں۔ اس زمانہ میں گندہار سلطنت مانکیا (راولپنڈی) سے افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نقشہ میں ایک مقام اُند (und) کے نام سے درج ہے۔ جس کے ساتھ اس کا قدیم نام (udbhand) بھی لکھا ہوا ہے۔

محققین و مورخین کی اس تحقیقات اور ہند کے لوگوں کی سینہ بسینہ روایات سے صاف ظاہر ہے کہ سکندر بادشاہ کشمیر نے جس اودبھانڈ کو فتح کیا تھا اور جس اودبھانڈ کے بادشاہ نے اس کو اپنی لڑکی پیش کی تھی وہ یہی اُند ہے۔ جس کو آج کل پشتونی زبان میں افغان لوگ ہند کہتے ہیں۔

مختلف محققین و مورخین کے بیانات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زیدہ صوبہ سرحد کے متصل تین میل کے فاصلہ پر ہند کے نام سے دریائے اٹک کے کنارے جو موضع آباد ہے۔ اسی کا نام محمود غزنوی اور اس سے قبل کے زمانہ میں اُوبانڈ تھا۔

اُڈبانڈ یعنی ہند کا ترکی شاہی خاندان

عیسوی صدی کے ظہور سے کچھ عرصہ پیشتر برہانگین نام ایک ترک نے افغانستان کی طرف اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ برہانگین اور اس کی تمام ذریات

مذہباً بت پرست اور افغانستان کے علاقہ کے لوگ بدھ مت کے پیرو تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ حکمران قوم بھی بدھ مذہب ہی میں جذب ہوگئی۔ جب کنشک کا زمانہ (۱۲۵ء سے ۱۵۰ء) آیا جس کا دارالحکومت پشاور تھا تو افغانستان کے علاوہ ترکستان اور ماورالنہر بھی اس کی حکومت میں داخل ہوچکے تھے۔ چونکہ ایران ان کے ساتھ ملتا تھا اور شاہان ایران کا لقب شاہ تھا۔ اس لئے یہ بھی شاہ ہی کہلائے۔ بقول مصنف سلطان محمود غزنوی البیرونی لکھتا ہے کہ برہانگین کے ترکی شاہی خاندان میں ساٹھ سے کم بادشاہ نہیں ہوئے۔ اس خاندان کا اخیر تاجدار لگا ترمان تھا۔ سٹائن صاحب ترک خاندان کی تصدیق میں اوکنگ نام ایک سیاح کا بیان لکھتے ہیں۔ جس نے ۷۵۳ء سے ۷۶۴ء کے درمیان گاندھارا کی سیاحت کے دوران میں وہاں ترک خاندان کو حکمران دیکھا ہے۔

اُڈبانڈ یعنی ہند کا ہندو شاہی خاندان

لگا ترمان کے وزیر کا نام کلور تھا۔ راجہ کی بزدلی اور غفلت کی بدولت اس نے اس قدر طاقت حاصل کرلی تھی کہ راجہ اس کے سامنے عضوِ معطل بنا رہتا تھا۔ آخر کلور نے راجہ کو معزول کر کے حکومت خود سنبھال لی اور ہندو شاہیہ خاندان کی بنیاد رکھی۔ جب سبکتگین نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے تو پنجاب میں اسی ہندو شاہیہ خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کا جو شجرہ البیرونی نے لکھا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔ سب سے پہلے کلور پھر اس کا فرزند سند پھر کملو پھر بھیم پھر جے پال پھر انند پال پھر ترلوچن یا ترلوکن پال پھر بھیم پال۔ ''قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب'' کے نام سے رائے

بہادر مہامہو پادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے ایک کتاب بزبان ہندی لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۳۱ء میں طبع کیا ہے۔ اس میں مصنف نے قرون وسطی کا زمانہ ۶۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیان قرار دیا ہے۔ ترجمہ میں صفحہ ۲۰۸ پر ہندوستان کے مختلف راجاؤں کے سکوں کے تذکرہ میں اُدبانڈ پور (وی ہندیا ہند) کے راجاؤں کے سونے چاندی کے سکوں کا ذکر بھی آتا ہے۔

البیرونی لکھتا ہے۔ ہندو خاندان شاہیہ کا جو راجہ سب سے پہلے اُدبانڈ پور میں گزرا ہے، اس کا نام کلور تھا۔

اُدبانڈ پور کا تعلق کشمیر کے ساتھ

اُدبانڈ پور کے شاہیہ خاندان کا تعلق کشمیر کے ساتھ کسی نہ کسی رنگ میں ہمیشہ رہا ہے۔ راجہ للتا دتیہ (۷۰۰ء تا ۷۳۲ء) کے زمانہ میں سابقہ اٹھارہ اعلیٰ عہدوں کے علاوہ پانچ اعلیٰ عہدے ایسے بھی قائم کئے گئے تھے۔ جن پر کشمیر کے راجکماروں کے علاوہ اُدبانڈ پور کے شاہیہ خاندان کے راجکمار بھی مامور ہوا کرتے تھے۔

راجہ گوپال ورمن فرزند رانی سوگندا (۹۰۲ء تا ۹۰۴ء) کے وزیر پربھاکر دیو نے اُدبانڈ پور کی شاہیہ سلطنت کو ازسرنو مغلوب کیا۔ اس نے یہ حکومت پرانے راجہ سے چھین کر اسی خاندان کے نئے راجہ للئہ کے بیٹے تورمان کو دیدی اور اس کا نام کملک رکھا۔

اُڈبانڈپوراورپونچھ وکشمیر

۹۵۰ سے ۹۵۸ء کے درمیان اُدبانڈپور کے راجہ کا نام بھیم شاہ تھا۔ جو کملک یا کملو یا کملوک کا جانشین تھا۔ راجہ بھیم شاہ نے اپنی لڑکی کی شادی راجہ سنگراج یا سنگرام راج والئی لوہر (لوہرین پونچھ) کے ساتھ کردی تھی۔ کشمیر کی مشہور رانی دوا جس نے راجہ کشیم گپت والئے کشمیر کو اپنے حسن کی وجہ سے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ بھیم شاہ کی نواسی اور سنگراج کی بیٹی تھی۔ کلہن نے اس موقع پر بھیم کو اُدبانڈ کا شاہی فرمانروا تسلیم کیا ہے۔ اس رانی نے اپنے نانا بھیم شاہ کے نام پر ایک مندر بھیم کیشو جنوبی کشمیر میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ اس ٹیلہ پر واقع تھا جہاں دریائے لدر کے کنارے اب عیش مقام کے نام سے ایک موضع آباد ہے۔ جو بابا بام الدین کی زیارت کی وجہ سے مشہور ہے۔ عیش مقام کشمیر کی مشہور صحت گاہ ہے۔ جو پہلگام کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کو آتی ہے۔

راجہ ابھے منیو والئی کشمیر (۹۵۸ء تا ۹۷۲ء) کے زمانہ میں اُدبانڈپور کے شاہی خاندان پر مصیبتیں نازل ہونا شروع ہوتی ہیں اور راجہ کے کمانڈر انچیف کی سازشوں سے اس خاندان کی طاقت بہت کمزور ہو جاتی ہے۔

محمود غزنوی اور ہندوشاہیہ خاندان

لیکن اس خاندان کی مکمل تباہی ۱۰۰۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب محمود غزنوی ہندوستان کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں ترلوچن پال اُدبانڈپور کا فرمانروا تھا۔ جب اس کو اس طوفان وسیلاب کی جو افغانستان سے اٹھا۔ خبر ملی تو اس کا

ملک چونکہ رستہ میں ہی اٹھا تھا۔ اس لئے اس نے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ ترلوچن پال نے راجہ کشمیر کو اس آندھی کی خبر دی اور لکھا کہ اگر میں تباہ کردیا گیا تو آپ کی باری بھی میرے بعد آئیگی۔ اس لئے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے آپ کو اور ہندوستان کو اور ہندو دھرم کو بچانے کے لئے اس وقت جتنی امداد آپ دے سکتے ہیں۔ اس سے دریغ نہ کریں۔

کلہن لکھتا ہے اس زمانہ میں راجہ سنگرام راج (۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۸ء) حکمران تھا۔ اس نے اپنے سب سے اعلےٰ افسر تنگ اور اس کے بیٹے کو ترلوچن پال کی اعانت کا حکم دیا اور اس کے ہمراہ ایک بہت بڑی فوج جس میں کئی راجکمار، کئی امیر، مشیر اور باجگزار والیان ملک شامل تھے بھیجی۔ ترلوچن پال نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ لیکن تنگ نخوت و تکبر سے دشمن کی حرکات کی کوئی پروانہ کرتا تھا۔ ترلوچن پال نے پانچ چھ یوم کے بعد جب دیکھا کہ یہ لوگ رات کے پہرہ، جاسوسوں کی تعیناتی، فوجی قواعد اور حملہ کی دیگر تیاریوں سے غافل رہتے ہیں۔ تو اس نے تنگ آکر تنگ سے کہا جب تک آپ ترشک (مسلمانی) طریق جنگ سے واقف نہ ہوجائیں۔ بہتر ہے آپ اس پہاڑ کی چوٹی پر حسب خواہش آرام کرتے رہیں۔ لیکن ان طعن آمیز الفاظ کا بھی تنگ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ادبانڈ کے شاہیہ خاندان کی تباہی

ترلوچن پال کے حملے اور اس کی ذاتی شجاعت کی کلہن نے بہت تعریف کی ہے۔ پنجاب کے بچاؤ کے لئے ترلوچن پال کا یہ آخری مقابلہ تھا۔ لیکن وہ ناکام رہا

۔محمود نے فتح پائی۔ تنگ بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ البیرونی لکھتا ہے ترلوچن پال شاہی خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔ بقول البیرونی ترلوچن پال ۴۱۲ھ مطابق ۲۲-۱۰۲۱ء میں مرگیا۔ اس کا بیٹا بھیم پال اس کے بعد صرف پانچ سال زندہ رہا۔ لیکن حکمران کی حیثیت سے کسی مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ باپ کی موت کے بعد وہ راجہ اجمیر کے پاس چلا گیا اور ۱۰۲۶ء میں راہئے ملک عدم ہوگیا اور اپنی موت کے ساتھ ہی ہندو خاندان شاہیہ کا بھی خاتمہ کر گیا۔

البیرونی نے شاہی خاندان کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ہندوشاہی خاندان اب نیست و نابود ہو چکا ہے اور ساری نسل میں سے ان کا ذرا سا نشان بھی بچا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تباہی و بربادی کے بعد اس خاندان کے کچھ لوگ کشمیر بھی چلے گئے۔ چنانچہ کلش (۱۰۲۳ء لغایت ۱۰۸۹ء) کے زمانہ میں اس نامور خاندان کے ایک رکن کا نام راج ترنگنی میں نظر آتا ہے۔ جہاں لکھا ہے کہ خاندان شاہیہ کے ایک رکن مل نے جسے راجہ کلش نے عارضی طور پر دوارپتی کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ملحقہ والیان ملک سے اور اُرشہ (ہزارہ و پھکلی) کے راجہ سے بھی جنگ کی تھی۔

دوارپتی کا عہدہ اس زمانہ میں کشمیر کے دروں کے محافظوں کے اعلیٰ افسر کے لئے ہوتا تھا اور وزیر اعظم، کمانڈر انچیف اور چیف جسٹس کے عہدوں سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر ہم یہ نظریہ قائم کریں کہ ہندوشاہی خاندان کا پہلا راجہ کلور ۸۰۰ء میں گزرا ہے۔ تو اس کی نسل اپنی تباہی کے آخری ایام (قریباً سوا دو سو سال) تک اُدبانڈ پور میں جو آج ہند کے نام سے ایک معمولی سا گاؤں ہے۔ حکمران رہی ہے۔

ادبانڈ (ہند) کے مسلمان خوائین

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُدبانڈ ہر چند سلطنت گندھارا کے دارالحکومت کے نام سے مشہور تھا۔ تاہم بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اُدبانڈ کو شاہیہ خاندان کے بعض حکمرانوں کی کمزوریوں نے قندھارا سے بالکل علیحدہ کر رکھا تھا اور قندھارا اور اس کے نواحات اس خاندان کے قبضہ سے نکل چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ عظیم الشان سلطنت جو قندھارا اور سارے افغانستان پر چھائی ہوئی تھی اور راولپنڈی اور مانکیالہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ کشمیر کے راجہ سے اعانت کی خواستگار نہ ہوتی۔ افغانستان کی حدود میں اس کے جو ناظم اور نائب تھے۔ وہ بھی محمود کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے نظر آتے۔

ہندو حکمرانوں ہند کا آفتاب اقبال محمود کی آمد کے ساتھ ہی غروب ہو گیا۔ بلکہ محمود کی زندگی ہی میں اس خاندان کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ بچے کچے لوگ کشمیر اور دیگر ممالک میں چلے گئے۔

زونراج عہد بڈشاہی کا مورخ وشاعر زینہ ترنگنی میں سلطان شہاب الدین بادشاہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس بادشاہ نے گود خاندان والئی اوبھانڈ کو مغلوب کر رکھا تھا۔ گووند خاں کا نام گو آدھا تیتر آدھا بیٹر ہے تاہم اس سے اسلامی نام کا ایک جزو ظاہر ہو رہا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ گووند بھی کسی ایسے ہی سرحدی بے معنی اسلامی یا پشتونی نام کا بگڑا ہوا تلفظ ہو۔ بہرحال اس کی اصلیت ہنوز روشنی میں نہیں آسکی۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کے پے درپے حملوں نے ہندو شاہیہ خاندان کو جس کی حکومت غزنی سے پنجاب کو جاتے ہوئے رستہ میں آتی تھی۔ پہلے کمزور اور ۱۰۲۱ء میں بالکل ملیامیٹ کر دیا اور اس کا نام ونشان باقی نہ رکھا۔ تو

معاً ہمیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب بعض مصنفین لکھتے ہیں کہ اس موقعہ پر اکثر لوگ اپنی جان بچانے کے لئے مسلمان ہو گئے تھے یا مسلمان کر لئے گئے تھے۔ جن میں کشمیری فوج اور کشمیری شاگرد پیشہ لوگوں کی جو اس جنگ میں ترلوچن کی مدد کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کثیر تعداد بھی ظاہر کی گئی ہے۔ تو کیا ہند کے مقامی لوگ بہ جبر یا بہ مصلحت یا برضا دائرہ اسلام میں شامل نہ ہوئے ہونگے۔

بلکہ افغانستان کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے زمانہ افغانستان کے تمام قبائل اور سرحدی مقامات کے تمام خیل کافرستان کے وسیع ملک کے تین بہت بڑے قبیلوں سمیت مسلمان ہو چکے تھے۔ اس لئے اُد بانڈ یعنی ہند کی بہت سی رعایا محمود کے زمانہ ہی میں مسلمان ہو چکی تھی اور محمود کے ہمراہی مسلمان افغان قبائل میں سے بھی کئی قبیلوں نے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور بقول بشاری مقدسی اواخر چہارم صدی ہجری میں یہاں مسلمانوں کی ایک ریاست بھی ہندو حکومت سے الگ واقع تھی۔

زونراج نے اود بانڈ کے اس فرمانروا کا نام نہیں لکھا جس نے کشمیر کے بادشاہ سکندر کو اپنی بیٹی دی تھی۔ لیکن واقعات ذیل سے اس کا مسلمان ہونا یقینی پایا جاتا ہے۔

(۱) یہ کہ محمود کے زمانہ میں ہند کا ہندو حکمران خاندان ملیا میٹ ہو چکا تھا اور رعایا مسلمان ہو چکی تھی اور وہاں کا جو حاکم تھا۔ لامحالہ وہ بھی مسلمان ہی تھا۔

(۲) زونراج کی تحریر کے مطابق سلطان شہاب الدین کے عہد میں ہدن کے بادشاہ کا نام گووند خاں تھا۔ یہ زمانہ ۷۵۸ھ سے ۷۸۰ھ کے درمیان ہے۔ یہ بادشاہ جس کا نام گووند خاں ہے سلطان سکندر بُت شکن سے قریباً چالیس سال پہلے گزرا ہے۔ چونکہ

حکمرانان اُودبانڈ کے زوال کے بعد یہاں کے کسی ہندو حکمران کا نام کسی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس لئے گووند خان نام کو عجیب وغریب نام ہے۔ لیکن بہر حال یہ کسی مسلمان ہی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ نیز زونراج نے اُدبانڈ کے حکمران کی بیٹی کا نام میرا لکھا ہے۔ یہ نام آج بھی کشمیر کی مسلمان عورتوں میں رائج ہے اور گو ہندوؤں میں بھی راجپوتانہ کی ایک مشہور شاعرہ میراں بائی کے نام سے گزری ہے۔ لیکن شمالی ہند میں اس قسم کے نام ہندوؤں میں کبھی نہیں پائے گئے۔

زونراج نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان سکندر بُت شکن کے زمانہ میں جووالئے اُودبانڈ تھا۔ اس کا نام فیروز تھا۔ اس نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُودبانڈ اور ہند کے فرمانروایا رئیس سلاطین کشمیر کے زمانہ میں مسلمان (۶) ہی تھے اور مسلمان بادشاہ ہی نے اپنی لڑکی کی شادی سلطان سکندر سے کی تھی۔ جس کے بطن سے کشمیر کا نامور بادشاہ سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ پیدا ہوا تھا۔

حواشی:

۱) یہ نامور محقق اور آثار قدیم کا مشہور ماہر قریباً اسی نوے سال کی عمر میں بماہ نومبر ۱۹۴۳ء بمقام کابل انتقال کر گیا۔ ہر سال کشمیر آتا تھا اور سونمرگ میں بیٹھ کر تحریری کام کیا کرتا تھا۔

۲) دیکھو ضمیمہ ہائے نوٹ راج ترنگی صفحہ ۶۵ تا ۶۹۔ اردو ترجمہ۔

۳) محمد بن قاسم (۳۹۶) کے حملہ کے بعد منصورہ اور ملتان صرف دو اسلامی ملک ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ اس کا پرانا ہندو زمانہ کا نام بہمانیہ تھا۔ ایرانیوں نے برہمن آباد رکھا۔ مسلمانوں

نے جب اس کو فتح کیا تو بطور تفاول اس کا نام منصورہ (فتح کیا گیا) رکھا۔

(۴) ایک درہم کی قیمت انداز اً ۳۰ ربتائی گئی ہے۔

(۵) علماء الدین خلجی (۶۹۷ھ مطابق ۱۲۹۷ء) بادشاہ ہند کے زمانہ میں ایک من ۱۳۔۱۴ سیر کا ہوتا تھا اور بشاری مقدسی کے زمانہ (۳۷۵ھ) میں اس سے کم، اس کے برابر یا اس سے کم یا زیادہ ہوگا۔

(۶) ہند اور زیدہ کے خوانین کا جو ایک ہی خاندان سے ہیں۔ بیان ہے کہ ہمارے آباء واجداد محمود غزنوی کے حملہ ہند کے دوران ہی میں اس کے ساتھ آئے تھے اور ہمارا سیاسی اقتدار بھی اسی زمانہ سے چلا آتا ہے۔ لیکن جب تک ہم شہاب الدین کے زمانہ کے گووند خان اور سلطان بت شکن کے عہد کے فیروز کو ہند کے موجودہ خاندان سے کوئی علیحدہ خاندان سمجھتے رہیں گے۔ ہمارے لئے یہ باور کرنا کہ اس خاندان کا اقتدار غزنوی عہد ہی سے چلا آتا ہے۔ بہت مشکل ہے۔ تاہم اس امر کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہے کہ یہ خاندان عرصہ دراز سے اس علاقہ میں صاحب اقتدار چلا آتا ہے اور اگر غزنویوں اور غوریوں کے عہد میں نہیں تو مغل بادشاہوں کے عہد میں ہند اور زیدہ کے خوانین ضرور اس علاقہ کے با اقتدار رئیس ہوگئے تھے۔ چنانچہ رانا ڈھیری نام کا موضع جو عہد قدیم میں ایک آباد و بارونق مقام تھا۔ ان ہی خوانین کے جدا علےٰ رانا خیل کا آباد کیا ہوا ہے۔ آج کل یہ چھوٹا سا موضع جن کی آبادی صرف ستّر اسی گھروں کی ہے۔ خان آف زیدہ کی ملکیت میں ہے۔ زیدہ اور ہند کے خوانین کے جد علےٰ رانا خیل کو تین چار سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ پھر مغلیہ خاندان کے زوال کے بعد ہند کے خوانین میں شہداد خان اور اس کے باپ کا نام بہت مشہور ہے۔ شہداد خان سکھوں کے زمانہ میں ہند کا واقعی ایک نامور اور با اقتدار خان تھا۔

رانا خیل کی ذریات میں زیدہ کا خان ارسلا خان تھا۔ جو اپنے علاقہ کا ایک مشہور اور زبردست اور با اختیار خان تھا۔ افغانستان کی تاریخ حیات افغان میں ان دونوں خانوں کے مختصر سے حال میں درج ہے کہ یہ دونوں خان ایک دوسرے کے زبردست حریف ہیں اور ان میں باہم سخت عداوت ہے۔

۱۸۶۲ء میں ارسلا خان کا بیٹا ابراہیم خان زیدہ کا خان تھا۔ اس کے بعد خان بہادر عبدالغفور خان زیدہ کے مشہور خان گزرے ہیں جو پنجاب کے مختلف اضلاع میں سشن جج رہ چکے تھے اور ریٹائر ہونے کے بعد صوبہ سرحد کی کونسل کے پریزیڈنٹ ہوگئے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں آپ وفات پا گئے۔ راقم کو زیدہ ہی میں جہاں ان دنوں راقم کا فرزند ظہیرالحق سب پوسٹ ماسٹر تھا۔ نیاز حاصل ہوا تھا۔ اب ان کے صاحبزادہ کلاں خان عبدالحمید خان زیدہ کے خان اور رئیس اعظم ہیں اور ان سے بھی راقم کو نیاز حاصل ہے۔

ضمیمہ ۳

مدردیش

مدردیش اورمہابھارت

مدردیش کا نام سب سے پہلے مہابھارت کے پرب اول (۱) میں آتا ہے۔ جہاں بھیشم (بھیکم) بدر کے ساتھ پانڈو اور دھرت راشٹ کے ناطہ بیاہ کا مشورہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جادوان کے خاندان میں ایک لڑکی ہے۔ جو ہمارے خاندان کے مناسب حال ہے اور راجہ شیل کی لڑکی گاندہاری کی بھی میں نے تعریف سنی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ مدردیش کا راجہ بھی ایک دختر رکھتا ہے۔ یہ دونوں بھی ہمارے خاندان کے لائق ہیں۔

پھراسی پرب (۲) میں راجہ پانڈو کی شادی جب راجہ کنت بھوج کی لڑکی رانی کنتی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ تو بھیشم اپنی اولاد اور اولاد در اولاد کو بکثرت دیکھنے کے لئے پانڈو کی دوسری شادی کی خاطر بڑا بھاری لشکر اور جاہ وحشم لے کر مدردیش کو روانہ ہوتا ہے۔ راجہ مدر جس کا نام شل (۳) تھا۔ شاہانہ استقبال کرکے اس کو اپنے شہر میں لاتا ہے اور تشریف آوری اور تکلیف فرمائی کا سبب دریافت کرتا ہے۔ بھیشم اس کے استفار کے جواب میں اس کی بہن مدری کی تعریف کرتا ہے پھر پانڈو کی لیاقت وشائستگی وشائستگی اس پر ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ان دونوں کی قرابت صورت پذیر ہوجائے۔ تو مناسب ہے۔ راجہ شیل اس خویشی وقرابت پر اپنی مسرت کا اظہار کرتا

ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد راجہ شیل رتھوں پر سامان جہیز لاد کر اور فیلان کوہ پیکر ہمراہ دیکر اپنی بہن رانی مدری کو بھیشم کے ہمراہ ہستناپور روانہ کر دیتا ہے۔ جہاں پانڈو کے ساتھ اس کی شادی ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مدردیش کا نام مہابھارت کے گیارہویں پرب بہ نام استری پرب میں آتا ہے۔ جہاں پانڈو کے بیٹوں اور پوتوں کا ذکر ہے۔ پانڈو کے پانچ بیٹے تھے۔ تین رانی کنتی کے بطن سے جن کے نام یہ ہیں۔

یدہشتر۔ بھیم۔ ارجن۔ دوسری رانی مدری راجہ شل کی بہن کے بطن سے سہدیو اور نکل تھے۔ جو دونوں توام پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان پانچواں بھائیوں میں ارجن کے سوا کسی اور بھائی کی اولاد حکمران نہیں ہو سکی۔

مدردیش کے شاہی خاندان میں صرف پانڈو ہی کی شادی نہیں ہوئی بلکہ اس کے فرزندوں میں سے یدہشتر اور سہدیو کی شادیوں بھی مدردیش ہی میں ہوئی تھیں۔ جس کا ثبوت مہابھارت کے گیارھویں پرب کے الفاظ ذیل سے ملتا ہے۔ جدہشتر کی ایک رانی کا نام دروپدی تھا۔ جس سے بھرت پیدا ہوا۔ دوسری رانی مدردیش کے شاہی خاندان سے تھی۔ جو اپنے ملک کے نام پر مدری کہلاتی تھی۔ اس سے یودہا پیدا ہوا۔ سہدیو کی ایک بیوی تو پہلے ہی تھی۔ دوسری راجہ مدردیش کی لڑکی لوہونز نام تھی۔ ان تین مقامات پر مدردیش کے لئے مدردیش ہی کا لفظ درج ہے۔

بعض اور مقامات پر مہابھارت میں اس لفظ کو کسی جگہ مدسنور (۴) کسی جگہ مندر (۵) اور کہیں مندا اور (۶) بھی لکھا گیا ہے۔

مدر دیش اور راج ترنگنی

مہابھارت (۷) کے بعد جس کی تصنیف کو پانچ ہزار سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ مدر دیش کا نام پنڈت کلہن کی راج ترنگنی میں اس موقعہ پر آتا ہے۔ جہاں راجہ بھکشا چر راجہ جے سنگھ والئے کشمیر (۸) کے خوف سے کشمیر سے فرار ہو جاتا ہے۔ یہاں چند ملکوں کے ساتھ مدر دیش کا نام اس کی فیاضیوں (۹) کی شہرت کی وجہ سے بطور ضرب المثل لکھا گیا ہے۔

مدر دیش اور زینہ ترنگنی (۱۰)

راجہ جے سنگھ کے مورخ پنڈت کلہن کے بعد بڈشاہی زمانے کا مورخ جونراج اپنی کتاب راجہ ولی عرف زینہ ترنگنی میں کم سے کم سات جگہ مدر دیش کا ذکر کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اس مقام پر لکھتا ہے۔ جب علی شاہ والئی کشمیر حج کو جانا چاہتا ہے اور راجہ مدر دیش اس کو اس ارادے سے باز رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

مدر دیش کے مغرور راجہ نے اس خیال اور طعن کے خوف سے کہ اس کا داماد (یعنی علی شاہ) سلطنت چھوڑ کر حج کو جا رہا ہے اور اس کی بیٹی کو ہمیشہ کے لئے اس سے جدا کر رہا ہے۔ بادشاہ کو سلطنت ترک کرنے اور حج سے مشرف ہونے کے ارادہ سے باز رکھا اور کچھ وقفہ کے بعد وہ علی شاہ کو اپنے ہمراہ کشمیر لایا۔ (۱۱)

پھر مدر دیش کا ذکر اس موقعہ پر آتا ہے۔ جب علی شاہ اور اس کے بھائی شاہی خاں عرف زین العابدین میں کشمیر کے تاج وتخت کے لئے باقاعدہ جنگ شروع

ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر مدردیش کا راجہ علی شاہ (۱۲) کی مدد کو آتا ہے اور اس کو پیغام بھیجتا ہے کہ جب تک ہم تمہاری مدد کو نہ آئیں۔ تم پہاڑ پر ہی مقیم ہو۔

پھر مدردیش کا نام اس جگہ آتا ہے جب زونراج سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کی اولاد کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اس کے چار فرزند تھے اور وہ چاروں راجہ مدر (۱۳) کی دو بیٹیوں کے بطن سے تھے۔

زونراج پھر ایک جگہ لکھتا ہے۔ ایک دفعہ گکھڑوں کے سردار نے مالدیو راجہ مدر (۱۴) کو شکست دینے کے بعد گرفتار کرلیا۔ جب بادشاہ کو خبر ہوئی تو اس نے گکھڑوں کی قید سے راجہ کو رہا کرادیا۔

مدردیش اور زینہ راج ترنگنی (۱۵)

اس تاریخ میں تین جگہ مختلف مقامات پر مدردیش کا ذکر آتا ہے۔ اس کا مصنف سلطان حیدر شاہ ابن سلطان بڈشاہ کے عہد حکومت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔

''اس دوران میں راجہ مانک دیو والئے مدردیش (۱۶) کے زیر کمان اس کی ایک بہادر فوج ترشکوں کے ساتھ لڑائی کرتی ہوئی تباہ ہوگئی''۔

دوسری جگہ سلطان حسن شاہ کی حکومت کا ذکر کرتا ہوا شریور پنڈت زینہ راج ترنگنی میں لکھتا ہے۔ جب تاتارخان (۱۷) نے راجپوری (راجوری) اور والئی مدر راجہ اجے دیو کو بہت تنگ کیا۔ تو ان راجوں نے سلطان حسن شاہ والئے کشمیر سے اعانت طلب کی۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے تازی بٹ بہترین سامان جنگ سے مسلح فوج لے کر گیا اور جب ان ممالک کے لوگوں نے شاہی جھنڈے کو دیکھا۔ تو انہوں نے اپنی

مسرت کا اظہار کیا۔ اور تازی بٹ نے سیالکوٹ اور دوسرے مقامات کو جو تاتارخان (حاکم لاہور) کے ماتحت تھے۔ تباہ کر کے ملک میں ہلچل مچادی۔

تیسری جگہ سلطان محمد شاہ والئے کشمیر کے سلسلہ میں شریور پنڈت مدر (۱۸) کے راجہ پرشرام کا اور اس کی مدری فوج کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ تاتارخاں کے خوف سے کشمیر میں چلے آئے تھے اور سادات کشمیر سے جو اس زمانے میں بڑے عروج پر تھے۔ ان کے دوستانہ تعلقات سے خوفزدہ ہو کر ملک میں یہ افواہ پھیلادی کہ تاتارخاں نے سادات کے نام ایک خط لکھا ہے کہ مدر والوں کو اپنی دوستی کی آڑ میں فوراً گرفتار کرلو۔ یہ قصہ طویل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سادات اور راجہ پرشرام کی فوج میں باقاعدہ جنگ ہوتی ہے۔ سید حسن، غازی امین اور یاسیم لالہ اور کئی نامور سادات جن کی تعداد راج ترنگنی میں تیس نفر درج ہے مارے جاتے ہیں۔

مہابھارت کے زمانہ میں مدردیش کا محل وقوع

راجہ شل کا نام والئے مندرور (مدر) کی حیثیت سے مہابھارت کے پانچویں پرب بنام اودم پرب میں پانڈوں کی جلاوطنی اور بن باسی زندگی ختم کرنے کے بعد اس موقعہ پر آتا ہے جب دریودھن کے ساتھ ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ راجہ شل جو راجہ پانڈو کا خسر پورہ اور اس کے دو فرزندوں کا حقیقی ماموں تھا۔ اپنے ملک سے بے شمار لشکر لے کر جس کا پھیلاؤ مہابھارت میں دوکوس تک بتایا گیا ہے۔ ان کی مدد کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ لیکن جونہی دریودھن کو راجہ شل کے آنے کی اطلاع ملتی ہے۔ وہ اس کے

ساتھ وعدے وعید کر کے اپنے ملک میں آنے کی دعوت دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ میرا ملک آپ کے سر راہ ہے۔ یہ مرّوت سے بعید ہے کہ آپ بالا بالا ہی چلے جائیں۔ شل دریودھن کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور دریودھن باتوں ہی باتوں میں اس کو ایسا شیشہ میں اتارتا ہے کہ وہ اپنے بہنوئی راجہ پانڈو اور اپنے بھانجوں سہدیو اور نکل کی امداد کی بجائے ان کے دشمن دریودھن کی امداد پر آمادہ ہو جاتا ہے اور آخر اسی خونریز جنگ میں اپنے بھائی اور چند بیٹوں سمیت کام آ جاتا ہے۔

اودم پرب کے اس مختصر سے اقتباس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدردیش کا راجہ اس زمانہ میں شل ہی تھا اور اس کے ملک کی حدود دریودھن کے ملک سے ملحق تھیں۔ یوں سمجھ لینا شاید زیادہ آسان ہوگا کہ راوی سے اور بقول جنرل کننگھم بیاس سے پار ہو کر دہلی اور دہلی سے پرے تک دریودھن چھایا ہوا تھا اور راوی سے شمال کی طرف سیالکوٹ کوہستان جموں اور جہلم بلکہ اس سے آگے تک شل کی حکومت تھی۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ اوتر مدرا کہلاتا تھا اور سیالکوٹ سے لاہور تک کے علاقہ کو دکن مدرا کہتے تھے۔

مہامہارت کے آٹھویں پرب بنام کرن پرب میں پھر راجہ شل کا ذکر آتا ہے اور بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ بلکہ اسی پرب میں لکھا ہے کہ شاکل یا شالکوٹ یا شل نگری۔ آپ کا ندی (۱۹) کے کنارے واقعہ ہے اور مہا بھارت کے مترجموں نے اپکا ندی ہی کو اَیک ندی بتایا ہے۔ جو سیالکوٹ کی مشہور ندی ہے اور جموں کے پہاڑوں سے نکل کر سیالکوٹ کے ضلع کو شاداب کرتی ہوئی اسی علاقہ میں گم ہو جاتی ہے۔

مہا بھارت کے اس پرب میں راجہ شل کا ذکر والئے مدر کی حیثیت سے اس

موقعہ پر آتا ہے۔ جب دریودھن راجہ شل کو راجہ کرن کا رتھ بان بننے کا حکم دیتا ہے اور وہ پس وپیش کے بعد بہت سی شرائط کے ساتھ آخر اس کا رتھ بان بننا قبول کر لیتا ہے۔ اسی موقعہ پر کرن اور شل میں تلخ وتُند گفتگو بھی ہو جاتی ہے اور کرن جوش میں آ کر شل کو اس کے ملک کی بے غیرتی اور بے شرمی کا طعن دیتا ہوا کہتا ہے کہ تمہارے ملک کی عورتیں جو کھلے منہ پھرا کرتی ہیں۔ تمام عیوب کی مجموعہ ہے۔ (۲۰)

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ مہابھارت میں جس ملک کو مدر اور جس راجہ کو شل لکھا گیا ہے۔ اس کا تعلق پنجاب سے باہر کسی اور ملک سے نہ تھا۔ بلکہ مدر وہی ملک ہے جو پنجاب کی شمالی اور کوہستانی حدود تک پھیلا ہوا تھا اور شل وہی راجہ تھا جو اس ملک کا حکمران تھا۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی ایک سرکاری کتاب میں مدر دیش کے جائے وقوع کے متعلق جو یہ الفاظ درج ہیں کہ مدر (۲۱) بھوٹان کے قدیم علاقہ کا نام ہے۔ جو غالباً بھوٹان کے جنوب میں واقعہ ہوگا۔ وہ قطعاً غلط ہیں۔

مسلمان مورخ اور مدر دیش

کشمیر کے قدیم سنسکرت مورخوں نے جن میں سب سے آخر شریور مصنف زینہ راج ترنگی گزرا ہے۔ اس علاقہ کو جو راوی یا بیاس سے جہلم اور سیالکوٹ بلکہ اس سے آگے شمالی کوہستانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مدر دیش ہی لکھا ہے۔ لیکن کسی مسلمان مورخ نے وہ محمود کے زمانہ میں تھے یا ان کے بعد عہد مغلیہ میں۔ اپنی کسی تاریخ میں مدر دیش کا لفظ تک بھی نہیں لکھا۔ حالانکہ ان مورخوں میں بعض کشمیر کے قدیم مورخوں

سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ جیسے البیرونی وغیرہ اور بعض مسلمان مورخ کشمیر کے ان سنسکرت نویسوں کے ہم عہد وہمعصر تھے۔ جیسے مصنف ظفر نامہ تیموری، مصنف تاریخ فیروز شاہی (ضیا برنی) وغیرہ اکبر کے زمانہ میں طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ لکھی گئی ہیں۔ ان میں بھی مدردیش کا لفظ کہیں موجود نہیں ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اگر خاص کشمیر کے قدیم پنڈت مورخ مدردیش کا لفظ ہی لکھا کرتے تھے۔ لیکن ہندوستانی مورخوں کے زمانہ میں یہ لفظ قطعاً متروک ہو چکا تھا۔ بلکہ عہد اسلامیہ میں کشمیر کے ہندو مورخ بھی کسی جگہ مدردیش کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔

مدردیش کا موجودہ محل وقوع

جنرل کننگھم کشمیر کے جغرافیہ قدیم میں ایک جگہ مدردیش کے متعلق لکھتے ہیں۔ یہ وسط پنجاب کا پرانا نام معلوم ہوتا ہے۔ جو دریائے بیاس اور چناب اور جہلم کے درمیان واقعہ تھا۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوہستان جموں کا وہ حصہ بھی جو چناب سے ملحق ہے۔ مدریش میں شامل تھا۔

راجہ شل کا دارالحکومت چونکہ شاکل یا شیالکوٹ ہی سب مورخوں نے بیان (۲۲) کیا ہے۔ اس لئے سیالکوٹ کی جس قدر تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ ان سب میں سیالکوٹ کے علاقہ ہی کو مدردیش بتایا گیا ہے۔ حالانکہ مدردیش سیالکوٹ کے موجودہ علاقہ سے بہت زیادہ وسیع تھا اور سیالکوٹ کے محدود علاقہ کا فرمانروا راجہ شل اس قدر عظیم الشان لشکر نہیں رکھ سکتا تھا جو جنگ کورو پانڈو کے ایام میں دوکوس تک کے وسیع میدان میں بمشکل سما سکتا۔

مصنف گلاب نامہ (۲۳) نے مدر دیش (پنجاب) سے جب راجہ باہولوچن والئے جموں کی لڑائی ہوئی تو باہولوچن کے قتل کے بعد اس کے بھائی جامبولوچن نے جو شہر جموں کا بانی تھا۔ راجہ چندر ہاس سے جنگ کی اور اس کو قتل کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا اور پنجاب اور اطراف واکناف کے کئی علاقے اپنے قبضے میں لے آیا۔

اس واقعہ سے کئی صدیوں بعد راجگان سیالکوٹ اور راجگان جموں میں لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ کبھی سیالکوٹ والئے جموں کا کچھ علاقہ لے لیتے تھے اور کبھی جموں والے سیالکوٹ کے کسی حصے پر قابض ہو جاتے تھے۔

مدر دیش کا علاقہ راجہ شل کے زمانہ میں یقیناً سارے پنجاب پر حاوی ہوگا لیکن مہابھارت سے اس کی صحیح وسعت مملکت کا اندازہ نہیں ہوسکتا ہے۔ البتہ پنڈت زونراج کی زینہ ترنگی اور شریور کی زینہ راج ترنگی سے اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ ان کے عہد میں جسکو آج قریباً ساڑھے پانچ سو سال گزر چکے ہیں صرف کوہستان جموں کا نام مدر دیش تھا۔ چنانچہ راجہ مالدیو اور راجہ مانک دیو اور راجہ عجب دیو یا اجے دیو جن کا وہ والیان قدر کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔ جموں ہی کے راجہ تھے۔

راجہ مالدیو کے متعلق زینہ ترنگی میں لکھا ہے کہ اس راجہ کے ساتھ بڈشاہ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔

راجہ مالدیو کا سال وفات ۱۴۵۶ء ہے۔ آج ۱۹۹۶ء ہے۔ اس حساب سے اس واقعہ کو ۵۴۰ سال گزر چکے ہیں بڈشاہ ۸۲۶ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور ۸۷۹ھ میں انتقال کر جاتا ہے۔ اس زمانہ کو بھی آج ۵۳۳ سال ہو چکے ہیں۔ گویا جس مالدیو کو زونراج نے راجہ مدر لکھا ہے۔ اسی مالدیو کو مصنف تاریخ گلاب نامہ اور

مصنف تاریخ راجپوتان پنجاب راجہ جموں لکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہی راجہ مالدیو ہے جو بڈشاہ کے زمانہ میں جموں کا حکمران تھا۔ جس کو سنسکرت مصنفوں نے راجہ مدر اور فارسی و اردو کے مصنفوں نے راجہ جموں لکھا ہے۔

پھر اس کے بعد سلطان حیدر شاہ کے زمانہ میں شریور پنڈت راجہ مانک دیو کو اور بہ زمانہ سلطان حسن شاہ راجہ اجے دیو یا عجیب دیو کو مدر دیش کا راجہ لکھتا ہے۔ راجہ عجب دیو ہمیر دیو عرف بھیم (۲۴) کا فرزند تھا اور بھیم دیو راجہ پال دیو کا بیٹا تھا۔ راجہ بھیم دیو کا ذکر طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں بھی ہے۔ یہ راجہ سید مبارک شاہ والئے دہلی ۸۲۴ھ لغایت ۸۳۷ھ کے عہد میں زندہ تھا اور جنگ کے دوران میں جسرت گکھڑ کے ہاتھ سے قتل ہو گیا تھا۔

راجہ جے دیو یا عجب دیو وہی راجہ ہے۔ جس نے تاتارخاں لودی حاکم لاہور کے خوف سے سلطان حسن شاہ والئے کشمیر سے مدد طلب کی تھی اور اس نے اپنے سپہ سالار تازی بٹ کو اس کی اعانت کے لئے روانہ کیا تھا۔

مندرجہ صدر تمام واقعات جن کا تعلق مہابھارت کے زمانہ سے ہے اس بات کی زندہ شہادت ہیں کہ سنسکرت زبان کے مورخین کشمیر نے جس مدر دیش کا ذکر کیا ہے۔ وہ شمالی پنجاب اور کوہستان جموں ہی کا علاقہ ہے اور جس جموں کا ذکر اردو فارسی کے مورخوں نے علی شاہ اور بڈشاہ کے زمانہ میں کیا ہے۔ وہ مدر (۲۵) ہی کے علاقہ میں ہے۔

حواشی:

۱) ترجمہ مہابھارت مطبع آفتاب پنجاب لاہور مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۹۰۔

۲) " " " "

۳) راجہ مدر راجہ شل اوران کی راجکماریوں کا واقعہ مزید تفصیل طلب ہے۔

۴) ترجمہ مہابھارت فارسی سے اردو میں پرب دوم صفحہ ۳۸۔

۵) " " " "،،دوم پرب صفحہ (۳) بھیکم پرب صفحہ ۳۵۔

۶) " " " "،،بھیکم پرب صفحہ ۲۷۔

۷) یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت نظم میں لکھی گئی۔ پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد اردو میں۔

۸) راجہ جے سنگھ کا عہد حکومت ۱۱۲۸ء سے ۱۱۵۴ء تک بیان کیا جاتا ہے۔ کلہن نے اسی کے زمانہ میں راج ترنگنی راجگان کشمیر کے حالات میں لکھی تھی۔

۹) لیکن مہابھارت میں راجہ کرن راجہ شل والئی مدر کو اس کے ملک کی سوشل خرابیوں کا طعن دیتا ہوا دیکھا گیا ہے۔

۱۰) اس تاریخ میں ۱۱۴۹ء یعنی راجہ جے سنگھ کے بعد کے حکمرانوں سے لے کر ۱۴۵۹ء تک کے حالات جبکہ بڈشاہ ابھی زندہ تھا لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے کلہن کی راج ترنگنی کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔

۱۱) دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی بنام کنگس آف کشمیر مترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۷۔

۱۲) دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی ترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۷۵۔

۱۳) دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی ترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۸۳۔

۱۴) " " " " صفحہ ۸۶۔

۱۵) اس کتاب کا مصنف شریور پنڈت ہے۔ جو پنڈت جوزراج مصنف زینہ ترنگنی کا شاگرد ہے۔ یہ کتاب بعہد سلطان فتح شاہ والئے کشمیر ۱۴۸۶ء (۸۹۹ھ) میں لکھی گئی۔ اس مصنف نے بڈشاہ سے لے کر فتح شاہ تک پانچ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔

۱۶) دیکھو زینہ راج ترنگنی کا ترجمہ بنام کنگس آف کشمیر مصنفہ جگدیش چندر دت صفحہ ۱۹۴

۱۷) تاتار خاں لودی صوبہ لاہور۔

۱۸) دیکھو زینہ راج ترنگنی کا ترجمہ بنام کنگس آف کشمیر مصنف جگدیش چندر دت صفحہ ۲۶۶۔۲۷۰۔

۱۹) کلہن پنڈت کی راج ترنگنی کے ترجمہ کے جلد اول کے صفحہ ۵۹۳ پر نوٹ ۴۸۰ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ ایکا ندی کا نام نیل مت پران کے شلوک میں بھی درج ہے۔

۲۰) ترجمہ مہابھارت آٹھواں پرب بنام کرن پرب صفحہ ۵۔ راجہ کرن نے راجہ شل کے ملک کے جو عیوب بتائے ہیں۔ ان کے متعلق یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ مد کے معنی منشی اشیا کے لئے جاتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے لوگ چونکہ بہت نشہ اور عرق پینے کے عادی تھے۔ اس لئے اس کو مد کہتے تھے۔ مد سے مدرہ اور مدرو غیرہ کئی الفاظ بنے اور بالآخر یہ ملک مدقوم یعنی مد پینے والے لوگوں کی وجہ سے مدر دیش کہلایا۔

۲۱) زنانہ اردو کورس جماعت ہفتم مرتبہ سررشتہ تعلیم پنجاب صفحہ ۲۱ درمیان پانڈو کورد۔

۲۲) دیوان کرپارام مدار المہام مہاراجہ سر رنبیر سنگھ آنجہانی والئے جموں وکشمیر اپنی تصنیف گلاب نامہ فارسی سنہ تالیف ۱۹۲۲ء ب میں لکھتے ہیں۔ راجہ شل نے جموں سے چھ فرسنگ کے فاصلے پر ایک سنگین قلعہ بنام شلکوٹ تیار کر کے اپنا دار العدالت بنالیا اور یورش ہائے متواترہ سے جموں کو خراب کرتا رہا۔

۲۳) گلاب نامہ میں لکھا ہے کہ راجہ شل کی ولایت پنجاب سے قندھار تک پھیلی ہوئی تھی۔

(۲۴) چالیس سال کی حکومت کے بعد یہ راجہ ۱۴۵۶ب میں قتل ہوگیا۔ تیمور گورگانی کے زمانہ میں بھی جموں کا یہی راجہ تھا۔ چنانچہ مصنف گلاب نامہ لکھتا ہے۔ جب ۸۰۱ھ میں امیر تیمور ملک ہند کو تباہ کر کے مراجعت سمرقند کے ارادہ سے "چوں متصل کوہستان جموں نزدل رایت اقبال گشت راجہ مالدیو معہ راجپوتاں پیکار طلب بہ عزم شب خون بہ قشون شتافتہ وگلزمین جموں رااز لشکر گورگان کان گور ساختہ"۔ بڈشاہ کی تخت نشینی اور تیمور کی وفات میں صرف ۱۶۔۱۷ سال کا فرق ہے۔

(۲۵) راجہ بھیم دیو کے دو اور بھائی بھی تھے۔ ایک چندن دیو دوسرا ساگر دیو۔ ان میں چندن دیو کے دو فرزند تھے۔ شیرا و سلطان۔ اس زمانہ میں دہلی پر سادات خاندان کی حکومت تھی اور راجہ مالدیو کی اولاد سے اکثر جموال راجپوت دربار دہلی میں ملازم تھے۔ علاقہ جموں کے شیر خانیہ جموال راجپوت اسی شیرا کی اولاد سے ہیں۔ از تاریخ راجگان جموال جلد دوم صفحہ ۴۳۷۔

(۲۶) پروفیسر گلشن رائے (لاہور) اپنے ایک مضمون "سیاسیات کشمیر میں آئینی اصلاحات" میں لکھتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں علاقہ جموں کا نام اتر مدرا تھا اور لاہور کو دکھن مدرا کہتے تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ جموں مدردیش ہی کے ایک حصہ کا نام تھا۔ (یہ مضمون ۱۴۔ اگست ۱۹۳۸ء کے اخبار ہمدرد سرینگر کشمیر میں شائع ہوا ہے۔)

ضمیمہ ۴

ترشک

پنڈت کلہن کی راج ترنگنی میں یہ لفظ کئی مقامات پر آتا ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ لفظ راجہ سنگرام راج (۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۸ء) کے عہد میں اس موقعہ پر دیکھتے ہیں۔ جہاں راجہ سنگرام راج محمود غزنوی کی فوج کا حملہ روکنے کے لئے اپنے چند عیاش اور نکمے افسروں کو بھیجتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب ان کو ترشکوں کے ساتھ لڑنے کو بھیجا گیا تو وہ بھی تنگ کی طرح بھاگ کر اپنے ملک کو واپس آ گئے۔ اس موقعہ پر راج ترنگنی کے ترجمہ کا حاشیہ ۲و۲۵۵ مظہر ہے کہ اس جگہ مُراد محمود کے کشمیر پر چڑھائی کرنے سے ہے اور اس کی یہ مہم تھی جس میں وہ لوہر یعنی لوہ کوٹ (علاقہ پونچھ) تک پہنچ گیا تھا۔ ترلوچن پال کو بھی جو اُدبانڈ پور (اُندبانڈ یاہند) کے شاہی خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔ محمود غزنوی ہی نے تباہ کیا ہے۔ اور چونکہ اس کی فوج میں زیادہ تر ترکستانی نسل کے سپاہی تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ترشا کا لفظ بھی ترکستان ہی سے نکلا ہے۔

راج ترنگنی میں ترشک اور ترشکوں کا لفظ پھر راجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) کے عہد میں آتا ہے۔ چونکہ یہ راجہ بتوں اور مورتیوں اور مندروں اور مقدس مقامات کی بے حرمتی کرتا رہتا تھا۔ اس پر کلہن لکھتا ہے۔ کسی گاؤں، قصبہ یا شہر میں کوئی بھی ایسا مندر نہ تھا جسے اس ترشک راجہ ہرش نے ناپاک نہ کیا ہو۔

یہاں ترشک کا لفظ بطور حقارت لکھا گیا ہے۔ اور چونکہ مسلمان ہی بت شکن اور مورتیوں کے نہ پوجنے والے تھے۔ اس لئے ترشک سے ہر موقعہ پر مسلمان ہی مراد لی جاتی ہے۔

راجہ نہ صرف بت شکن ہی تھا۔ بلکہ وہ سوسو سپاہیوں کے دستہ کے ترشک کپتانوں کو روپیہ کی مدد بھی دیا کرتا تھا۔ راج ترنگنی جلد اول کے حاشیہ ۵۵۵ میں لکھا ہے کہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ کلہن کا اشارہ ان مسلمان فوجی افسروں کی طرف ہے۔ جو ہرش کی فوج میں ملازم تھے۔ بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان آج سے قریباً ساڑھے نوسو سال پیشتر گو کشمیر میں مستقبل طور پر آباد نہ تھے۔ تاہم وہ کشمیر میں موجود ضرور تھے اور فوجی حیثیت میں وہاں اپنا اقتدار بھی رکھتے تھے۔

راج ترنگنی کا مصنف پنڈت کلہن ترشک لوگوں کا ذکر ۱۱۲۰ء سے ۱۱۲۱ء کے درمیان بھی کرتا ہے۔ جب کشمیر پر راجہ بھکشا چر کی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے جب راجہ نے لوہر (علاقہ پونچھ) پر جہاں راجہ سسل پناہ گزین تھا۔ چڑھائی کرنے کے لئے اپنی دوسری فوج کے ہمراہ ترشکوں کی ایک فوج بھی بھیجی۔ تو ترشک فوج کا ہر ایک سوار نخوت وغرور کے لہجہ میں کہتا تھا کہ میں رسی سے باندھ کر سسل کو گھسیٹتا ہوا لاؤں گا۔ اس پر حاشیہ ۲۶۷ میں درج ہے کہ ترشکوں سے مراد اس جگہ بلاشبہ پنجاب اور جنوبی پہاڑوں کے مسلمانوں سے ہے۔

پھر کلہن آٹھویں ترنگ میں لکھتا ہے۔ کملیہ کا چھوٹا راجکمار سنگلیہ ایک ایسی کشتری نسل سے تھا۔ جس کے آدمی ترشکوں کے علاقہ میں رہنے کے باعث سوائے ظلم کے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔

اس زمانہ میں پنجاب میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی اور کلہن کا اشارہ ہندوستان کے اسلامی ممالک ہی کی طرف تھا۔

علی شاہ کے ترشکوں سے بھی مراد مسلمان ہی سے ہے۔

سکھوں کی مذہبی کتابوں میں بھی اکثر مقامات پر مسلمانوں کے لفظ کی بجائے ترکوں کا ہی لفظ درج ہے اور ترک اور ترشک ایک ہی بات ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے سنسکرت مصنفوں نے جہاں کہیں ترشک قوم کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ان کی مراد مسلمان قوم ہی سے ہے۔

ضمیمہ ۵

قوم چک

اس قوم کے حسب نسب کے متعلق کشمیر کی تاریخوں میں جو واقعہ درج ہے۔ وہ کسی مورخ کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں ہے۔ راقم الحروف نے بھی تاریخ اقوام کشمیر کے صفحات ۳۹۷ تا ۳۹۹ میں جہاں اس قوم کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعہ کو غیر معتبر اور نا قابل قبول سمجھ کر درج نہیں کیا۔

لیکن اکثر اصحاب نے تاریخ اقوام کشمیر کے مطالعہ کے بعد قوم چک کے نسب کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر اس کو غلط سمجھا گیا تھا۔ تو اس کو درج کرنے کے بعد اس کی تردید کر دینا چاہیے تھی۔ بعض اصحاب نے یہ بھی لکھا ہے کہ تاریخ اقوام کشمیر کی تصنیف کے بعد اس قوم کے بارہ میں جس نے صدیوں تک کشمیر میں تلاطم برپا رکھا ہے اور تیس بتیس سال کے قریب مستقل بادشاہی بھی کی ہے اگر کچھ اور معلوم ہو تو اس سے آگاہی بخشی جائے۔

اب چونکہ اس کتاب میں قوم چک کا ذکر آ گیا ہے۔ اس لئے اسی موقع پر کشمیر کی تاریخوں کا بیان اور اس قوم کے مزید حالات جو معلوم ہو سکے ہیں۔ ضمیمہ کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

راجہ گان قدیم کے آخری دور (۱۳۰۷ء لغایت ۱۳۳۴ء) میں لنگر چک (۱) نام ایک شخص اپنے اہل و عیال سمیت دردستان (۲) سے کشمیر آیا۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ

مری تاریخ اعظمی میں لکھتے ہیں۔ اس کے نسب کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔ لیکن جو بات نقارہ خدا ہو کر زبان خلق پر مشہور ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں ایک عورت دردستان میں پانی لانے کے لئے ہر روز نہر پر جایا کرتی تھی۔ ایک جن اس پر عاشق ہو گیا اور ان کا ارتباط باہمی یہاں تک بڑھا کہ اس کے بطن سے ایک قوی ہیکل انسان پیدا ہوا۔ جس کا قد وقامت ڈیل ڈول اور وضع قطع عام انسانوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس نے اپنی بے مثال قوت وشجاعت سے دوسری اقوام پر غلبہ حاصل کر لیا۔ لنگر چک جو سب سے پہلے کشمیر میں آیا۔ اس کی چھٹی پشت سے تھا۔

چک قوم سے اہل کشمیر نے ہمیشہ تکلیف اٹھائی ہے۔ اس نے نہ صرف کشمیر کے مسلمان بادشاہوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ بلکہ برسرِ اجلاس شہمیری خاندان کے آخری بادشاہ سلطان حبیب شاہ کے سر پر سے تاج اتار کر اپنے سردار غازی عرف غازی شاہ چک کے سر پر رکھ دیا۔ اس واقعہ سے شہمیری خاندان اور رعایائے کشمیر کے دلوں کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اس کے علاوہ جب سلاطین کشمیر کے مختلف زمانوں میں ان کا عروج ہوتا رہا تو امور سلطنت میں مداخلت کی وجہ سے بعض کشمیری خاندانوں کی تباہیاں ہوتی رہیں۔ اور جب چک بادشاہ نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تو ملک میں ایک فریق کی بجائے مسلمانوں کے دو فریق ہو گئے اور مذہبی تعصّبات کی وجہ سے ان میں فتنہ وفساد اور قتل وغارت نے یہاں تک ترقی کی کہ کوئی شخص بھی اپنی جان کو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ اس بنا پر ممکن ہے کہ کسی دل جلے نے ان کے حسب نسب کا فسانہ جن کی صورت میں گھڑ لیا ہو۔ بلکہ ایک جگہ تو جن کی بجائے اژدہا بھی لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ شخص جو اس خاندان کا بانی بیان کیا جاتا غیر معمولی قوت رکھتا ہو اور قد وقامت بھی اس کا عام

انسانوں سے بڑا ہو۔ اسی لئے اس کو مافوق انسان سمجھ کر اس کا تعلق کسی جن سے کردیا ہوگا۔

مگر کسی کا غیر معمولی قد وقامت کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ (۳)

لارنس صاحب نے بھی ویلی آف کشمیر میں جن اور اژدہے کا واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ یہ دیکھا ہے کہ چک ذات کے متعلق بہت سے شکوک ہیں اور اگرچہ صحیح طور پر معلوم ہوسکتا کہ ان کی اصل کیا تھی لیکن قرائن سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کشمیر کے ہندوؤں سے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ ان کا نسب چیلاس کی درد قوم سے جا کر ملتا ہے۔

تاریخ حسن (غیر مطبوعہ) میں جو درج ہے کہ اس قوم کے بزرگ عہد سلاطین کشمیر میں دردستان سے وارد کشمیر ہوئے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ بلکہ جیسا کہ لکھا جاچکا ہے۔ وہ ہندوراجگان قدیم بالخصوص راجہ سہدیو کے عہد میں کشمیر میں آئے تھے۔ البتہ ان کے قرب سلطانی حاصل کرنے اور بادشاہی ملازمت میں داخل ہونے کے لئے تاریخ خواجہ اعظمی کی یہ تحریر صحیح معلوم ہوتی ہے کہ "لنگر چک ندبور درزمان سلطان شمس الدین شہمیری داخل ملازمان پادشاہی شد"۔

ان بیانات سے اور دیگر تاریخوں کے حوالوں سے جن کو بوجہ طوالت نظر انداز کردیا گیا ہے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ چک قوم کا وطن قدیم ملک دردستان ہے۔ دردستان کس ملک اور کس علاقہ کا نام ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے جب ہم کشمیر قدیم کے نقشہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں ایک طرف کھوئی ہامہ (۴) کے اوپر ... دوسری طرف لولاہ (۵) اور لاروپھاگ (۶) کے اوپر جا کر درددیش لکھا ہوا

نظر آتا ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ دریائے کرشنا (کشن گنگا) بہتا چلا جاتا ہے۔ اسی دردیش یا دردستان میں گلگت لداخ وغیرہ واقعہ ہیں اور اس کے ساتھ ہی چیلاس اور چترال کا علاقہ ملتا ہے۔

اس سے لارنس صاحب کی یہ تحقیق صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان کا نسب چیلاس کی دردقوم سے ہے۔ سٹائن صاحب کے ایک بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ البیرونی کی کتاب الہند کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ بارہ مولا کی کھڈ سے وادی کشمیر میں داخل ہوکر جو کھلا میدان آتا ہے۔ اس میں دودن کے کوچ کے اندر بائیں طرف کوہستان بولو اور شمیلان آتے ہیں۔ جہاں بھٹ دریاں نامی ترکی قبائل آباد ہیں۔ ان کے فرمانروا کا لقب بھٹ شاہ ہے۔

یہ اشارہ اس سلسلہ کوہ کی طرف ہے جو کشمیر کے شمال اور شمال مغرب میں واقع ہے۔ اور جو علاقہ درداور بلتستان کی طرف سے اس کی حدود کا کام دیتا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے البیرونی کی مراد گلگت اور لداخ کے بھوٹوں سے ہے۔ جن کو کشمیری بھٹہ کہتے ہیں۔ البیرونی نے ان لوگوں کی زبان بھی ترکی ہی ظاہر کی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ یہ لکھتا ہے کہ کشمیر کا مشرقی علاقہ تبّتی ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن سے مراد صاف طور پر لداخ اور نواحی علاقوں کے تبتیوں سے ہے۔ سنسکرت کی تاریخوں میں بھی جیسا کہ جغرافیہ قدیم کشمیر ملحقہ ترجمہ راج ترنگنی میں لکھا ہے۔ بھٹ کا لفظ لداخ اور بلتستان (سکردو) کے تبّتی نسل کے لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

البیرونی جو سلطان غزنوی کے ساتھ ہندوستان آتا رہا ہے۔ گو محمود کی طرح کشمیر میں داخل نہیں ہوسکا۔ لیکن پونچھ کے علاقہ کوٹ (لوہرین) کا محاصرہ کرنے کی

وجہ سے چونکہ غزنوی فوجوں کو عرصہ تک نواح کشمیر میں رہنا پڑا تھا۔ اس لئے البیرونی جو کچھ کشمیر کے متعلق لکھتا ہے وہ کشمیر اور اس کے ملحقات کے جغرافیائی حالات سے پورا پورا واقف معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس سے وہ اس قسم کے حالات دریافت کرتا ہے وہ بھی کشمیر اور اس کے ملحقات کے جغرافیائی حالات سے باخبر نظر آتا ہے۔ اسی لئے البیرونی کے بیانات کی قریباً سب مورخوں نے تصدیق وتائید کی ہے۔ چنانچہ لداخ کے علاوہ وہ دردستان میں گلگت، ہسورا اور شلتاش کا ذکر بھی کرتا ہے اور یہ وہی مقامات ہیں۔ جن کے نام گلگت، استور اور چیلاس ہیں۔ اس لئے بحوالہ جغرافیہ قدیم کشمیر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کشمیر کے شمال مغربی علاقہ میں جن لوگوں کو ترکی قبائل ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ دردستان اور بلتستان ہی کے رہنے والے ہیں اور چک قوم جس کا وطن تمام مورخوں نے دردستان تسلیم کیا ہے۔ انہی ترکی قبائل میں سے ہیں۔

ایک اور بات بھی اس شبہ کی موید ہے۔ جو یہ ہے کہ ضلع مظفر آباد کشمیر میں بھی جس کی حدود دارشہ و ضلع ہزارہ، چترال اور یاغستان سے ملتی ہیں اور جس کے طویل حصہ میں دردستان کا دریائے کرشنا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دومیل کے مقام پر جاکر وتستہ سے مل جاتا ہے۔ ایک ترک قوم آباد ہے۔ جو صدیوں سے وہاں مقیم چلی آتی ہے۔ چونکہ اس ضلع کی حدود بھی چیلاس وغیرہ سے ملتی ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ چیلاس اور دردستان کے چک اور ضلع مظفر آباد کے ترک ایک ہی نسل سے ہوں۔ بہرحال یہ معاملہ ابھی مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ چک قوم کا نام کس طرح مشہور ہو گیا۔ چک نام لنگر چک کے زمانہ سے جس کو آج قریباً ساڑھے چھ سو سال ہو گئے۔ تاریخوں میں نظر

آرہا ہے۔اس لفظ کی اصلیت کے متعلق قدیم وجدید مورخوں میں سے کسی نے توجہ نہیں کی۔اس لئے جب کوئی بنیاد ہی نظر نہیں آتی تو اس پر عمارت کھڑی کرنا تو اور بھی مشکل ہے۔تاہم اس قدر قیاس کہتا ہے کہ چک کسی ترکی لفظ کا خواہ وہ ذاتی تھا یا توصیفی کچھ بگڑا ہوا ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ زینہ راج ترنگنی میں لنگر چک کا نام النگر چکر درج ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چک لفظ چکر کا خلاصہ ہے۔لیکن چکر کا کیا مطلب ہے۔اس کے متعلق زینہ راج ترنگنی بھی خاموش ہے۔

چک قوم کے بزرگ جو تبّتی قبائل میں سے تھے۔بت پرست تھے یا مسلمان چونکہ وہ بہت قدیم زمانہ سے وہاں آباد چلے آتے ہیں۔اس لئے ممکن ہے وہ بت پرست ہوں۔یا اگر زیادہ صاف لکھا جائے تو شاید ان کا تعلق بدھ مت سے ہو۔لیکن وہ مسلمان کب ہوئے۔اس کے متعلق کوئی تاریخی واقفیت بہم نہیں پہنچتی۔کشمیر میں چک قوم کے دو خاندان ابتداء میں آئے ہیں۔ایک خاندان کا بانی لنگر چک تھا۔دوسرے کا ہلمت چک یا ہمت چک۔جس خاندان نے کشمیر میں قریباً پونے دو سال کی اقامت کے بعد آخر کار کشمیر کے تخت و تاج پر قبضہ کرلیا، وہ لنگر چک کے فرزند پانڈو چک کی ذریات سے تھا۔لیکن نہ لنگر چک یا النکا چکر کے نام سے اور نہ پانڈو چک کے نام سے ان کا مسلمان ہونا ظاہر ہوتا ہے۔پانڈو چک کی اولاد کے نام البتہ مسلمانوں سے ملتے ہیں۔لیکن اس کے بیٹے حسین چک کے ایک پوتے کا نام پھر شنکر چک آتا ہے۔جو ہندوانہ نام ہے۔ان کے قبول اسلام کے زمانے پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ممکن ہے۔کشمیر ہی میں آکر انہوں نے اسلام قبول کیا ہو۔اس قوم کے سیاسی حالات چونکہ کشمیر کی تاریخوں اور تاریخ اقوام کشمیر میں بھی درج ہیں۔اس لئے

اس قصہ کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

چک خاندان کے بادشاہوں میں یوں تو سب اہل علم تھا۔لیکن چند ایک ان میں شاعر بھی گزرے ہیں۔ حسین شاہ چک (وفات ۹۷۷ھ) کے دو شعر حسب ذیل ہیں ؎

حمائل کردہ تیغ وبستہ خنجر یارے آید   دلا برخیز کارے کن کہ جاں درکارے آید
آں ترک آل پوش سوار سمند شد   یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

یوسف شاہ (۹۸۶ھ) فارسی وکشمیری دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔اس کا ایک فارسی شعر ہے ؎

لیلیٰ جنازہ رابر مجنوں بہ خود نزاند   زدرِ کمند جذبہء معجز نمائے اوست

جہانگیر کے عہد میں جس انبہ خاں نے شیر افگن خاں کو بردوان میں قتل کیا تھا وہ بھی چک خاندان کا ایک شہزادہ تھا۔

چک قوم نے بڑے بڑے جوانمرد، شہ روز اور شجاع فرزند پیدا کئے ہیں۔

حواشی:

۱) زینہ راج ترنگنی میں زونراج نے اس کا نام النکا چکر لکھا ہے۔

۲) گلگت، چیلاس اور ملحقات۔

۳) سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار دہلی میں بہ عہد لارڈ کرزن ہز ہائنس مہاراجہ سر پرتاب سنگھ والئے جموں وکشمیر اپنی ریاست کا آدمی لے گئے تھے۔ جس کا قد آٹھ فٹ سے بھی زیادہ تھا اور اس زمانے کے وائسرائے لارڈ کرزن اور ان کی لیڈی اور دیگر ہزارہا لوگوں نے بھی اس کو دیکھا۔ مہاراجہ صاحب نے اس کا کچھ روزینہ بھی مقرر کر دیا تھا مگر وہ سال دوسال کے بعد ۲۴۔۲۵ سال ہی کی عمر میں انتقال کر گیا۔

۴) قدیم نام کھویا آشرم

۵) لولاب

۶) علاقہ گاندربل سے آگے وادی وانگت۔

۷) مولوی عبدالواحد مدیر اخبار اصلاح سری نگر۔ جنہوں نے سیاحت کے شوق میں کشمیر اور ملحقات کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء کے اخبار اصلاح میں مظفرآباد کی سرحدات کا دورہ کرتے ہوئے وہ کاغان اور علاقہ منور کے متعلق لکھتے ہیں۔ اس درہ میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے۔ مالک اراضیات اور عام طور پر سادات یا سواتی لوگ ہیں۔ یہ علاقہ پہلے ترک حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ بعد ازاں سید جلال بخاری نے سواتی لوگوں کی امداد سے ترکوں کو یہاں سے نکال دیا اور سواتی اور سادات درہ کاغان اور علاقہ منور پر قابض ہو گئے۔ درہ کاغان بالاکوٹ سے جہاں سید احمد بریلوی کا مزار ہے۔ شروع ہو کر ۹۲ میل کے نشان پر جہاں سے بالوسر گلی شروع ہوتی ہے۔ ختم ہوتا ہے۔ ضلع مظفرآباد کی ترک قوم غالباً درہ کاغان کی بسنے والی ترک قوم ہی ہے۔ جس کو سید جلال بخاری نے جلاوطنی پر مجبور کر دیا تھا۔

ضمیمہ ۶

مرزا کلاں شیخ بہاؤالدین گنج بخش اوراس کی چند اندرونی قبریں

اس مزار اور قبرستان کا احاطہ مزار کلاں کے نام سے مشہور ہے۔ اس احاطہ قبرستان میں جو دورتک پھیلا ہوا ہے اور قلعہ ناگرنگر (ہری پربت) کی دیوار کے نیچے تک چلا گیا ہے۔ بڑے بڑے عالی دماغ امراء وزراء علماء اور نامور خواتین اور شاہی بیگمات دفن ہیں۔ اس احاطہ کے اندر ایک اور چھوٹا سا احاطہ ہے۔ جو سیدواری قبرستان کہلاتا ہے۔ اس میں قریباً ساٹھ قبروں کے نشان ملتے ہیں۔ بہت سی قبروں کے پتھر زمین کے اندر دھنسے ہوئے ہیں۔ کئی قبروں کے پتھر گرمی کی حدت سے پھٹ چکے ہیں۔ چند قبروں کے تعویذوں پر صاحبانِ قبور کے نام اور کچھ اشعار درج ہیں۔ لیکن پتھروں کے پھٹ جانے کی وجہ سے صاف نہیں پڑھے جاتے۔

قبر حرم سلطان حسن شاہ فرمانروائے کشمیر

اس چھوٹے سے قبرستان میں سادات بیہقی اور بعض وابستگان خاندان شاہی کی قبریں ہیں۔ ہیبت خان نواسہ سلطان زین العابدین حضرت مخدومہ خاتون (بڈشاہ کی بیہقی بیگم) اور حرم سلطان حسن شاہ (کہ نام اس کا درج نہیں ہے) اور کئی اور

سادات اور متعلقین خاندان شاہی اسی جگہ خاک میں سوئے پڑے ہیں۔حرم سلطان حسن شاہ کے تعویذی پتھر پرایک طرف حرم سلطان حسن کھدا ہوا ہے اور بطرف مشرق

ہست دور ملک برائے جفا　　　کاسہ دردرا کجاست صفا

اور بطرف مغرب ۔

ہر کہ آمد رآہ و نالہ بہ رفت　　　اے جہاں ازتو کس ندید وفا

درج ہے۔شریور اپنی راج ترنگی میں سلطان حسن شاہ کے حالات لکھتا ہوا ترنگ سوم شلوک ۲۰۱ میں اس کی ایک بیگم مبارک خاتون کا ذکر کرتا ہے۔ چونکہ اس کا مزار سادات بیہقیہ میں ہے۔اس لئے اغلب ہے کہ وہ بیگم سادات بیہقیہ ہی سے ہو۔

قبر حافظہ مریم مصاحبہ خاص شہزادی زیب النسا بیگم

اس چھوٹے سے احاطہ قبور کے باہر اور مزار کلاں کے احاطہ کے اندر حافظہ مریم بیگم مصاحبہ وانیسہ خاص زیب النساء بیگم بنت عالمگیر بادشاہ کی قبر بھی ایک بلند چبوترہ پر ہے۔قبر کے سرہانے کا پتھر دوٹکڑے ہو چکا ہے اور قبر سے الگ بکھرا پڑا ہے۔ لیکن اس کے حروف بالکل صاف ہیں اور اچھی طرح پڑھے جاتے ہیں۔مگر آثار اس قسم کے ہیں کہ یہ ٹوٹے ہوئے پتھر بھی شاید زیادہ دیر تک سلامت نہ رہ سکیں اور پھر اگر کوئی ان کو جوڑنا بھی چاہے گا۔تو جڑ نہ سکیں گے۔　　شعر

شفیق اب دل کے ٹکڑے جوڑنے سے بھی نہیں جڑتے
وہ شاید کھیل سمجھتے تھے شکست شیشہ دل کو

اس لئے اس کتبہ کے اشعار کو ایک یادگار کے طور پر یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

از جہاں رفت مریم دوراں　　برد با خویش حلیہ ایماں
بیست و ششم ربیع الثانی بود　　سفر از دار بے مدار نمود
دفن بعد از نماز جمعہ شدات　　ہر کہ دمہ بہ تعزیہ بہ نشست
عقل بہر وفات نیک سرشت　　گفت تاریخ تشدہ سوئے بہشت

۹۸

عنایت اللہ خان بچھ جو عالمگیر کا مقرب خاص رہا ہے حافظہ مریم ہی کا فرزند تھا۔ یہ قاضی موسیٰ شہید کے تیسرے فرزند قاضی محمد صالح کی اولاد سے تھا۔ عالمگیر کے زمانے میں قاضی موسیٰ شہید کی اولاد کا دہلی آگرہ اور کشمیر میں بڑا اعروج رہا ہے۔ میر فیروز الدین المخاطب بہ نواب ابوالبرکات خان بہادر فیروز جنگ صوفی تخلص، ناظم صوبہ کشمیر، نواب ابوالقاسم خاں صوفی امانت خان المخاطب بہ نواب عبدالاحد خان اکبر آبادی اور حافظ مریم بیگم کی اولاد سے نواب عنایت اللہ خان کے فرزند ہدایت اللہ خاں مخاطب بہ نواب وزارت خاں میر سامان، نواب عطیۃ اللہ خاں، میر نعمت اللہ مخاطب بہ نواب مشرف خان وغیرہ نامی گرامی ہو گزرے ہیں۔

قبر سعید خاں

اس قبرستان میں دو قبریں ایسی بھی نظر سے گزریں۔ جن پر عربی و فارسی رسم لحظ کے علاوہ سنسکرت یا شاردا میں بھی کچھ حروف درج تھے۔ ان میں ایک قبر کے الفاظ

پڑھے نہیں جا سکے۔ دوسری قبر سعید خاں شہید کی ہے۔ قبر کی فارسی عبادت سے نام سعید خاں اور یوم وصال شہادت جمعہ ۸۸۹ھ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ عبارت قطعہ تاریخ وفات کے دوشعروں میں حسب ذیل ہے

به سال هشصد و هشتاد و نه شهادت یافت
به تخت گاه سلیماں سعید خان شهید عاقبت به خیر باد
رسول ناند (یہ الفاظ پڑھے نہیں گئے) فرزند شاه ابراهیم
سپرد خاں خداوند و در بهشت رسیدنی یوم الجمعه

سنسکرت عبارت فارسی قطعہ تاریخ ہی کا ترجمہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سنسکرت عبارت میں ہجری سنہ اور تاریخ کی بجائے لولک ۶۰ یعنی ۴۵۶۰ لولک اور یکم شراون بدھی شکر وار درج ہے۔ یہ عبارت شاردہ رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ جو کشمیر کا قدیم رسم الخط ہے اور جس کو سارسوت برہمنوں کے سوا کوئی لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ سنسکرت عبارت میں ''محمد شاہ راج'' کے الفاظ بھی درج ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۸۹ھ میں جو سعید خاں کا سال وفات ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کی کشمیر میں حکومت تھی۔ یہ وہی سال ہے، جس سال سید حسن بیہقی اور سید محمد امین اویسی وغیرہ کئی سادات قتل کئے گئے تھے۔ سید محمد امین اویسی کی تاریخ شہادت شہید کشمیر، شہید شرع اور شہید عرش سے بھی نکلتی ہے اور وہ بھی ۸۸۹ء ہے جو محمد شاہ کی حکومت کا سال اول تھا۔

سعید خاں سادات سے تھا یا نہیں۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس کے قطعہ تاریخ وفات اور اس کی قبر کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی قتل

سادات کے سلسلہ ہی میں جولڑائی ہوئی تھی، اس میں مارا گیا تھا۔ شریور اپنی راج ترنگنی میں اس کا معمولی ساذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ سادات کا طرفدار تھا۔

قبور خیرالزمان خاں عالمگیری وخواجہ محمد اعظم مصنف تاریخ اعظمی

سعید خان شہید کی قبر سے ذرا فاصلہ پر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری مصنف واقعات کشمیر عرف تاریخ خواجہ اعظمی کا مزار خستہ حالت میں ہے اور جلاہوں کے مکانات کی دیوار کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔ آپ کی وفات ۱۰ محرم ۱۱۷۹ھ کو ہوئی تھی۔ یہیں آپ کے والد خواجہ خیرالدین الملقب بہ خیرالزمان خاں عالمگیری (وفات ۱۱۶۵ ہجری) کی قبر ہے۔ خیرالزمان خان نے قبرستان ملہ کھاہ کے حدود میں مزار کلاں کے متصل اپنا ایک خاندانی قبرستان وسیع احاطہ میں مزار دیدہ مر کے نام سے تعمیر کیا تھا۔ اب تو وہاں صرف دونوں باپ بیٹوں کی یا چند ایک اور قبریں نظر آتی ہیں۔ وہ بھی ایک گوشہ میں ہیں۔ باقی احاطہ مزار پر مکانات بن چکے ہیں۔

شاہی خاندان کابل کی چند قبریں

حضرت شیخ بہاءالدین گنج بخش کے روضہ خاص کی چہار دیواری کے باہر مگر دروازہ کلاں کے اندر بائیں ہاتھ ایک بلند چبوترہ پر جس کا فرش سیاہ وسفید پتھر کا ہے۔ تین چار قبریں افغانستان کے شاہی خاندان کے نامور فرزند سردار محمد ہاشم خاں اوران

کے اعزہ کی ہیں۔ قبروں کے تعویذ سفید پتھر کے ہیں اور ہر چند کہ ان قبور کو تینتالیس سال سے زیادہ عرصہ اب تک نہیں گزرا تاہم فرش کا پتھر کئی مقامات سے اکھڑ چکا ہے اور بعض حروف بھی مٹ رہے ہیں۔ میں ان اشعار کو بھی ایک یادگار سمجھ کر یہاں درج کرتا ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ پرنس عبدالرحمان خان آفندی خلف سردار ہاشم خان مرحوم جنہوں نے اب کشمیر کو اپنا اصل وطن بنالیا ہے۔ ان قبور کی مرمت کی طرف توجہ فرمارہے ہیں۔

سب سے پہلے غربی جانب سردار محمد ہاشم خان کی قبر ہے۔ جس پر یہ عبارت درج ہے۔

حضرت فیض درجت امیر الامراء سردار السلطنت اقتدار عالیجناب معلیٰ القاب سردار محمد ہاشم خان محمد زیئی شہزادہ افغانستان نور اللہ مرقدہ۔

محمد ہاشم آں فرخندہ سیما — محمد زای و درّانی آبا
بہ دنیا ماند چہل و ہشت سالہ — کشیدہ رخت بر فردوس اعلیٰ
بہ بست و ہشتم ماہ رجت رفت — بہ معراج وصال حق تعالیٰ
مزار گنج بخش آں قطب عالم — شدہ چوں جنت الماویٰ ست ماوا
نوشتہ قادری تاریخ سالش — محمد ہاشم آمد خلد آرا (۱۳۲۰ھ)

دوسری قبر پر عبارت درج ہے۔ محترمہ عزیزہ مستور بیگم صبیہء صفیہ سردار عالی مقام محمد ہاشم خاں طلب شعاہما۔

بی بی پاک زاد و مستورہ — نور عین امیر ذوی الکرام
نسبت و سہ سال سن پاکش بود — شدز دار المحن بہ دار السلام

بست وچارم ربیع ثانی بود — کہ بہ حوران خلد کرد آرام

قادری سال فوت او مے جست — گفت دل در بہشت کرد مقام (۱۳۲۱ھ)

تیسری قبر بیگم صاحبہ سردار محمد ہاشم خاں مغفور کی ہے۔ جس پر ذیل کی عبارت درج ہے۔ ''حضرت نواب مستطابہ بی بی ہاجرہ بیگم زوجہ عفیفہ سردار فردوس مکین محمد ہاشم خان نورالبصر اعلیٰ حضرت امیر شیر علی خان والئے دولت قومی شوکت افغانستان نوراللہ جتو وہم''۔

حضرت نواب عفت نشاں ذوالاحترام — زوجہ پاک محمد ہاشم عالی مقام

غرہ ماہ حمید الاول از دنیا بہ رفت — بود ہفتاد و دو سال عمر آں فرخندہ نام

قادری برداشت دست التجا در رحلتش

گفت بادا سایہ خیر النساء بروئے مدام

مزارکلاں کی بعض اور قبور

مزارکلاں کے وسیع احاطہ میں دو مشہور اولیائے کرام کے مزار بھی ہیں۔ ان میں ایک سید احمد کرمانی اور دوسرے سید حبیب کاسانی ہیں۔ ان کے مزارات مقدسہ پر کوئی کتبہ نظر نہیں آتا۔ ان کی تفصیلی حالات کشمیر کی تاریخوں میں موجود ہیں۔ دونوں دونوں سیدوں کے سالانہ عرس ہوتے ہیں اور عقیدت مند کافی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل ایسی قدیم قبریں ہیں۔ جن پر صاحبان قبور کے نام درج ہیں۔ سلامت خاتون۔ رابعہ بی بی۔ سعیدہ بانو۔ خواجہ خسرو بیگ، خواجہ مرجان، حاجی عبداللہ، میر حبیب اللہ، میر بابا۔

پتھر کی ایک طویل سل احاطہ مزار میں ایک دیوار کے ساتھ ہے جس پر میر الٰہی شاعر کے متعلق بہت سے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سل دراصل میر الٰہی کی قبر کا تعویذ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبر بھی جواب منہدم ہوچکی ہے۔ اسی احاطہ مزار میں تھی۔ میر الٰہی کا یہ مشہور شعر مقبول عام ہے۔

؎ یا الٰہی از الٰہی تو چہ پری در حشر

آنچہ او کرد تو دیدی و چہ گفتن دارد

کشمیر کی مختلف تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مزار کلاں میں مندرجہ ذیل بزرگ بھی مدفون ہیں۔

سادات: سید افضل، سید مسافر، سید جلال۔

مشائخ: ملا محمد آنی، ملک جہانگیر، خواجہ محمد ککرو، شیخ رحمت اللہ، مولانا محمود بلخی، شیخ عباد اللہ، شیخ نعیم تارہ بلی، قمر الدین خوش قلم، خواجہ امیر الدین پکھلی وال۔

علماء: قاضی ابراہیم، ملا نور اللہ کنٹھ، ملا غلام رسول، مولوی غلام الدین خورد، مولوی غنی شاہ۔

شعراء: ملا شرف الدین خان فرحتؔ، محمد علی خاں متینؔ، محتشم خاں فداؔ۔

لیکن ان بزرگوں کی قبروں کا نہ محل وقوع کہیں ملتا ہے اور نہ کوئی کتبہ ہی ایسا نظر آتا ہے جس سے ان کے اسماء یا سالہائے وفات معلوم ہوسکیں۔

امیرؔ فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے

نشان ہے نہ نشان مزار باقی ہے

ضمیمہ ۷

بڈشاہی دارالحکومت (راجدھانی نوشہرہ) کے کھنڈر

اے کھنڈرا اے سرگذشت عظمتِ جنت نشاں
اے متاعِ جنس گمنامی کے بوڑھے پاسباں
اے عروج شان رفتہ کے پُرانے نوحہ خواں
اے کہ تو ہے مرمٹوں کا اک نشانِ بے نشاں
جنتِ ارضی کی تو تعمیر عالیشان تھا
وہ بھی دن تھے تو محل تھا قصر تھا ایوان تھا

شیر گڈھی (امیرا کدل) سے گاندربل (ملہ شاہی باغ) کو جاتے ہوئے پانچویں میل کے قریب جرنیلی سڑک کے عین کنارے دائیں طرف چند سرکاری وغیر سرکاری باغات آتے ہیں۔ جن میں باغ نواب علی مردان خان، باغ دینا ناتھ منشی، باغ دیوان پچھمن داس بہت مشہور ہیں۔ یہ تمام علاقہ کشمیر کے نامور اور ہردلعزیز بادشاہ سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کے زمانہ میں راجدھانی نوشہرہ کے نام سے موسوم تھا اور اس کی حدود چار کوس تک پھیلی ہوئی ہیں۔

زونراج راج ترنگنی میں دارالحکومت بڈشاہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

بادشاہ نے ہری پربت کی پہاڑی سے امریش پور تک زینہ نگر نامی ایک شہر بسایا۔ جس میں مختلف بازار نہایت سلیقہ اور ترتیب سے تیار کرائے۔ بادشاہ نے اپنے

اس نئے شہر میں برہمنوں کے لئے کئی مٹھ تعمیر کرائے اور ان کے لئے کسی قیمت یا کرائے کے بغیر زمینیں وقف کیں اور زینہ گنگا نہر کا اجراء کر کے زینہ نگر کو زیب و زینت دی۔ لیکن عوام میں زینہ نگر کی بجائے نوشہرہ یعنی نئے سر کے لفظ نے زیادہ شہرت پائی۔ جو اب تک قائم ہے۔ امریش پور کا موجودہ نام امیر وہیر ہے۔ جو نوشہرہ کے شمال میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہیں بڈشاہ کا وہ شاہی ایوان تھا، جس کی بارہ منزلیں تھیں اور ہر منزل صنعت و حرفت اور نقش و نگار اور وسعت و سر بلندی کے لحاظ سے مجموعہ روزگار تھی۔ ہر منزل میں پچاس پچاس کمرے (حجرے) تھے اور ہر کمرے میں پانچ سو آدمی سما سکتے تھے۔

مرزا حیدر کاشغری نے اپنی تاریخ رشیدی میں اور خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری اور جہانگیر نے اپنی توزک میں اس ایوان عالی شان اور دارالحکومت کے باغ ہائے دلکشا کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر اب ان باغات دلکشا کے غنچہ و گل کا کیا حال ہے۔ چند ورق جو جمع تھے، بکھر چکے ہیں اور انقلاب زمانہ کے بے درد و بے رحم ہاتھوں نے اس ''راجدھانی'' کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یار لوگوں کو سستے داموں بانٹ دیئے ہیں۔

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کو ٹوٹ لی طرز فغاں میری

راجدھانی کے اس محدود علاقہ کے مشرق میں موضع منڈی بل، مغرب میں محلّہ گل کدل نوشہرہ، شمال میں لکھری پورہ اور جنوب میں محلّہ مدین صاحب واقعہ ہے۔ دیوار پختہ کے آثار منڈی بل کی طرف سے شروع ہو کر دینا ناتھ منشی کا وہ ڈاری

اور آنند بوئی بلبل لانگری کے باغات سے ہوکر دیوان لچھمن داس کے باغ میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں سے نکل کر عبلی شاہ جلالی اور عبلی خان ساکن مدین صاحب کے باغات میں جاکر معدوم ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی چھ سوفٹ کی لمبائی سے کم نہیں ہیں اور جہاں اس دیوار کے آثار معدوم ہوجاتے ہیں، وہ لمبائی بھی ایک میل سے کم نہیں ہے۔ دیوار کے علاوہ محلات ومکانات کی بنیادوں کے آثار اب تک نظر سے اوجھل نہیں ہوسکے۔ یہ آثار پانچ چھ فٹ گہرائی تک کھودے جاچکے ہیں اور ''مالک باغ'' ان بنیادوں کا اور اس دیوار کا چونہ اینٹ اور پتھر فروخت کرتا رہتا ہے۔

ان کھنڈروں کے دو طبقوں کے نشان اب تک موجود ہیں۔ زیرین طبقہ کے متعلق منڈی بل کے معمر لوگوں کا بیان ہے کہ یہاں فوارے بھی تھے اور آبشار بھی تھیں۔

یہاں سے مشرق کی طرف قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر ایک نہر بنام ''پادشاہ کوہل'' ہے۔ جس کو بادشاہ اپنی راجدھانی کے ایوانات وباغات کی زیبائش وآبادی کے لئے نالہ سندھ سے لایا تھا۔ جو احمدا کدل کے متصل ڈل میں جاگرتی ہے۔ نہر کا قدیم نام بادشاہ کے نام پر زینہ گنگا تھا۔

یہی زینہ گنگا بادشاہ کے حکم سے علاقہ لار (نالہ سندھ) سے لائی گئی تھی۔ جو دارالحکومت نوشہرہ کو سیراب کرتی تھی۔ یہ نہر بادشاہ کوہل کے نام سے اب تھی موضع منڈی بل کے پاس سے گزرتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں بڈشاہی عہد کی اینٹیں بھی پائی جاتی ہیں۔

راجدھانی کے اس محدود رقبہ میں اس وقت جو غیر سرکاری باغات ہیں۔ ان

کی تعداد سات ہے۔ مگر اس خام سڑک نے جو محلہ مدین صاحب سے وچار ناگ کو جاتی ہے۔ ان کو یا بہ الفاظ دیگران کھنڈروں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ اب ایک طرف وزیر باغ، درباغ اور باغ آنند کول ہیں اور دوسری طرف باغ دینا ناتھ منشی ،باغ دیوان لچھمن داس اور باغ عبلی شاہ جلالی رہ جاتے ہیں۔ باغ انند کول کی چار دیواری کے اندر قدیم زمانے کے تراشیدہ پتھر منتشر طور پر اب تک پڑے ہیں۔ لچھمی کوہل جس کی بانیہ ملک سیف الدین بٹ وزیر اعظم سلطان سکندر کی دختر لچھمی خاتون تھی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ نہر گاندربل (نالہ سندھ) سے نکل کر وچار ناگ کے ایک قدیم سنگین (ا) ڈمٹ کے پاس سے ہوتی ہوئی منڈی بل میں جاتی ہے اور نوشہرہ، مدین صاحب اور حول سے گزر کر جامع مسجد میں جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

درباغ اور باغ انند کول میں تین چار مقامات پر بڑے بڑے پرانے پتھر بکھرے پڑے ہیں اور جا بجا کسی ''اجڑی ہوئی دنیا'' کے نشان ملتے ہیں۔ ایک بے آب وگیاہ خشک کھڈ پر کھدائی بھی ہو چکی ہے۔ غالباً سنگدل ضرورت مندوں نے دیوار کا سینہ چاک کر کے اس میں سے پتھر نکال لئے ہونگے۔ جس سے یہ سنگین دیوار اب ایک کھڈ کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس پختہ سنگین دیوار کے بقیہ پتھر اب تک اس میں سے نظر آرہے ہیں۔

دو مقامات پر زمانہ قدیم کی دو پختہ قبریں بھی اپنی شکل وصورت سے اپنی قدامت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ان کے ساتھ چند اور معمولی قبریں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڈشاہی دارالحکومت کی بربادی اور ان کے زمانہ مابعد کے باغات کی ویرانی کے بعد بولتے چالتے انسانوں کے شہر کی جگہ یہاں شہر خاموشاں کو آباد کرنا

مناسب سمجھا گیا تھا۔

جو خستہ حال الفت ہیں وہی برباد ہوتے ہیں
تباہی ڈھونڈتی پھرتی ہے دنیا میں تباہی کو

باغ آنند کول کے جنوب کی طرف ایک مستطیل شکل کی بہت نشیبی جگہ ہے۔ چونکہ اس کے ایک طرف اس باغ کی دیوار کے متصل ایک معلوم ومعدوم سنگین دیوار نظر آتی ہے۔ جس کے کچھ پتھر اب تک مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور بعض گڑھوں اور نشانوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے پتھر نکالے جا چکے ہیں۔ اس کے شمال کی طرف بھی پچھمی کوہل کے ساتھ ساتھ بعض پتھر اب تک موجود ہیں اور سیدھی قطار میں دیوار بندی کی شکل میں ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشیبی جگہ کوئی پختہ تالاب یا بہت بڑا حوض تھی۔ جس کے کنارے بادشاہی مجلس آراستہ ہوتی ہوگی۔ غور کرو اس میں فوارے چلتے ہونگے تو بادشاہ اپنے ندیموں کے ہمراہ کیا کچھ لطف نہ اٹھاتا ہوگا اور یہ علماء پرست اور علم نواز بادشاہ جب اپنے ہندو مسلم اہل درباریوں سے علمی مباحث یا سیاسی گفتگو اسی حوض کے کنارے بیٹھ کر کرتا ہوگا تو کیا کیا نکات حل نہ ہوتے ہونگے اور کیسی کیسی سیاسی گھتیاں تدبیر کے منتظم ہاتھوں سے سلجھائی نہ جاتی ہونگی۔ آہ

اک جھلک اپنی دکھا کر چھپ گئی برق پتاں
بجھ گئے شعلے سلگتی رہ گئیں چنگاریاں

ان باغوں کا یہ وسیع وعریض علاقہ جو منڈی بل سے لیکر محلّہ مدین صاحب کے قرب تک پھیلا ہوا ہے اور جو کسی زمانے میں سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ

کے دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ''راجدھانی'' کے نام سے موسوم تھا۔ ایک بلندی پر واقع ہے۔ جو زمین کی سطح سے قریباً آٹھ گز اونچائی پر ہے۔ باغات کے علاوہ اس رقبہ میں جو خالی زمین پڑی ہے۔ خصوصاً منشی باغ کے ساتھ وہاں اب تک خشک فصل کی کاشت ہوتی ہے۔

یہ اس بادشاہ کے باغات وایوانات کا عبرتناک حشر ہے۔ جو مسلمانوں میں بڈشاہ (شاہ اعظم) کہلایا اور جس کو ہندوؤں نے بٹ شاہ یعنی ہندوؤں کے بادشاہ کا خطاب دیا اور آج بھی کہ اس کی موت کو قریباً پونے چھ سو سال گزر چکے ہیں۔ اس کے تقدس اور اس کی بزرگی کا یہ عالم ہے کہ جب کشتی بان بڑے بڑے پھوؤں اور ہوس بوٹوں کے چلانے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہیں۔ تو بے ساختہ ان کی زبان سے ''بڈشاہ بادشاہ'' کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ اس دردانگیز منظر پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن۔

یہ تو ہے بات ہی کچھ اور کہ میں کچھ نہ کہوں
ورنہ کیا مجھ پہ جو گذری ہے مجھے یاد نہیں

ضمیمہ ۸

مسجد و مزار سید مدنیؒ

آپ کا کچھ ذکر عہد بڈشاہی کے علماء و مشائخ میں ہو چکا ہے۔ بادشاہ نے آپ کے لنگر خانہ، مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کے اخراجات کے لئے چند دیہات وقف کردیئے تھے۔

مسجد حضرت سید مدنیؒ

مسجد کی تعمیر ۸۴۸ھ میں ہوئی۔ ۸۲۶ھ کی تخت نشینی کے مطابق اس وقت بادشاہ کی حکومت کا بائیسواں سال تھا۔ مسجد اب بھی موجود ہے۔ لیکن جب ہم تذکروں میں یہ پڑھتے ہیں کہ یہ مسجد اہل فن کاریگروں کی قابل دید صنعت اور اعلےٰ قابلیت کا نمونہ تھی اور جب ہم مسجد کی موجودہ حالت دیکھتے ہیں اور اس کے ملحقہ حمام اور لنگر خانے اور مسجد کی درو دیوار پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔

یہ مسجد محلّہ مدین صاحب میں واقعہ ہے اور سرراہ موجود ہے۔ یہیں سے چند قدم آگے دائیں طرف بڈشاہ کی ''راجدھانی'' کے عبرتناک آثار نظر آتے ہیں۔ مسجد کا چوبی دروازہ اور اس کے سیاہ پتھر کے ستون اب بھی اس کی عظمت دیرینہ کے نوحہ خواں ہیں۔ دروازہ کے اوپر بخط جلی عربی حروف میں لکھا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم. لا الٰه اِلاَ اللّٰه محمد الرَّسول اللّٰه صلَّى اللّٰه عَلَيۡه وَسَلَّم. بنى هذا المسجد فَى العهد ظل اللّٰه فى

الارضین سلطان زین العابدین۔ خلد اللّٰہ ملکہ . اس عبارت کے دائیں طرف یک دوسرے پتھر پر یہ الفاظ درج ہیں۔ ''بنا ھذ المسجد الفقیر محمد المدنی ساکن کشمیر ''اور بائیں طرف سال تعمیر مسجد ۸۴۸ھ ان عربی الفاظ میں درج ہے۔ فی تاریخ سنہ ثمان و اربعین و اثمانما ئیہ''

مزار حضرت سید مدنیؒ

مزار بھی مسجد کے ساتھ ہی ہے اور احاطہ مزار کے باہر ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ جو قبرستان مدین صاحب کہلاتا ہے۔ مزار کے دروازے کے سامنے عین سڑک کے درمیان ایک اور پختہ قبر ہے۔ جو ان کے ''عرض بیگی'' کی بیان کی جاتی ہے۔ عرض بیگی لوگوں کی اطلاعات اور عرضداشتیں آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ مرزا کا احاطہ بڈشاہی عہد کی رنگین ٹائیلوں سے مزین تھا اور دروازے کے اوپر اور اس کے دائیں بائیں کئی فارسی اشعار درج ہیں۔ جن میں اب کچھ پڑھے جاتے ہیں، کچھ پڑھے نہیں جاتے۔ بعض مقامات پر حروف ٹوٹے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ بالکل ہی مٹ گئے ہیں۔ عہد شاہجہانی کی مرمت نے اس میں بعض جدید اشعار کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ اضافہ بھی اب نابود ہو رہا ہے۔ اشعار کے کچھ نمونے حسب ذیل ہیں۔

ہزار شکر کہ دروازہ بنا شدہ خوش　　بہ عہد شاہجہاں (اس سے آگے حرف مٹ گئے ہیں)

طواف روضہء (صد پاک) سید مدنی　　" (آگے پھر مصالحہ اکھڑا ہوا ہے)

___ سید ناوائے مفخر دیں　　از فیض تو سر بسر بود روئے زمیں

سید مدنی ___ سرمایہ کونین بود۔ طواف، ورت ___ اخلاص ___ ظاہر اللّٰہ ایں سپید برگز یدہ درعدنی ست''۔ غرض بطور یادگار یہ نامربوط اور نامکمل مصرعے اور اشعار درج

کردیئے ہیں۔ ورنہ ان سے حاصل کچھ نہیں ہوسکا۔

بڈشاہ کے زمانہ کی ٹائیلوں نے دروازہ کی تمام دیواروں کوزیب وزینت کی نعمت سے مالامال کررکھا تھا۔ اب وہاں صرف چند ٹائیلیں دیواروں میں جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مزار کی عبرتناک حالت

اس کے اندر جاؤ جہاں مزار مبارک ہے۔ وہاں اور بھی زیادہ ہولناک اور عبرت انگیز کیفیت نظر آتی ہے۔ قبر کے سنگ سیاہ کے تعویذ پر سید محمد مدنی ساکن کشمیر کے الفاظ درج ہیں۔ قبر کی چھت کی لکڑیاں کچھ اٹکی ہوئی ہیں اور کچھ نیچے زمین پر پڑی ہوتی ہیں۔ جنگلی بوٹیوں نے سبزہ زار تو نہیں خارزار کا عالم پیدا کر رکھا ہے۔ قبر کے اس پاس چند اور حضرات کی قبریں بھی ہیں۔ یہ اس برگزیدہ ہستی کا مزار ہے۔ جس کا بادشاہ وقت ایک ادنیٰ خادم تھا اور جس کے مزار کو خود بادشاہ کی حسن عقیدت نے تعمیر کرایا اور جج کے دوسو سال کے بعد نواب علی مردان خان گورنر کشمیر نے اپنے بادشاہ شاہجہان کے حکم سے ۱۰۵۱ھ سے ۱۰۶۱ھ کے درمیان اس کی مرمت کی۔

مزار اور مسجد پر سرکاری قبضہ

اس واقعہ کے قریباً سوا دوسال کے بعد ڈوگرہ حکومت کے عہد میں عرس کے موقعہ پر سنی اور شیعہ کے درمیان وہ فتنہء عظیم برپا ہوا کہ لوٹ مار اور قتل وغارت کے علاوہ ایک دوسرے کے مکانات کو آگ لگادی گئی۔ ان ایام میں مہاراجہ سر رنبیر سنگھ کشمیر کے حکمران اور وزیر پنوں نگروٹہ والے یہاں کے گورنر تھے۔ حکومت نے

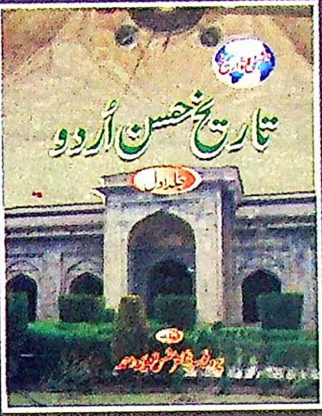
دوسرے ہی دن مزید فساد کے خوف سے سید محمد مدنی کے مزار اور ان کی مسجد کو سرکاری قفل لگا دیئے۔ یہ زمانہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۹۲۸ب موافق ۱۸۷۱ء کا تھا۔ چنانچہ اس وقت سے لیکر ۱۳۵۰ھ یعنی کامل ستر سال تک یہ دونوں متبرک مقامات ضبط سرکار رہے۔

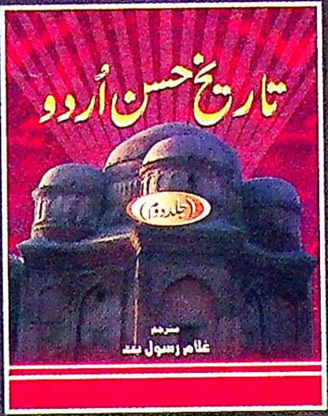
ستر سال کے بعد واگذاری

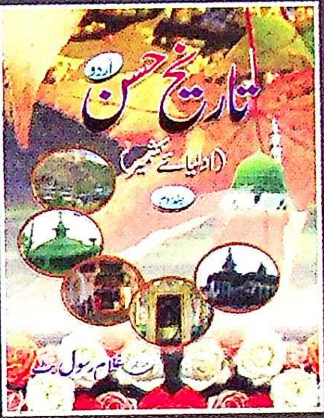
اب مہاراجہ سرہری سنگھ بہادر کے عہد (۱۹۳۰ء مطابق ۱۳۵۰ھ) میں مسلمانوں نے جہاں اپنے اور متبرک مقامات اپنی معروضات کے ذریعہ واگزار کرائے۔ ان میں یہ دونوں متبرک مقام بھی شامل ہیں۔

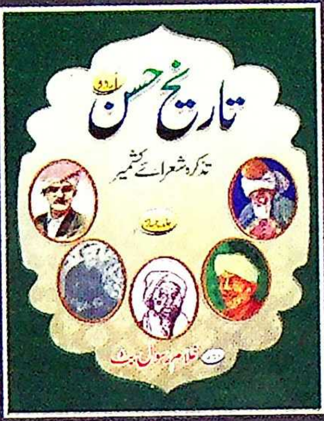
لیکن اب ان مقامات پر سنیوں کا قبضہ ہے نہ شیعوں کا۔ بلکہ جس کا جی چاہے آتا ہے اور فاتحہ پڑھ کے چلا جاتا ہے۔

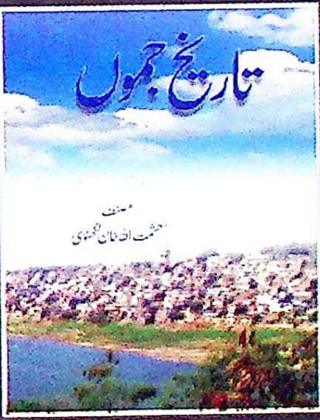
☆☆☆☆☆

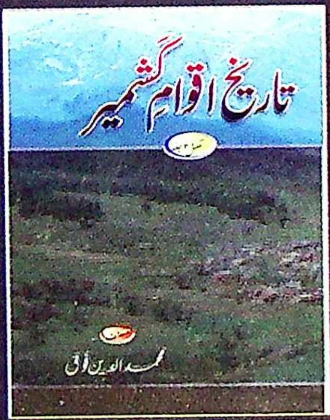












سٹی بک سینٹر بک سیلرز، پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
بڈشاہ چوک، سرینگر کشمیر۔ فون: ۲۴۷۰۱۵۸

Rs. 595/-
ISBN 81-7976-027